ڈھاکہ سے فرار
اے۔حمید
50
YEARS OF PAKISTAN

حسن ترتیب

ڈھاکہ ہمارا گھر تھا۔ ہمیں اپنے گھر سے نکلنا پڑا۔ یہ نوبت کیوں اور کیسے آئی۔؟ یہ ایک طویل خونچکاں داستان ہے۔ آگ اور خون کا یہ ڈرامہ اور سنگینوں کے یہ کرتب جن لوگوں نے دیکھے ہیں اُن سے پوچھو تو کہتے ہیں ؎

پوچھو نہ داستانِ غم، اُجڑے ہیں کس طرح سے ہم
گھر کا چراغ کیا بُجھا، گھر ہی اُجڑ کے رہ گیا

داستانِ غم۔ اُجڑے گھروں کی داستان، اے حمید نے اپنے خونِ جگر سے دبی دبی آہوں اور سلگتی ہوئی سسکیوں کو بڑے کرب آمیز پیرائے میں نوکِ قلم میں پرو دیا ہے۔ "ڈھاکہ سے فرار" آگ کے طوفان اور خون کے سیلاب سے زندہ بچ نکلنے کی ایک خون آلود داستان ہے۔ پڑھئے اور گذرے ایام کی تلخ یادوں سے عبرت حاصل کیجئے!

رات کا ایک بجا تھا۔ کراچی ایئرپورٹ پر بڑی رونق تھی۔

لاؤنج میں مسافر یہاں وہاں چل پھر رہے تھے۔ ڈھاکہ جانے والی فلائیٹ میں ابھی ایک گھنٹہ پندرہ منٹ باقی تھے۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کیفے میں آ گیا۔ میں نو بجے کی فلائیٹ سے لاہور سے کراچی پہنچا تھا۔ یہ فروری ۱۹۷۱ء کی ساتویں تاریخ تھی۔ مشرقی پاکستان میں اُٹھے ہوئے اس طوفان کی آگ زوروں پر تھی جس نے بعد میں اُسے جلا کر راکھ دیا۔ ڈھاکہ شہر کے محلہ محمد پورہ میں میرے دو خالہ زاد بھائی رہتے تھے جنہیں واپس لاہور لانے کے لئے میں ڈھاکہ جا رہا تھا۔

وہ قالینوں کی تجارت کرتے تھے اور ان دفتر اور دکان محمد پورہ میں تھی۔ مشرقی پاکستان میں مکتی باہنی کے ہندو بنگالیوں کی کارروائیاں پورے عروج پر تھیں۔ بھارت نے اپنے ہندو فوجی گوریلے بنگالی مہاجرین کے روپ میں ہزاروں کی تعداد میں مشرقی پاکستان میں داخل کر دیئے تھے جو ملک کے چپے چپے میں سلہٹ سے لے کر چٹاگانگ تک پاک فوج کے خلاف تخریبی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ شیخ مجیب الرحمان بھارتی سامراج کے ایجنٹ کی شکل میں مشرقی پاکستان کے سیدھے سادے مسلمان بنگالیوں کو اپنے جال میں پھنسا کر ملک کے سیاہ و سفید کا مالک بنا ہوا تھا۔

اس کی سیاسی جماعت اکثریت کے ساتھ انتخابات جیت چکی تھی اور اب وہ ڈھاکہ گورنمنٹ ہاؤس میں بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرانے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ فوج چھاؤنی کی بارکوں میں بند کر دی گئی تھی اور ڈھاکہ شہر میں مکتی باہنی غیر بنگالیوں کا قتلِ عام کر رہی تھی۔

میرے دونوں خالہ زاد بھائی زلفی اور فیضی محمد پور میں دوسرے غیر بنگالیوں کے ساتھ محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ لاہور میں ان کے خط آنے بند ہو گئے تھے۔ ایک روز اخبار میں خبر چھپی کہ مکتی باہنی نے محمد پور میں حملہ کر کے وہاں کے غیر بنگالیوں کو بے دردی سے ہلاک کر دیا ہے۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ بہنوں کی چیخوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ آخر بڑے بوڑھوں نے حوصلہ دیا اور کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ ہماری فوج حالات پر قابو پالے گی۔

لیکن کسی کو کیا معلوم کہ فوج کو تو ہماری اس وقت کی نااہل سیاست نے بارکوں میں بند کر رکھا تھا اور مکتی باہنی دل کھول کر من مانی کر رہی تھی۔ نرائن گنج اور ڈھاکہ کے اقبال ہال میں بہاریوں اور پنجابیوں کی لاشوں کے انبار لگے تھے۔ میرے ایک دوست ڈھاکہ میں فوجی افسر تھے طے یہ پایا کہ میں ڈھاکہ جا کر اُن سے ملوں اور اُن کی مدد سے اپنے خالہ زاد بھائیوں زُلفی اور فیضی کو محمد پور سے نکلوا کر چھاؤنی پہنچا دوں تاکہ ان کی زندگیاں محفوظ رہ سکیں۔ ان دنوں ڈھاکہ جانا اپنی زندگی کو بھی خطرے میں ڈالنے کے برابر تھا۔ لیکن زلفی اور فیضی کی زندگی بچانا بھی ضروری تھا۔

چنانچہ میں ایک رات نو بجے کی فلائیٹ سے لاہور سے روانہ ہو کر کراچی پہنچ گیا۔ کراچی سے ڈھاکہ کو فلائیٹ رات دو بج کر پندرہ منٹ پر روانہ ہوتی تھی۔ یہ فلائیٹ وایا کولمبو جاتی تھی۔ میں یہ سفر اکیلا کر رہا تھا۔ کراچی ائیر پورٹ پر اتر کر میں نے کچھ وقت بک سٹال پر رسالے اور کتابیں دیکھتا رہا۔ یہاں کئی ایک بنگالی خاندان ڈھاکہ فلائیٹ کے انتظار میں بیٹھے تھے یہ لوگ مغربی پاکستان سے شاید نقل وطن کر کے ڈھاکہ جا رہے تھے۔

اس قسم کی خبریں عام آ رہی تھیں کہ شیخ مجیب الرحمٰن بہت جلد ایک جلسۂ عام میں بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرانے والے ہیں۔ حالات کی شدید سنگینی کا ہمیں احساس تھا۔ لیکن حالات اتنے زیادہ سنگین ہوں گے یہ مجھے ڈھاکہ پہنچ کر معلوم ہوا۔ کچھ دیر میں لاؤنج کے صوفے پر بیٹھا سگریٹ پیتا رہا تاکہ کسی طرح سے وقت کٹ جائے۔ مجھ پر کچھ غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ جہاز کے ٹیک آف کرنے میں صرف سوا گھنٹہ باقی تھا۔

چنانچہ میں سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل والے کیفے میں آ گیا۔ یہاں رش تھا۔ زیادہ تر

بنگالی اور بہاری لوگ تھے جو مشرقی پاکستان جا رہے تھے بنگالی اپنے اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے اور بہاری اپنے رشتہ داروں اور لواحقین کی خیر و عافیت معلوم کرنے جا رہے تھے۔ ایک دُبلی پتلی سانولی سی بنگالی لڑکی اپنے ماں باپ کے ساتھ ایک طرف ستون کے پاس بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ اس کا چہرہ نیند کے خمار میں ڈوبا ہوا سا تھا۔ یا مجھے ایسا لگ رہا تھا۔ مجھے کیفے کی ساری فضا نیند میں ڈوبی محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے کافی منگوائی اور سگریٹ سلگا کر سوچنے لگا کہ میں ڈھاکہ ائیر پورٹ پر پہنچوں گا۔ تو دن نکل آیا ہو گا۔ بلکہ خوب دھوپ چمک رہی ہو گی۔

اس سے پہلے میں دو تین مرتبہ مشرقی پاکستان جا چکا تھا۔ سندربن سے لے کر کپتائی اور سلہٹ سے لے کر گولنڈو تک سونار دیش کے کونے کونے میں گھوم چکا تھا۔ ڈھاکہ بھی میرا جانا پہچانا شہر تھا۔ میں نے سوچا کہ ائیر پورٹ پر اترتے ہی ٹیکسی لے کر چھاؤنی روانہ ہو جاؤں گا اور پھر وہاں سے اپنے عزیز فوجی افسر کی جیپ لے کر محمد پور جاؤں گا اور زُلفی اور فیضی کو وہاں سے نکال کر ڈھاکہ چھاؤنی لے آؤں گا۔

میرے اندازے کے مطابق یہ سارا منصوبہ پانچ روز کا تھا۔ پانچویں روز مجھے دونوں بھائیوں کو ساتھ لے کر واپس لاہور کے لئے ڈھاکہ سے روانہ ہو جانا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ قسمت میرے اس فیصلے پر ہنس رہی ہے اور بے پناہ مصیبتوں کا ایک ہجوم وہاں میری راہ دیکھ رہا ہے۔ کافی آ گئی میں نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھایا اور کافی بنا کر پینے لگا۔ کافی تلخ اور خوشبو دار تھی۔ جلی ہوئی صندل کی لکڑی کی خوشبو!

میری آنکھوں میں مشرقی پاکستان کے ناریل، تاڑ اور سنبل کے درخت گھوم گئے اور خلیج بنگال سے آنے والی ہواؤں میں جھومتے کیلے کے درختوں کے جھنڈ اور چٹاگانگ شہر سے باہر ناگ ٹولہ پہاڑی ٹیلے پر سجاتا سین کا خوب صورت سرخ ڈھلانی چھتوں اور تاڑ، آم اور کیلے کے لہراتے درختوں والے بنگلے کی تصویر آ گئی۔ اس بنگلے کے پرسکون ڈرائینگ روم اور لان کی نرم سرسبز گھاس پر بانس کی آرام کرسیوں پر بیٹھ کر میں اور سجاتا نے کئی بار چائے اور کافی پی تھی۔

سجاتا چٹاگانگ کے ایک ہندو تاجر کی لڑکی تھی۔ اس سے میری پہلی ملاقات ۱۹۶۷ء میں

بارہ سال سے نرائن گنج جاتے ہوئے سٹیمر میں ہوئی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ اپنے کسی رشتے دار کے ہاں چھٹیاں گذارنے جا رہی تھی۔ میں نے اسے پہلی بار سٹیمر کے ڈیک پر دیکھا۔ وہ جنگلے کے ساتھ لگی دریا میں غروب ہوتے سورج کو دیکھ رہی تھی۔ سورج کی لالی میں اس کے سیاہ کھلے بال سونے کے تاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ مجھے وہ ٹیگور کی نظم کی طرح معلوم ہوئی جو ایک خوب صورت بنگالی لڑکی کے روپ میں میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئی ہو۔

"رات میں نے سونے سے پہلے تیرا تصور کیا اور سو گیا خواب میں مجھے تو مل گئی۔ تیرے جوڑے میں جوہی کے سفید پھولوں کا جوڑا تھا۔ میں نے تمہاری آنکھوں کی جھیلوں میں نیلے کنول کے پھول کھلے دیکھے...... میں نے تمہارے ماتھے کی سرخ بندیا کے سورج کو چوم لیا اور...... اور پھر میری آنکھ کھل گئی۔

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ سب کچھ خواب ہے تو میں کبھی بیدار نہ ہوتا اور ساری زندگی خواب دیکھتا رہتا......"

سجاتا کو دیکھ کر میرے ذہن میں ٹیگور کی یہ نظم گونجنے لگی۔ میں اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی غلافی پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ وہ نظریں تھکی تھکی اور پرسکون تھیں۔ جھیل کے پانی کی طرح جس کے اوپر صدیوں پرانے سنبل کے سرخ پھولوں والے درختوں کا سایہ ہو اور جس کا پانی سبز ہو گیا ہو۔

مجھے یوں جیسے اس نے ایک ہلکی سی آہ بھری اور اپنے شانوں پر بکھرے ہوئے بالوں کو جھٹک کر اپنے کیبن میں چلی گئی۔ دوسرے روز میں اس کے پاس اسی جنگلے کے پاس کھڑا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ ایک کم گو خیالی دنیاؤں میں گم رہنے والی غم پسند لڑکی تھی۔ اس نے کہا

"میں نے کلکتے میں ایم اے کیا۔ ہمارا گھر بلال گنج میں تھا۔ پھر ہم لوگ چٹاگانگ آ گئے......"

میں نے کہا۔ "سجاتا! میں کلکتے کئی بار گیا ہوں۔ اور بالی گنج کے گہرے سبز درختوں اور ہری بھری گھاس والے باغوں میں ہو کر کئی بار گذرا ہوں۔ کاش میں نے وہاں تمہیں دیکھا ہوتا۔ لیکن اب ایسے لگتا ہے کہ میں نے تمہیں کلکتے کے بالی گنج میں دیکھا ہے۔ بلکہ اس سے بھی ہزاروں

برس پہلے دیکھا ہے جب تمہارا کوئی مذہب نہیں تھا۔ جب تم شاید کسی گھنے جنگل میں خانہ بدوش قبیلے کے ساتھ رہا کرتی تھیں۔ اور...... میں بھی اپنے خانہ بدوش قبیلے کے ساتھ دریاؤں، جنگلوں اور میدانوں میں سفر کر رہا تھا......"

سٹیمر نرائن گنج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دریائے پدما کی مٹیالی لہریں سٹیمر سے ٹکرا کر پیچھے کو دوڑ رہی تھیں۔ کہیں کہیں مچھیروں کی کشتیاں دریا کی سطح پر ڈولتی دکھائی دے رہی تھیں۔ جن کے بادبان کھلے تھے اور دریائی ہوا میں پھولے ہوئے تھے۔ میں سجاتا سے باتیں کرتا رہا۔ کریون اے کا سگریٹ سلگائے نیند کی، خواب کی، ہزاروں سال پہلے کی دنیاؤں کی، ہزاروں سال بعد کی دنیاؤں کی باتیں کرتا رہا۔ وہ میری باتیں سنتی رہی۔ چپ چاپ آنکھیں کھولے سنتی رہی۔ کسی وقت وہ پلکیں جھپکا کر ایک گہرا سانس لیتی اور پھر گردن پر سر کو ایک طرف جھکا کر میری خواب و خیال کی باتیں سننے لگتی۔ اس کے گہرے سانس کی آنچ اور ہلکی ہلکی ناریل کی مہک مجھے اپنے قریب سے ہوا کا جھونکا بن کر گزرتی محسوس ہوتی۔ میں نے کہا۔

"سجاتا! تیرے سانس میں سندر بن میں اُگے ہوئے ترناری کے پھول کی مہک ہے۔ تیری آنکھوں میں غروب آفتاب کی لالی ہے جب وہ دریائے کرنافلی کے سیاہ جنگلی کناروں میں ڈوب رہا ہوتا ہے۔"

سجاتا نے کوئی جواب نہ دیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ میری ایک بات بھی نہیں سن رہی۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے وہ میری ساری باتیں سن رہی ہے۔ کنول کے اس سفید پھول کی طرح جو ناریل کے درختوں سے گذر کر آنے والی ملایا کی ہواؤں کی خنکی اپنی پنکھڑیوں کے رخساروں پر محسوس کرتا ہے مگر خاموش رہتا ہے۔ ہوا کی مہک اس کے ریشمی رخساروں کو چوم کر گذر جاتی ہے اور وہ کوئی بات نہیں کرتا۔ کسی بات کا جواب نہیں دیتا۔

سٹیمر بہتا چلا گیا۔ سورج غروب ہونے لگا۔ اس شام سجاتا نے مجھے اپنے باپ اور ماتا سے ملایا۔ اس کا باپ ایک خالص ہندو بنگالی تاجر تھا جسے سندر بن کی طرف سے آنے والی ٹھنڈی خوشبوؤں بھری ہواؤں اور دریائے کرنافلی کے کناروں پر جھومتے تاڑ کے درختوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے مجھ میں بھی کوئی دلچسپی نہ لی۔ ڈیک کے لاؤنج میں ہم نے

چائے پی۔ سجاتا خاموش رہی۔ اس کا باپ کاروبار کی باتیں کرتا رہا۔ اس کی ماتا بھی خاموش بیٹھی رہی۔ میں سجاتا کے باپ کی بےمعنی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے باہر نکالنے کی کوشش کرتا رہا اور کنکھیوں سے سجاتا کے کانوں میں چمکتے نیلم کے گول گول ٹکڑوں کو تکتا رہا۔

ایک مہینے بعد میں چٹا گانگ گیا تو سجاتا سے ملنے ان کی ناگ ٹولہ والی کوٹھی پر گیا۔ میں لاہور سے اس کے لئے مالٹوں کی ٹوکری لیتا گیا تھا۔ سجاتا مجھے کوٹھی کے لان میں مل گئی۔ وہ جوہی کی باڑھ پر جھکی جوہی کی کلیاں اتار رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹھک سی گئی۔ بعض جس طرح پہلے چپ سی رہ کر مجھے دیکھا کرتی تھی اسی طرح مجھے خاموش نظروں سے دیکھتی رہ گئی پھر اس کے ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ جیسے دریائے پدما کی لہروں پر بادلوں میں سے سورج کرن نے ایک پل کے لئے جھانک کر دیکھا ہو۔

شام کو ہم دونوں برآمدے میں ستون کے پاس بانس کی کرسیوں پر بیٹھے کافی پی رہے تھے اور گیلی شام کی فضا میں ترناری کے نیلے پھولوں اور دریا کنارے اگی مہوا کی کلیوں کی گہری خوشبو ملی ہوئی تھی۔ اس کے سیاہ بال شانوں پر سیاہ آبشار کی طرح پڑے تھے۔ تاریک رات کی آبشار...... جو بہتے بہتے اچانک رک گئی ہو۔ سجاتا کو پہلی بار دیکھ کر مجھ کچھ ایسا ہی احساس ہوا تھا کہ جیسے وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی ہو۔ چلتے چلتے رک گئی ہو۔ کچھ سوچتے سوچتے رک گئی ہو۔ چٹا گانگ کے خوب صورت اور صاف ستھرے شہر کی کوٹھیوں میں روشنیاں جھلملانے لگی تھیں۔ جنوب مشرقی ایشیا میں شام بہت جلد گہری ہو جاتی ہے۔ پھر رات کی رانی کی جھاڑیوں میں جگنو چمکنے لگتے ہیں اور دریاؤں کی طرف سے آنے والی نم دار خنک ہواؤں میں ادھورے گیتوں اور گرم آہوں کی سرگوشیاں سنائی دینے لگتی ہیں۔

"سجاتا! میں نے لاہور میں تمہیں بہت یاد کیا۔ کافی ہاؤس میں...... ٹی ہاؤس میں.... تم ہر جگہ مجھے یاد آئیں۔ کیا تم نے بھی مجھے کبھی یاد کیا تھا؟"

"سجاتا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموش رہی۔ تھوڑی دیر میری طرف دیکھا۔ پھر نظریں موڑ کر جوہی کی گہری سبز بیلوں کی طرف دیکھنے لگی۔ شاید یہ میرا وہم تھا کہ مجھے ایسے

لگا۔ جیسے اس نے گہرا سانس لیا ہو۔ اس کے سانس کی نیم گرم خوشبو میرے قریب سے ہو کر گذر گئی۔ جیسے شام کی اندھیری لڑکی میری آنکھوں کو چوم کر گذر گئی ہو۔

میں واپس آنے لگا تو سجاتا نے مجھے اپنے جوڑے سے نکال کر جوہی کا ایک سفید پھول دیا۔ اس پھول سے ہلکی ہلکی حنا کی مہک اُٹھ رہی تھی۔ میں نے اُسے چوم لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے میں نے خوشبوؤں کے گہرے، تاریک، بجھے ہوئے جوالا مکھی میں چھلانگ لگا دی ہو۔ میں ناگ ٹولہ کی پہاڑی سے نیچے اتر آیا۔ میں نے سڑک پر آ کر اوپر دیکھا۔ سجاتا کے بنگلے کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ برآمدہ خالی تھا۔ برآمدے میں پڑی بانس کی کرسیاں خالی تھیں۔ سُجاتا جا چکی تھی۔

دوسرے روز چٹا گانگ کے آسمان پر کالی گھٹا چھا گئی تھی۔

بنگال کی دریاؤں کی ٹھنڈک، آنے والی بارش کی نمی اور سندر بن کے جنگل کی خوشبوؤں والی ہوا چل رہی تھی۔ یہ جادو کی ہوا تھی۔ بنگال کے کالے جادو کی ہوا تھی۔ اس ہوا میں سانولی لڑکیوں کی پراسرار سرگوشیاں اور کالے سانپوں کی خاموش پھنکاریں تھیں۔ ناگ ٹولہ کی پہاڑی کے آم کے جھنڈ ہوا میں جھوم رہے تھے۔ میں اور سجاتا ایک ویران سے راستے پر چلے جا رہے تھے۔ ہمارے اوپر سنبل اور ناریل کے درختوں کے جھنڈ لہرا رہے تھے۔ ہماری دونوں جانب کیلے کے درختوں کی قطاریں تھیں۔ ایک جگہ مولسری کا گھنا درخت تھا۔ وہاں کچھ لوگ دریوں پر بیٹھے تھے۔ ایک کھلے بالوں اور گیروے کپڑوں والی بیراگن اِک تارا ہاتھ میں لئے آنکھیں بند کئے جھوم جھوم کر کوئی بنگالی لوک گیت گا رہی تھی۔ میں اور سُجاتا اس کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے۔ بیراگن بے حد خوبصورت عورت تھی اس کے حسن نے لوگوں کو مسحور کر رکھا تھا۔ اس کی آواز اک تارے کی آواز کے ساتھ ہم آہنگ تھی۔ کبھی لگتا اک تارا گا رہا ہے۔ کبھی لگتا بیراگن خاموش ہے اور صرف اک تارا بج رہا ہے۔

سُجاتا نے کہا

"یہ بیراگی لوگ جنگل جنگل، گاؤں گاؤں گھومتے ہیں۔ جس گھر میں کوئی شادی بیاہ ہو وہاں آ کر گاتے ہیں۔ یہ جو بنگالی لوک گیت گا رہی ہے۔ اس کا مطلب کچھ یوں ہے کہ...... اے میرے

محبوب! مجھے بتاؤ۔ میں کب تک سینے پر انگارے رکھے تمہاری راہ دیکھتی رہوں ؟

ہم خانہ بدوش ہیں۔

میرے محبوب بتاؤ! میں کب تک تیری راہ دیکھوں ؟

میں دریا کے کنارے رات رات بھر دیا جلا کر تمہارا انتظار کرتی ہوں۔ ہم تو خانہ بدوش ہیں..... !!!

ہم دریا کے کنارے پر کھانا پکاتے ہیں اور دریا کے دوسرے کنارے پر جا کر کھاتے ہیں۔

ہم سانپ پالتے ہیں۔ ہم سانپ کی سُرخ آنکھوں سے پیار کرتے ہیں۔

میرے محبوب! میں کب تک تیری راہ دیکھوں ؟.....”

بیراگن دھیمے دھیمے رقص کی گردش میں تھی۔ اس کے سیاہ بال دائیں بائیں رقص کی گردش کے ساتھ لہرا رہے تھے۔ یہ سچ مچ بنگال کا کالا جادو تھا۔ یہی وہ جادو کی امر بیل تھی جو مسافر کے جسم کے گرد آہستہ آہستہ پھیلتی چلی جاتی ہے اور مسافر کو اس وقت علم ہوتا ہے جب اس کے پاؤں زمین میں گڑ جاتے ہیں اور وہ ایک قدم بھی آگے نہیں جا سکتا اور پھر کسی نہ کسی سانولی بیراگن کے سیاہ بالوں میں اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے گم کر دیتا ہے۔ بنگال کا جادو، جادو کا بنگال!

پھر بارش شروع ہو گئی۔ میں اور سجاتا بھاگ کر کوٹھی کے برآمدے میں پہنچے۔ اس کے بال بھیگ کر اس کی ساڑی سے چمٹ گئے تھے اور اس کی ساڑی سمٹ کر اس کے چمپئی بدن سے چمٹ گئی تھی اور اس کا بدن ایک دھیما دھیما شعلہ بن کر سلگ رہا تھا۔ دریا کی لہروں، سمندر کی موجوں سے طلوع ہوتا ہوا سورج کا شعلہ!

○

میں چٹاگانگ سے واپس آ گیا۔

سُجاتا مجھے ریلوے سٹیشن پر چھوڑنے نہ آئی۔ اس نے پُرسکون خاموش نظروں سے اپنی کوٹھی کے لان میں جُوہی کی بیلوں کے قریب کھڑے ہو کر الوداع کیا اور میں ناگ ٹولہ کی پہاڑ سے نیچے اُتر آیا۔ میں ریلوے سٹیشن جانے کی بجائے چٹاگانگ کے بڑے بازار میں گھومتا پھر

رہا۔ ایک ہوٹل سے جوتھیکا رائے کے بھجن گانے کی آواز آ رہی تھی۔

میں رک گیا۔ شام کی ٹھنڈی ہوا میں غروب ہوتے سورج کی لالی میں جوتھیکا رائے کی آواز خلیج بنگال کے پانیوں کی طرف بہے جا رہی تھی۔ امر بیل بن کر میرے جسم کے ارد گرد نظر نہ آنے والا جالا سا بنتی جا رہی تھی۔ میں جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ اگر میں کچھ دیر وہاں اور کھڑا رہتا تو ضرور پتھر بن جاتا...... ہمیشہ کے لئے پتھر بن جاتا۔

میں چٹاگانگ سے ڈھاکہ آ گیا۔ ساری رات ریل گاڑی سپاری، سُنبل اور تاڑ کے گھنے جنگلوں سے گذرتی رہی۔ کھڑکی میں سے ان اندھیرے جنگلوں کی ٹھنڈی مہک والی ہوا آتی رہی۔ اس ہوا میں مجھے سجاتا کے گرم سانس کا لمس محسوس ہو رہا تھا۔ صبح ہو رہی تھی کہ گاڑی پاربتی پور رُکی۔ یہاں میں نے ریلوے تار گھر سے سجاتا کو تار دیا کہ میں تمہیں یاد کرتا ہوا ڈھاکے کی طرف سفر کر رہا ہوں۔

اور پھر ڈھاکے کا خوب صورت کملا پور ریلوے سٹیشن آ گیا۔

تین روز بعد مجھے سجاتا کا خط ملا۔ اس نے لکھا تھا کہ میرے جانے کے بعد وہ اداس ہو گئی تھی۔ کاش میں اسے اپنی یاد میں اداس دیکھ سکتا۔ میں بھی اداس رہا۔ دو تین دن سجاتا کا خیال میرے ساتھ ساتھ ڈھاکے کے بازاروں میں اور رمنا کے باغوں میں سفر کرتا رہا۔

میں ایک ہفتے بعد لاہور آ گیا۔ ایک مہینے بعد مشرقی پاکستان گیا تو سجاتا کا خط میرے ایک ڈھاکے کے دوست کے پاس آیا ہوا تھا۔ میں نے بے تابی سے اسے کھول کر پڑھا۔ اس نے لکھا تھا کہ اس کی چھوٹی بہن کی سالگرہ ہے۔ ضرور آنا۔ سالگرہ میں تین روز باقی تھے۔

میں کملا پور ریلوے سٹیشن سے چٹاگانگ ایکسپریس میں سوار ہوا اور چٹاگانگ پہنچ گیا۔

ناگ ٹولہ پہاڑی پر روشنیاں ہو رہی تھیں۔

یہ روشنیاں سجاتا کی کوٹھی کی تھیں۔ وہاں بڑی رونق تھی۔ سجاتا کے ماتا پتا مجھے ملے میں نے سجاتا کی بہن کو تحفہ دیا۔ سجاتا نے گلابی رنگ کی سنہرے باڈر والی ساڑھی پہن رکھی تھی جس پر کرن لگی تھی۔ اس کے ماتھے پر سرخ بندیا دمک رہی تھی۔ یہ چندن کی بندیا تھی جو کشمیر کی پہاڑیوں میں زعفران بن کر اُگتا ہے۔ اس کے سیاہ جوڑے میں ترناری کے

سفید پھول سجے تھے۔ اس کے جسم سے الگ کر جو ہوا میری طرف آئی اس میں حنا اور انناس کی خوشبو تھی۔ یہ پاگل کر دینے والی خوشبو تھی۔ یہ دو جادو بھری خوشبوؤں کا ملاپ تھا۔ یہ دو دریاؤں، دو سورجوں اور دو براعظموں کا ملاپ تھا۔ سجاتا نے پرسکون خاموش آنکھوں سے مجھے دیکھا اور ذرا سا مسکرا کر مجھے ڈرائینگ روم میں دوسرے مہمانوں کے پاس لے گئی۔ اس محفل میں چٹا گانگ کے مسلم گھرانوں کی شریف خواتین بھی مدعو تھیں۔

کھانا بڑا پُرتکلف تھا اور مسلمان باورچیوں نے تیار کیا تھا۔ کھانے کے بعد بنگالی گھریلو لڑکیوں نے گیت سنائے۔ ٹیگور اور جسیم الدین کے بنگالی گیت ..... کافی کا دور چلا تو مہمان چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر آپس میں باتیں کرنے لگے۔ میں اور سجاتا بنگلے کے پچھواڑے والے برآمدے میں آ گئے۔ جہاں رات کی رانی کی مہک پھیلی ہوئی تھی اور جھاڑیوں میں جگنو چمک رہے تھے۔ ہم نیم روشن برآمدے میں بانس کی کرسیوں پر بیٹھے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے کہا

"سجاتا! مجھے اس ناریل اور تاڑ کی سرزمین سے بہت محبت ہے۔
کبھی کبھی یوں لگتا ہے کہ میں کسی جنم میں یہاں ضرور آیا ہوں۔ یا تو اس شہر کا راجہ بن کر حکومت کرتا رہا ہوں اور یا پھر بیراگی بن کر اس سرزمین کے جنگلوں، دریاؤں اور میدانوں میں گھومتا پھرتا رہا ہوں۔"

سجاتا خاموش نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"شاید پھر میں کبھی دیوداس تھا جو اپنی پاربتی کی تلاش میں ..... اس سے اپنی زندگی کی آخری ملاقات کرنے ایک بیل گاڑی میں بیٹھا بردوان آیا تھا..... اور پھر کسی جنگل کی گہری پُراسرار رات میں مر گیا اور پاربتی سے زندگی کی آخری ملاقات نہ کر سکا۔"

رات کی رانی کی جھاڑیوں میں سنہرے جگنو، نیلی روشنیوں والے جگنو چمک رہے تھے۔ ہوا میں خوشبو تھی۔ ایک رات کی رانی وہاں جھاڑیوں میں مہک اڑا رہی تھی اور ایک رات کی رانی میرے پاس بانس کی کرسی پر خاموش بیٹھی حنا کی مہک دے رہی تھی۔ بانس کے اُونچے اُونچے

گھنے درختوں میں کوئل بول کر اڑ گئی۔

سجاتا نے بانس کے جھنڈوں کی طرف دیکھا۔ وہاں گہرا اندھیرا تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ رات گہری ہو رہی تھی۔ مہمان رخصت ہونے لگے۔ میں بھی رخصت ہونے کے لئے لان میں سے گذر کر کوٹھی کے گیٹ پر آ گیا۔ سجاتا میرے ساتھ نہیں تھی وہ دور برآمدے میں اپنی بہنوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ برآمدے کی روشنی میں اس کی ساڑھی کی کرن اور ماتھے کی سرخ بندیا چمک رہی تھی۔ شاید اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ شاید وہ اداس ہو گئی تھی..... میرا خیال ہے کہ وہ اداس ہو گئی تھی۔ میری خواہش تھی کہ وہ اداس ہو جاتی۔

میں واپس آ گیا۔ ساری رات میں ہوٹل کے کمرے میں لیٹا سُجاتا کے جسم سے چھو کر آنے والی خوشبو کو اپنے چہرے پر محسوس کرتا رہا۔ صبح میں جلدی اُٹھا۔ گاڑی ٹھیک چھ بجکر دس منٹ پر چھوٹ جاتی تھی۔ چٹا گانگ کے خوبصورت ریلوے سٹیشن پر بڑی رونق تھی۔ گاڑی ٹھیک وقت پر روانہ ہو گئی۔ ڈھاکہ تک مجھ پر ایک نشے کی سی کیفیت چھائی رہی۔ سجاتا کی شکل بار بار سامنے آجاتی تھی۔ دل یہی کہتا کہ واپس چلو۔ اور ساری زندگی سجاتا کے پاس گذار دو۔

مگر ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ میں اپنی زندگی سجاتا کے پاس نہیں گذار سکتا تھا۔ کیونکہ اس کے پاس اس کا ہندو باپ بھی تھا۔ وہ صبح و شام درگا دیوی کی پوجا کرنے مندر جاتی تھی اور میں مندر میں نہیں جا سکتا تھا۔ وہ ماتھے پر تلک لگاتی تھی۔ وہ بنگال کے ایک کٹر ہندو گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اور میں مسلمان گھرانے سے متعلق تھا۔ یہ شمال اور جنوب کا فرق تھا، سمندر اور خشکی کا فرق تھا۔ اور یہ دونوں کبھی آپس میں نہیں مل سکتے تھے۔

ٹرین ڈھاکے کے عظیم الشان ریلوے اسٹیشن کملا پور میں داخل ہو رہی تھی۔ سُجاتا کا چہرہ ہجوم میں کہیں گم ہو گیا تھا۔

سجاتا سے میری آخری ملاقات ۱۹۷۰ء کے آخری مہینوں میں ہوئی۔ میں ڈھاکہ کے شاہ باغ ہوٹل کے لاؤنج میں سے نکل رہا تھا کہ میں نے سجاتا کو دیکھا۔ وہ اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ ہوٹل میں داخل ہو رہی تھی۔ ایک پل کے لئے ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھٹھک

سے گئے۔ اس نے سفید ساڑھی پہن رکھی تھی۔ جوڑے میں ترناری کی سفید کلیاں تھیں اور کانوں میں سفید بندے...... اس نے اور اس کی چھوٹی بہن نے ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کیا۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوئی تھی اور کچھ کچھ حیران بھی ہوئی تھی۔

"ہم یہاں ایک کام سے آئے ہیں۔ پتاجی بھی ساتھ ہیں۔

"اچھا ہوا تم سے ملاقات ہو گئی۔"

"کیا تم لوگ شاہ باغ میں ٹھہرے ہو؟ تمہارے تو ماسی کی یہاں اتنی بڑی کوٹھی ہے۔"

"پتاجی کسی کے ہاں نہیں ٹھہرتے...... کل آؤ گے؟ میں یہاں تمہارا انتظار کروں گی... یہ ساتھ والے سائیڈ کیفے میں...... اچھا نمشکار!"

سجاتا اپنی بہن کے ساتھ اوپر چلی گئی۔

اگلے روز وہ سائیڈ کیفے میں میرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ پنک کلر کی سادہ ساڑھی میں بال یونہی پنک کلر کے ایک ربن میں بندھے تھے۔ دائیں جانب بالوں میں یونہی بے نیازی تھی: سے ایک سفید گلاب لگا رکھا تھا۔ کانوں میں بھی پنک رنگ کے بُندے تھے۔ اس کی آنکھوں میں بڑی اداس سی چمک تھی۔ چہرے پر پہلے سے زیادہ گہری خاموشی تھی۔ میں نے چائے منگوائی۔ سلہٹ کے باغوں کی خوشبودار چائے پیتے ہوئے بولی۔

"شاید ہم لوگ یہاں سے چلے جائیں۔"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔ کہنے لگی۔

"شاید مدراس یا کلکتے...... وہ میرا بیاہ کر رہے ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ شرمائی نہیں۔ بلکہ اور زیادہ اداس ہو گئی۔ اس کے بیاہ کی بات سن کر میں بھی اُداس ہو گیا۔ حالانکہ میرے اداس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ نہ میں اس سے بیاہ کر سکتا تھا اور نہ وہ مجھ سے بیاہ کر سکتی تھی۔ پھر وہ کیوں اداس ہوئی تھی؟ اس کے دل میں کیا تھا؟ میں نے کہا۔

"بیاہ تو ایک نہ ایک دن کرنا ہی ہو گا تمہیں۔ ماں باپ جہاں کہیں وہاں شادی کر لو۔"

وہ میری طرف اس طرح دیکھنے لگی جیسے اُسے دلی صدمہ پہنچا ہو۔ بولی۔

"کیا تم بھی چاہتے ہو کہ میرا بیاہ ہو جائے؟

"کیوں نہیں چاہتا میں! بیاہ کے بعد تم اداس نہیں رہا کرو گی۔"

اس نے ایک گہرا سانس بھرا اور کہنے لگی۔

"میں جاتی ہوں۔"

وہ اٹھ کر اُوپر چلی گئی۔ میں اُسے جاتے دیکھتا رہ گیا۔

اس کے بعد سجاتا سے میری ملاقات نہ ہو سکی۔ وقت گذرتا چلا گیا۔ میں ملک سے باہر چلا گیا۔ اس عرصے میں مشرقی پاکستان میں بھی انتخابات شروع ہو گئے اور پھر عوامی لیگ کے لیڈر نے چھ نکات پیش کر دیئے اور بنگلہ دیش کی تحریک شروع کر دی اور غیر بہاریوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ نہ میں سجاتا کو کوئی خط لکھ سکا اور نہ سجاتا کا کوئی خط مجھے ملا۔ اس سے زیادہ اب ہم لوگوں کو ان نوجوانوں کی فکر تھی جو ڈھاکے کے غیر بنگالی محلے محمد پور میں پھنسے ہوئے تھے۔

"خواتین و حضرات! توجہ فرمائیں! کراچی سے وایا کولمبو جانے والی فلائیٹ نمبر...."

میں اپنے خیالات سے چونک پڑا۔ مائیک پر ایک لڑکی اعلان کر رہی تھی کہ کراچی سے ڈھاکہ جانے والی فلائیٹ تیار ہے اور اس کے مسافر برائے مہربانی جہاز میں آکر سوار ہو جائیں۔ میں نے بل ادا کیا اور نیچے اُتر کر لاؤنج میں سے ہو کر ٹکٹ کا نمبر دے کر ائیرپورٹ کے اندر آ گیا۔ یہاں ایک بس ہمیں جہاز تک لے جانے کے لئے سٹارٹ ہو چکی تھی مسافر سوار ہو رہے تھے۔ بس ہمیں لے کر جہاز کے پاس پہنچ گئی۔

یہ بوئنگ جہاز تھا۔ اس پر پہلے بھی میں ڈھاکہ تک سفر کر چکا تھا۔ جہاز کی ائیر ہوسٹسیں میری شناسا تھیں اور سٹیوارڈ بھی...... میں نے سیڑھیوں کے نیچے اور اوپر وہی مخصوص شناسا چہرے دیکھے۔ مس خان سیڑھیوں کے اوپر کھڑی آنے والے مسافروں کو خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ میں بھی اس کے قریب سے گذرا۔ اس نے مسکرا کر مجھے بھی خوش آمدید کہا۔ جہاز مسافروں سے بھر چکا تھا۔ ان مسافروں زیادہ تعداد بنگالی گھرانوں کی تھی۔ غیر بنگالی

میرے علاوہ شاید دو چار مسافر ہی ہوں گے ۔

میں اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میرے ساتھ ایک بنگالی بوڑھا بیٹھا تھا۔ سامنے بھی اسی قسم کا ایک بوڑھا بیٹھا تھا۔ ایئر ہوسٹس مس خان نے میرے پاس آکر جھک کر پوچھا

"کیا آپ کافی یا چائے پسند کریں گے ؟"

میں نے کہا۔ "شکریہ! صرف کافی...... بغیر دودھ کے ۔"

وہ کافی لے کر آگئی اور آہستہ سے پنجابی میں پوچھنے لگی۔

"آپ ڈھاکہ کس لئے جا رہے ہیں ؟"

میں نے کہا "میرے دو خالہ زاد بھائی وہاں پھنس گئے ہیں۔ انہیں لینے جا رہا ہوں۔"

ایئر ہوسٹس نے کہا۔

"وہاں حالات بہت خراب ہیں ۔"

یہ کہہ کر وہ مسکراتی ہوئی دوسرے مسافروں کے پاس چلی گئی۔ میں سوچ میں کہ ڈھاکہ کے حالات کیوں خراب ہیں۔ وہ لوگ تو بڑے سخت دینی مسلمان لوگ ہیں۔ انہیں کن کی صحبت خراب کر گئی۔ مجھے اقبال کا مصرع یاد آگیا ؎

خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبتِ زاغ

مشرقی پاکستان میں مہاجرین کے بھیس میں بھارت نے لاکھوں ہندو فوجی گوریلے داخل کر دیئے تھے جو جگہ جگہ توڑ پھوڑ اور پاک فوج کے خلاف وہاں کے لوگوں میں زہریلا پراپیگنڈہ کرنے میں مصروف تھے۔ یہ بھی سنا تھا کہ وہ فوجی لباس میں وہاں کے دیہات میں بنگالی مسلمانوں کے گھروں میں جا کر کہتے ہیں کہ ہم پاک فوج کے سپاہی ہیں ہمیں مرغیاں دو۔ روپے دو۔ دودھ اور انڈے دو۔ صرف اس لئے کہ مشرقی پاکستان کے لوگ فوج کے خلاف ہو جائیں یہ ہندو مکتی باہنی کے سپاہی بُری سے بُری حرکت سے بھی دریغ نہیں کرتے ۔

"خواتین و حضرات! برائے مہربانی سگریٹ بجھا دیں اور اپنی اپنی حفاظتی پیٹیاں کس کر باندھ لیں......"

جہاز کے چاروں انجن سٹارٹ ہو چکے تھے۔ جہاز نے رن وے پر آہستہ آہستہ کھسکنا

شروع کر دیا۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ کراچی کی روشنیوں سے بھری ہوئی رات میں جگمگاتی جھلملاتی، دمکتی چمکتی عمارتوں کے اوپر کولمبو کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ جہاز اڑتا چلا گیا۔ اندھیری رات میں نیچے بحیرہ عرب کا سمندر کسی کو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جہاز کولمبو کے اوپر سے گذر گیا۔ نیچے دور دور روشنیوں کے نکتے سے نظر آئے۔ جہاز پر اعلان ہُوا کہ ہم کولمبو کے اوپر سے گذر رہے ہیں۔ مجھے وہ خوب صورت دن یاد آگئے۔ جو میں نے اس حسین ترین جزیرے میں بسر کئے تھے۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا اور اپنی نیند میں سلگتی ہوئی آنکھوں کو بند کر کے یادوں کے خاموش جنگلوں میں کھو گیا۔ جہاز اب خلیج بنگال کے اوپر سے گذر رہا تھا۔ آسمان پر صبح کا نور پھوٹ رہا تھا۔ مشرقی پاکستان پہنچتے پہنچتے دن کافی نکل آیا تھا۔ میں نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ مشرقی پاکستان کے دریا اور جنگل اور چھوٹے چھوٹے جزیرے شروع ہو گئے تھے۔ جہاز ڈھاکہ کے اوپر سے گذر رہا تھا۔ گول کھڑکی میں سے میں نے نیچے دیکھا۔ فضا بدلی ہوئی تھی۔ مجھے ایک سڑک نظر آئی جو سنسان پڑی تھی۔ صرف ایک ٹرک دور جاتا دکھائی دیا۔ ڈھاکے کی یہ سڑک مجھے جہاز میں سے پہلے کبھی ایسی سنسان نظر نہیں آئی تھی۔

حالات واقعی خراب ہو چکے تھے۔ لیکن حالات کس قدر سنگین حد تک خراب ہو چکے تھے اس کا احساس مجھے ڈھاکہ ایئرپورٹ پر اترنے کے بعد ہوا۔ ہمارا جہاز رن وے پر اترنے کے بعد رینگتا ہُوا ایک جگہ آکر کھڑا ہو گیا۔ سامنے ایئرپورٹ کے کمرے تھے۔ لاؤنج تھا جہاں بڑی گہما گہمی ہُوا کرتی تھی۔ لیکن اب وہاں سوائے پاک فوج کے اور پاک ایئر فورس کے جوانوں کے اور کوئی عملے کا آدمی نہ تھا۔ یہ جوان مسافروں کو ایئرپورٹ سے باہر جانے کی سہولتیں دے رہے تھے۔ میرے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ صرف ایک بیگ تھا۔ میں نے بیگ اٹھایا اور چیکنگ کے بعد ایئرپورٹ کے بڑے کمرے میں آگیا۔

کبھی یہاں خوب صورت میزوں اور صوفوں کے پاس گلدانوں میں تر و تازہ پھول مہک رہے ہوتے تھے۔ لیکن آج یہاں صوفوں پر گرد جمی تھی۔ باتھ روم کا نل ٹوٹا ہُوا تھا جس میں سے مسلسل پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ بنگالی عملے نے ہڑتال کر رکھی تھی۔ دیواروں پر جگہ جگہ بنگلہ زبان میں نعرے لکھے ہوئے تھے۔ میں باہر آیا تو کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ ایئرپورٹ کی

عمارت کے بعد باہر غیر بنگالی یعنی پنجابی، بہاری اور پٹھان خاندانوں کا ایک ہجوم ڈیرہ ڈالے پڑا تھا۔ صندوق بسترے اور دوسرا سامان دیواروں کے ساتھ اُوپر تک لگا تھا۔ زمین پر عارضی اینٹوں کے چولہے بنے تھے جن پر کھانا وغیرہ پکایا جا رہا تھا۔

مجھے ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دن یاد آ گئے۔ ان دنوں بھی میں نے اسی قسم کے ہجوم ریلوے سٹیشنوں اور مہاجر کیمپوں میں دیکھے تھے۔ ایئر پورٹ کے ایک گیٹ کے سوا کے باقی دونوں گیٹوں کے لوہے کے دروازے بند تھے۔ دو لمبی قطاریں بنی ہوئی تھیں جن میں لوگ ایک دوسرے کے اوپر چڑھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ ڈھاکہ سے نکل جانے کے لئے پی۔آئی۔اے کے ٹکٹ اور پرمٹ حاصل کر رہے ہیں۔ پرمٹ اس لئے کہ مسافروں کو ان کی باری کے مطابق جہاز پر سوار کیا جاتا تھا۔ ڈھاکہ سے دن میں صرف دو فلائٹیں کراچی جاتی تھیں ہر ایک جہاز میں دو سو کے قریب مسافر سوار ہوتے تھے اور ایئر پورٹ کے باہر ہزاروں لوگ صرف قطاروں میں کھڑے تھے۔ جو لوگ کیمپ لگائے بیٹھے تھے ابھی ان کی قطاروں میں کھڑے ہونے کی باری بھی نہیں آئی تھی۔

قطار میں کھڑے ہونے کے لئے پانچ پانچ سو روپے کی بلیک ہو رہی تھی۔ ٹکٹ دینے والی کھڑکی پر ایک مسافر بلکہ مہاجر کئی روز میں پہنچتا تھا۔ مسافروں کو قطار میں کھڑے کھڑے جہاں رات پڑتی تھی وہ اسی جگہ بستر لگا کر سو جاتے تھے۔ ایسے لوگ بھی وہاں پیدا ہو گئے تھے۔ جو ایک سو روپیہ رات کا کرایہ لے کر مسافر یا مہاجر کی جگہ خود سو جاتے تھے یہ منظر اس قدر دلخراش تھا کہ ایک بار تو میں بھی کانپ کر رہ گیا۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں ڈھاکے آکر پھنس گیا ہوں۔ اب نہ مجھے پُراسرار آنکھوں والی سمیتا کا خیال تھا اور نہ بانس اور تاڑ کے گھنے جنگلوں کی طرف سے خوشبو آتی تھی۔ اب دل میں ایک ہی خیال تھا کہ یہاں سے اپنے خالہ زاد بھائیوں کو لے کر کب نکل سکوں گا؟

میں ایئر پورٹ سے باہر آ گیا۔

ایئر پورٹ کی عمارت کے بالکل سامنے پاک ایئر فورس کا ہوسٹل تھا۔ یہاں میرا ایک فلائیٹ لیفٹیننٹ دوست مسٹر حسن رہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس سے ملنا چاہئیے۔ کیونکہ میں

نہیں جانتا تھا کہ میرا رشتے دار فوجی افسر چھاؤنی میں کس جگہ رہتا ہے۔ سوچا کہ شاید حسن کو معلوم ہو کہ ان کی رجمنٹ کس جگہ پر ہے۔ گیٹ پر کیمپ لگا تھا۔ ایک پنجابی اور ایک بنگالی سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں لیفٹیننٹ حسن سے ملنا چاہتا ہوں بنگالی سپاہی نے مجھے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا۔ پنجابی سپاہی میرے قریب آکر کہنے لگا۔

"وہ چھاؤنی گئے ہوئے ہیں۔ آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "لاہور سے۔"

وہ چونک سا پڑا۔ "لاہور سے؟ آپ یہاں کیوں آ گئے؟"

میں نے اُسے بتایا کہ میرے عزیز یہاں محمد پور میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ان کی خیریت کے لئے بلکہ انہیں یہاں سے نکالنے آیا ہوں۔ پنجابی سپاہی خاموش ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"آپ اندر جا کر ویٹنگ روم میں انتظار کریں۔ لیفٹیننٹ حسن ابھی آ جائیں گے۔"

میں انتظار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے اپنے رشتہ دار فوجی افسر کی رجمنٹ کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا۔

"سامنے چھاؤنی کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ وہاں پنجاب رجمنٹ کی گارڈ پوسٹ ہے۔ وہاں سے آپ کو پوری اطلاع مل سکے گی۔"

چھاؤنی کے علاقے سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ یہ جگہ میری دیکھی بھالی تھی۔ لیکن ایسی بے رونقی اور ویرانی میں نے اس سے پہلے ڈھاکہ میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ تمام گاڑیوں پر سیاہ جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ ہر جگہ بنگالی آتے جاتے نظر آ رہے تھے۔ غیر بنگالی ایک بھی چہرہ وہاں نہیں تھا۔ میں چھاؤنی کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ چھاؤنی کا علاقہ جہاں سے شروع ہوتا تھا وہاں دونوں جانب سڑک سے نیچے اُتر کر پاک فوج کا کیمپ لگا تھا۔ میں ایک کیمپ کی طرف گیا۔ تمبو کے باہر خالی پیٹیوں پر دو فوجی جوان بیٹھے تھے۔ سڑک پر ایک میز رکھی تھی۔ دو فوجی جوان چھاؤنی میں داخل ہونے والے سے ضروری پوچھ گچھ کر رہے تھے۔

میں نے جا کر سلام کیا۔ ایک صوبیدار میجر نے آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔

"وعلیکم السلام۔"

میں نے پنجابی زبان میں کہا کہ لاہور سے آیا ہوں اور فلاں رجمنٹ کے فلاں آفیسر کی کوٹھی کی تلاش میں ہوں جو چھاؤنی میں رہتے ہیں۔ یہ سن کر انہوں نے اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ صوبے دار نے بڑی تشویش سے کہا۔

"آپ لاہور سے یہاں کیوں آگئے ہیں؟"

میں نے اُسے وہی کچھ بتایا جو اس سے پہلے ائیر فورس ہوسٹل کے گارڈ کو بتا چکا تھا۔ صوبیدار نے کہا۔

"کیا لاہور والوں کو خبر ہے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا کہ ساری دنیا کو معلوم ہو چکا ہے کہ بھارت کے بھیجے ہوئے ہندو مکتی باہنی یہاں کے لوگوں کو ہمارے خلاف اُکسا کر توڑ پھوڑ کی کارروائیاں کر رہی ہے۔ بے گناہ غیر بنگالیوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔ بچوں کو لوہے کی میخوں کے ساتھ درختوں پر ٹھونکا جا رہا ہے

"لیکن یہ سب کچھ بھارت کے ایجنٹ کر رہے ہیں۔ جو ہندو ہیں۔ بنگالی مسلمان کو گمراہ کیا گیا ہے۔"

صوبیدار میجر خاموش رہا۔ اتنے میں ایک نسواری رنگ کی کار چیک پوسٹ پر آکر رک گئی۔ صوبیدار میجر بھاگ کر وہاں گیا۔ واپس آیا تو اس کا چہرہ بے حد اداس تھا۔ آنکھوں میں شعلے تھے۔ معلوم ہوا کہ اس گاڑی میں ایک شریف بہاری باپ اپنی اس بچی کو ہندو مکتی باہنی کے چنگل سے چھڑا کر لایا ہے۔ جسے انہوں نے چار روز پہلے اغوا کر لیا تھا۔ اس بچی کا جو حال ہو گا۔ اس کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ ہم خاموش سے ہو گئے۔ کسی نے کوئی بات نہ کی۔ پھر صوبیدار نے کہا۔

"آپ چائے پئیں گے ہمارے ساتھ۔"

میرے انکار کے باوجود پاک فوج کے جوان نے اپنے روائتی حسن اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے مگ میں چائے پلائی اور میرے فوجی رشتے دار کی بارک کا پتا بھی بتایا۔ میں چیک پوسٹ پر ضروری چیکنگ کروانے کے بعد چھاؤنی کے علاقے میں داخل ہو گیا۔ یہ سڑک بھی ڈھاکہ شہر کی دوسری سڑکوں کی طرح ویران تھی۔ بہت کم لوگ اس پر آجا رہے

تھے۔ میں فٹ پاتھ پر چلا جا رہا تھا۔ میرا بیگ میرے ہاتھ میں تھا۔ دھوپ خوب چمک رہی تھی۔ موسم میں گرمی تھی۔ میں ٹھیک مقام پر پہنچ گیا۔ میرے عزیز فوجی افسر نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ اس کی بیوی نے حیران ہو کر مجھے دیکھا اور کہا۔

"آپ اس جلتی آگ میں کیسے آگئے؟"

مَیں نے ہنس کر کہا۔

"مجھے اس قسم کے سفروں کی عادت ہے بھابی!"

پھر مَیں نے انہیں بتایا کہ میں کس غرض کے لئے آیا ہوں۔ فوجی افسر نے کہا۔

"ہماری جیپ تو شہر میں نہیں جا سکتی۔ ہاں! میں تمہارے ساتھ نوکر بھیج دوں گا۔ جو محمد پور جا کر فیضی اور زلفی کو یہاں لے آئیں گے۔"

میں نے کہا

"نوکر کو ساتھ بھیجنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔"

اس کی بیگم جھٹ بولیں۔ "نہیں نہیں۔ ایسا نہ کرنا۔ محمد پور کے حالات بہت خراب ہیں۔"

لیکن دوپہر کے کھانے کے بعد میں کوٹھی سے باہر نکل کر محمد پور کی طرف روانہ ہو گیا۔ شہر میں اس وقت بنگالیوں، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ مکتی باہنی کا راج تھا۔ چوک چوک میں کسی پر شک پڑ جائے تو تلاشی لی جا رہی تھی۔ جس کسی کو جی چاہا پکڑا جا رہا تھا۔ بنگالی اکثریت کے محلوں میں جہاں کہیں بھی غیر بنگالی تھے انہیں یا تو ختم کر دیا گیا تھا اور یا وہ بھاگ کر میرپور میں آگئے تھے۔ یہ غیر بنگالی اکثریت کے علاقے تھے اور بہت بڑے محلے تھے۔ محمد پور تو پورے سمن آباد کی طرح ایک علاقہ پھیلا ہوا تھا۔ اسی جگہ دھان منڈی بھی تھی جہاں شیخ مجیب الرحمٰن کی کوٹھی تھی۔

میرپور بھی بہت بڑی آبادی تھی یہاں سارے کے سارے بہاری آباد تھے۔ یہ دونوں نئی آبادیاں تھیں جو حال ہی میں غیر بنگالیوں یعنی بہاریوں نے آباد کی تھیں۔ لاہور میں رہتے ہوئے ہمیں احساس نہیں تھا کہ حالات اتنے سنگین ہو چکے ہیں۔ علاوہ ازیں میرپور اور محمد پور کے بارے میں بھی ہمیں لاہور میں غلط افواہیں مل رہی تھیں.... یہ دونوں علاقے ابھی تک محفوظ

تھے۔ ان آبادیوں کے کنارے کنارے ضرور غیر بنگالیوں پر ظلم وستم ہوا تھا۔ لیکن اکثریت ابھی محفوظ تھی۔ شاید محض اس لئے کہ آبادی بہت زیادہ تھی۔

بس چھاؤنی کے دروازے پر اس جگہ آ گیا جہاں فوج کی چیکنگ پوسٹ لگی تھی۔ صوبیدار میجر صاحب نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے قریب جا کر انہیں بتایا کہ مجھے کوٹھی مل گئی ہے اور اب میں محمد پور اپنے عزیزوں کو لینے جا رہا ہوں۔ انہوں نے کچھ تشویش کا اظہار کیا۔

"ان آبادیوں میں ابھی تک زیادہ گڑبڑ نہیں ہوئی۔ لیکن وہاں تک جانے کا راستہ خطرناک ہے۔ یہ خالص بنگالی علاقہ ہے۔ اور شہر میں پولیس بھی ان ہی کی ہے۔ ہماری فوج کا ایک سپاہی بھی شہر میں نہیں ہے۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "صوبیدار صاحب! بنگالی بھائی بھی ہمارے مسلمان بھائی ہیں انہوں نے ہی مسلم لیگ بنائی تھی۔ انہیں ورغلایا گیا ہے۔ راستے میں مجھے کوئی کچھ نہیں کہے گا۔

"مجھے اپنے خدا پر بھروسہ ہے۔"

صوبیدار صاحب مجھے دیکھتے رہ گئے اور میں چھاؤنی سے نکل کر اس سڑک پر آ گیا جو ائیر پورٹ کو جاتی تھی۔ ائیر پورٹ بالکل پاس ہی تھی۔ وہاں اسی طرح غیر بنگالی کنبوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے۔ مشرقی پاکستان کے کونے کونے سے آئے ہوئے غیر بنگالی اسی طرح سے قطاروں میں کھڑے ہوائی جہاز کا ٹکٹ اور پرمٹ لینے بے یار و مددگار کھڑے تھے۔

مجھے محمد پور کا راستہ معلوم تھا۔ میں اس سے پہلے کئی بار وہاں گیا تھا۔ یہ بستی ائیر پورٹ سے اتنی ہی دور تھی جتنی دور لاہور ریلوے سٹیشن سے سمن آباد ہے۔ یہ علاقہ بھی سمن آباد سے ملتا جلتا تھا اگرچہ سمن آباد ایسی خوبصورت اور کشادہ کوٹھیاں وہاں کم تھیں اور محمد پور میں بعض بڑے گنجان علاقے بھی تھے جو اچھرہ اور گڑھی شاہو کی یاد تازہ کرتے تھے۔ میں رکشے کی انتظار میں کھڑا ہو گیا۔

بنگالی سائیکل رکشا والے میرے ارد گرد منڈلانے لگے۔ میں تیز رفتار سواری میں محمد پور کا راستہ طے کرنا چاہتا تھا ٹیکسی وہاں تھی نہیں۔ رکشا کوئی خالی نہیں تھی آخر ایک رکشا

مجھے مل گئی۔ اسے بنگالی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ میں نے اُسے کہا۔

"محمد پور چلے گا؟" اور رکشا میں سوار ہو گیا۔ بنگالی ڈرائیور نے اپنے ساتھی سائیکل رکشا والے کی طرف مسکرا کر دیکھا اور رکشا سٹارٹ کر دیا۔ میں کچھ پریشان سا ہوا۔ دونوں کے اشارے خطرناک تھے۔ لیکن اب رکشا ائیر پورٹ سے فارم گیٹ کی طرف دوڑے جا رہا تھا۔ راستے میں سڑک پر ایک بھی غیر بنگالی چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ سڑک پر ایک جگہ بائیں جانب دوسری منزل پر ہمارے ایک دوست اسحاق کشمیری کی نوادرات کی دکان کی گیلری میں تانبے کے تھال اور سجاوٹی فانوس لٹک رہے تھے۔ گیلری میں کرسی پر اس کا بنگالی ملازم بیٹھا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ دکان اپنے بنگالی ملازم کے حوالے کر کے لاہور چلے گئے تھے۔ حالات ٹھیک ہو جانے کے بعد وہ ڈھاکہ آ گئے اور حالات زیادہ خراب ہو جانے کے بعد وہ دوبارہ واپس چلے گئے اور پھر لوٹ کر نہ آئے۔ چنانچہ آج کل ان کی دکان کا مالک ان کا بنگالی ملازم ہے۔

سڑک فارم گیٹ کی طرف مڑی تو چوک میں بنگالی نوجوانوں نے رکشے کو روک لیا۔ یہ ایک بڑا سنگین معاملہ ہے۔ لیکن چونکہ میں نیا نیا لاہور سے آیا تھا اور ابھی مجھ میں بنگالیوں کی اسلام دوستی کا احساس شدید تھا اس لئے میں ذرا نہ گھبرایا اور رکشے سے منہ باہر نکال کر کہا۔

"کیا بات ہے بابو؟"

بنگالی مجھے تعجب سے دیکھنے لگے۔ شائد انہیں پہلی بار کوئی غیر بنگالی ملا تھا جس نے ان حالات میں اس اعتماد کے ساتھ منہ باہر نکال کر بات کی تھی۔ کیونکہ جیسا کہ مجھے محمد پور جا کر معلوم ہوا تھا کہ جس کسی نے رکشے میں سے منہ باہر نکال کر بات کی اس کی گردن گاجر مولی کی طرح کاٹ کر سڑک پر پھینک دی گئی تھی۔ میرا اعتماد کام کر گیا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ حالات کس قدر خون آشام ہو گئے ہیں تو میرا خیال ہے کہ میں بھی اس اعتماد سے گردن رکشے سے باہر نہ نکالتا۔ میرے اس طرح سے بات کرنے پر بنگالی نوجوان پرے ہٹ گئے۔

"تم کدھر کو جاتا؟"

ظاہر ہے انہوں نے میرے رنگ روپ اور بولنے کے انداز سے پتا کر لیا تھا کہ میں پنجابی ہوں۔ میں نے کہا۔

"اپنی ماسی کے ہاں جا رہا ہوں۔ دھان منڈی میں۔
شیخ مجیب الرحمان کی کوٹھی کے ساتھ والی کوٹھی میں ......"

موسی، دھان منڈی اور شیخ مجیب الرحمٰن کا نام کام کر گیا۔ انہوں نے مجھے آگے جانے کی اجازت دے دی۔ رکشا ڈرائیور نے مسکرا کر مجھے گردن گھما کر دیکھا اور کہا۔

"بابو جی! تم لوگ بڑا خوش قسمت جو بچ گیا۔ اِدھر تو یہ لوگ کسی کو نہیں چھوڑتا۔"

میں نے کہا۔ "بھائی تم بھی مسلمان ہم بھی مسلمان بھائی بھائی ہے پھر ایک دوسرے سے کیا ڈرنا۔"

بنگالی رکشا ڈرائیور نے کوئی جواب نہ دیا۔ کیونکہ مشرقی پاکستان میں ہندو مکتی باہنی اور بھارت کے غیر مسلم ایجنٹوں نے نفرت کا ایسا شدید بیج بویا تھا کہ مسلمان، مسلمان کی گردن پر چھری چلا رہا تھا۔ رکشا اب فارم گیٹ سے نکل کر محمد پور کے قریب پہنچ گیا تھا۔ یہ فارم گیٹ ایوّب خان نے بنایا تھا۔ رکشا اب محمد پور میں داخل ہو گیا تھا۔ دائیں بائیں اک منزلہ پرانی طرز کی برآمدوں والی ویران سی کوٹھیاں تھیں۔ یہاں بہت کم لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ رکشا مارکیٹ میں جا کر کارپوریشن ہال کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ یہاں کافی رونق تھی۔ میں رکشے سے اترا اور اس عمارت کی طرف آ گیا جہاں میرے خالہ زاد بھائی رہتے تھے۔ ان کی عمارت کے باہر ایک گاڑی کھڑی تھی۔

میں ڈرائینگ روم میں داخل ہوا تو زلفی اور رفیقی مجھے دیکھ کر حیران بھی ہوئے اور خوش بھی ہوئے۔ وہ ایک امریکی بوڑھی عورت کو قالین کھول کر دکھا رہے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں صرف ان کے لئے ڈھاکہ آیا ہوں۔ وہ بڑے متاثر ہوئے کہ اتنے شدید حالات میں بھی میں آ گیا۔ حالانکہ اگر کوئی انسان اپنے کسی عزیز کی خاطر اس قسم کے خراب حالات میں سفر کرتا ہے تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ پیچھے لاہور میں سب گھر والے ان کے لئے بے حد پریشان ہیں۔ وہ ہنس کر کہنے لگے کہ یہاں محمد پور میں تو سب

میں نے کہا۔

"پھر بھی میرا خیال ہے کہ آپ لوگوں کو یہاں سے اُٹھ کر چھاؤنی چلے جانا چاہیئے جب حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو پھر یہاں واپس آ جانا۔"

زلفی ہنس کر بولا۔ حالات بالکل ٹھیک ہیں یہاں بھائی جان! محمد پور میں ہمیشہ سے امن رہا ہے اور امن رہے گا۔ یہاں دھان منڈی میں شیخ مجیب کی کوٹھی ہے یہاں کبھی کسی قسم کی گڑبڑ نہیں ہوگی۔"

میں نے انہیں بتایا کہ راستے میں بنگالیوں نے مجھ سے پوچھ گچھ کی تھی۔ وہ بڑے پریشان سے ہو گئے۔

"خدا کا شکر ہے کہ آپ بچ کر نکل آئے، ہم تو اوّل یہاں سے باہر نہیں جاتے۔ غیر ملکی گاہک اپنی گاڑیوں میں ہی یہاں پر آ جاتے ہیں۔ اگر کبھی گلشن وغیرہ کے علاقے میں جانا بھی ہوتا ہے تو غیر ملکی لوگوں کے ساتھ ان کی گاڑیوں میں جاتے ہیں۔"

گلشن کا علاقہ ڈھاکے کا نیا علاقہ ہے۔ جس طرح سے لاہور میں گلبرگ کا علاقہ ہے۔ وہاں زیادہ تر غیر ملکی سفارتی لوگوں کے بنگلے تھے۔ میں نے کھانا کھایا اور آرام کرنے کے لئے لیٹ گیا۔ دوپہر کے بعد ہم محمد پور کی مارکیٹ میں آ گئے۔ یہاں بہاریوں کی بے شمار دکانیں تھیں سبزی فروش، مچھلی فروش، سقائی، کریانہ فروش، کپڑے فروخت کرنے والے...... ساری دکانیں کھلی تھیں اور خوب کاروبار ہو رہا تھا۔ بنگالی بھی دکھائی دے جاتے تھے۔ مگر وہ بہت کم تھے۔ زیادہ لوگ بہاری اور دوسرے پنجابی وغیرہ تھے۔

واپس آ کر ہم برآمدے میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے۔ اوپر والی منزل میں ایک نہایت شریف متوسط درجے کا گدی کینہ رہتا تھا۔ محمود نامی دُبلا پتلا سانولے رنگ کا بہاری لڑکا ہمارے پاس بیٹھا ہمیں اپنی خوفناک داستان سنا رہا تھا کہ کس طرح سے وہ چٹا گانگ سے اپنی دو نوجوان بہنوں کو لے کر ڈھاکہ پہنچا تھا۔ اس کی دونوں بہنیں چٹا گانگ کے میڈیکل کالج میں پڑھ رہی تھیں اور ہوسٹل میں رہتی تھیں۔ ان کے نکلتے ہی مکتی باہنی کے

ہندو غنڈوں نے اس ہوسٹل پر حملہ کر دیا اور لڑکیوں کو اغوا کر کے لے گئے۔ ان بچیوں میں سے بہت کم بچیاں بعد میں برآمد ہو سکیں۔ باقیوں کا آج تک پتا نہیں چل سکا کہ وہ کہاں ہیں۔ زندہ بھی ہیں یا نہیں! محمود نے کہا۔

"فرید پور میں ہماری گاڑی پر حملہ ہو گیا۔ مکتی باہنی والے چن چن کر گاڑی کے غیر بنگالیوں کو قتل کرنے لگے۔ پلیٹ فارم خون سے بھر گیا میں نے بڑی مشکل سے بنگالی کہہ کر اپنی اور اپنی بہن کی جان بچائی۔"

محمود کی تینوں بہنیں کالج میں پڑھتی تھیں۔ ایک چٹاگانگ میڈیکل کالج میں تھی۔ اور باقی دو ڈھاکہ کے کسی کالج میں پڑھتی تھیں۔ تینوں گھر پر بیٹھی تھیں۔ کیونکہ ڈھاکہ کے سارے سکول اور کالج بند تھے۔ ہر رکشا، ٹیکسی اور گاڑی پر سیاہ جھنڈی لگی تھی۔ میں نے دونوں بھائیوں کو واپس چھاؤنی لے جانے کی کوشش کی تو انہوں نے ہنس کر کہا

"گھبرانے کی کون سی بات ہے۔ چند ایک روز میں حالات بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ پھر محمد پور پر حملہ نہیں ہو سکتا۔ یہاں تو لاکھوں کی تعداد میں غیر بنگالی رہتے ہیں۔"

ایک روز میں نے بنگال رائفلز کا ٹرک دیکھا۔ وہ منڈی کے باہر کھڑا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ فوج کے باغی دستوں کا ٹرک ہے اور اپنے فوجیوں کے لئے سبزی گوشت اور آٹا دال وغیرہ لینے آیا ہے۔ شام کو میں ایک غیر ملکی ویگن میں بیٹھ کر واپس چھاؤنی گیا اپنے فوجی عزیز کو ساری صورت حال بتائی۔ اُس نے کہا۔

"آپ لوگ بہت بھاری غلطی سے کام لے رہے ہیں۔ آپ کو فوراً چھاؤنی آجانا چاہئیے۔ کوئی پتا نہیں کہ حالات کیا سے کیا رُخ اختیار کر لیں۔"

دوسرے دن زلفی اور فیضی نے کچھ مال اکٹھا کیا اور اُسے ایک آسٹریلیا ہائی کمیشن کے ایک ٹرک میں ڈال کر محمد پور سے نکال کر چھاؤنی پہنچا دیا۔ اب میں بھی چھاؤنی کی بجائے محمد پور میں ہی رہ گیا تھا۔ میں نے دونوں بھائیوں کو اس پر راضی کر لیا تھا کہ وہ میرے ساتھ واپس لاہور چلے چلیں۔ میں ان کے لئے واپسی پی۔ آئی۔ اے کے ٹکٹ ساتھ

لے کر چلا تھا۔ اب سوال ان کے پرمٹ حاصل کرنے کا تھا۔ میں نے بہت زیادہ سفارش لڑائی تو ہمیں پرمٹ مل گئے۔ لیکن ان پرمٹوں کا نمبر ایک ہفتے کے بعد آتا ہے۔

ہم سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ابھی ہمیں ڈھاکہ میں ایک ہفتہ اور بسر کرنا تھا۔ ڈھاکہ شہر کی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی۔ جگہ جگہ بم پھینکے جاتے تھے۔ غیر بنگالیوں کو موقع پا کر ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ دوسرے شہروں اور دوسرے اضلاع کے دیہات میں بہت خراب حالت تھی۔ ایسی ایسی دل خراش خبریں سننے میں آ رہی ہیں کہ آنکھوں میں بے اختیار آنسو آجاتے تھے۔ ہم شام کو محمد پور میں اپنے مکان کے باہر بیٹھ جاتے اور دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ وہاں سلہٹ کا ایک قالینوں کا سوداگر خیر دین بھی آجاتا۔ اس نے کمال ہوشیاری سے کام لے کر اپنا سارا مال بک کروا کر لاہور بھجوا دیا تھا اور خود جیب میں پرمٹ لے کر واپس جانے کو تیار بیٹھا تھا۔ اس کا کام اب شہر کے غیر بنگالیوں میں افراتفری پھیلانا تھا۔

"بھائی صاحب! پتا نہیں کل کیا ہو جائے۔ فوج حملہ کرنے ہی والی ہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ مشرقی پاکستان میں بھارتی جاسوس تخریبی کارروائیاں کر رہے ہیں۔"

میں ایک روز اپنے مکان کے پچھواڑے آنگن میں کرسی ڈالے بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ ساتھ والے مکان کی کھڑکی میں ایک سانولی سی لڑکی کا اداس چہرہ نمودار ہوا۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ اس لڑکی نے مجھے اشارہ کر کے اپنی طرف متوجہ کیا۔ میں نے کتاب پرے ہٹا کر اسے غور سے دیکھا۔ وہ ہنس رہی تھی۔ میں نے اس سے اشاروں میں پوچھا کہ وہ کیا چاہتی ہے؟ اس نے ایک رقعہ میری طرف پھینک دیا یہ کاغذ کی گولی سی میرے پاؤں کے پاس آگری۔ میں نے اُسے کھول کر پڑھا۔ لکھا تھا۔

"آج رات بارہ بجے اسی آنگن میں میرا انتظار کرنا۔"

میں پریشان سا ہو گیا۔ ایک زمانہ تھا کہ آدھی رات کو کوٹھے پھلانگ کر لڑکیوں سے ملنے جایا کرتا تھا۔ لیکن اب وہ وقت نہیں رہا تھا۔ اور پھر میں ڈھاکے اس مقصد کے لئے نہیں آیا تھا۔ میں اُٹھ کر باہر آگیا۔ رات دس گیارہ بجے تک ہم ڈرائنگ روم

میں بیٹھے تاش کھیلتے رہے۔ پھر سب سو گئے۔ میں بھی اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ دل یہی کہتا تھا کہ بارہ بجے تک جاگو اور معلوم کرو کہ ہمسایہ کی بنگالی لڑکی کیا کہنا چاہتی ہے۔

ٹھیک رات کے بارہ بجے میں پچھلے آنگن میں آ گیا۔ یہاں ایک شریفے کا درخت تھا میں اس کی آڑ میں ہو کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس بنگالی لڑکی کا چہرہ دیوار پر نمودار ہوُا۔ پھر اس نے ہمارے آنگن میں آہستہ سے چھلانگ لگا دی۔ میں درخت کے سائے میں سے باہر نکل آیا۔ اندھیرے میں اس سانولی بنگالی لڑکی کی سُرخ آنکھیں سانپ کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ میں نے سرگوشی میں اس سے پوچھا کہ وہ مجھے کیا کہنا چاہتی ہے اور اس نے مجھے کس لئے بلایا ہے؟ اس نے اپنا چہرہ میرے قریب لا کر سرگوشی میں گہر سانس بھر کر کہا۔

"تم سے محبت کرتے....."

اس کے گرم سانس میں سانپ کی پھُنکار تھی۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ میں نے کہا۔

"تم غلطی پر ہو۔ میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔ جاؤ اپنے گھر واپس کُود جاؤ نہیں تو میں ابھی تمہارے ماں باپ کو خبر کر دوں گا۔"

اس بنگالی لڑکی نے میری گردن میں اپنی سیاہ سانپ ایسی بانہیں ڈال دیں اور مسکرا کر کہنے لگی۔

"تم واپس نہ جاؤ۔ یہیں رہ جاؤ۔ ہم یہاں سے بھاگ سلہٹ چلے جائیں گے۔ وہاں میری ایک بہن کا مکان ہے وہ سلہٹ سے پچاس میل دور گھنے جنگل میں دریا کے کنارے رہتی ہے۔ وہاں مہوا کے سُرخ پھُول کھلتے ہیں جن کی شراب بنائی جاتی ہے۔ تم میرے ساتھ وہاں چلے چلو۔ ہم ساری زندگی وہاں رہیں گے۔ چلو میرے ساتھ وہاں ہم کبھی ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوں گے۔ میں تمہیں محبت کا وہ پھول دوں گی جس کی خوشبو

تم ساری زندگی نہ بھُلا سکو گے۔"

مجھے بنگال کی جادوگرنیاں یاد آ گئیں۔ میں نے اس کے ہاتھ پیچھے جھٹک دیئے اور کہا۔

"ہوش کرو احمق لڑکی! تم ابھی غیر شادی شدہ ہو۔ تم ایک شریف مسلمان گھرانے کی لڑکی ہو۔ کیا تمہیں اپنے ماں باپ کی عزّت کا بھی خیال نہیں؟"

وہ تحقر آمیز انداز میں ہنسی جیسے کہہ رہی ہو۔ بڑے احمق ہو تم جو ایک ایسی لڑکی کو اس کے ماں باپ یاد دلا رہے ہو جو ان سب کو چھوڑ کر پکے ہوئے پھل کی طرح تمہاری جھولی میں آن گری ہے۔ میں نے اسے کسی نہ کسی طرح واپس اپنے مکان میں کود جانے پر مجبور کر دیا۔ صبح میں نے اس لڑکی کے بارے میں تحقیق کی تو معلوم ہوُا کہ وہ ایک ہندو بنگالی لڑکی ہے جو سلہٹ سے ڈھاکہ کو اپنی سہیلی کے پاس آئی ہوئی ہے۔ چند روز بعد وہ واپس سلہٹ چلی گئی۔ پھر معلوم ہوُا کہ اُسے ہندو بھارتی گوریلا فورس نے کرائے پر لے رکھا تھا اور اس سے مسلمان پنجابیوں اور پٹھانوں کو گمراہ کر کے، ورغلا کر فوج کے ٹھکانوں کی جاسوسی کرنے کا کام لیتے تھے۔

پی۔ آئی۔ اے پر ہماری باری ابھی نہیں آ رہی تھی۔ ہمارا پرمٹ نمبر پچاس ہزار کے قریب تھا اور ابھی سات ہزارواں نمبر جا رہا تھا۔ ایک روز میں نے اپنے عزیز زلفی سے کہا کہ سادر جاتے ہیں۔

"وہاں جرمن ملک پلانٹ میں میرا ایک پشاور کا دوست کام کرتا ہے اس کی خیر خیریت دریافت کرنی چاہتا ہوں۔ معلوم نہیں بیچارہ کس حال میں ہے۔"

سادر ایک چھوٹی سی بستی ہے جو ڈھاکہ سے پندرہ میل کے فاصلے پر چٹا گانگ کی طرف آباد تھی۔ یہاں جرمن ملک پلانٹ والوں نے ایک بڑی خوب صورت ماڈرن کالونی بنائی ہوئی تھی۔ اس کالونی میں میرا وہ پشاوری دوست کام کرتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جرمن کمپنی والوں کے ساتھ ہو گا اور مکتی باہنی کے غنڈے اس کالونی میں نہیں جائیں گے۔ اسی لئے

میں اس سے ملنے جانا چاہتا ہوں۔

زُلفی نے کہا۔

"میں خود ذرا ڈھاکے سے باہر نکل کر سیر وغیرہ کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن فیضی کو بالکل علم نہیں ہونا چاہیئے وہ ہمیں بالکل نہیں جانے دے گا۔

"تم بے فکر رہو۔ ہم اسے بالکل نہیں بتائیں گے۔ بس یہی کہیں گے کہ چھاؤنی جا رہے ہیں۔"

چنانچہ ایک دن ناشتے کے بعد ہم نے گاڑی پکڑی۔ زُلفی سٹیرنگ پر بیٹھا۔ فیضی سے یہی کہا کہ ذرا چھاؤنی تک جا رہے ہیں اور محمد پور سے باہر نکل کر سادر کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ ہماری ایک سنگین غلطی تھی کہ اس سنگین صورت حال میں ہم ڈھاکہ شہر سے باہر جانے کا خطرہ مول رہے تھے۔ ڈھاکہ شہر سے باہر تو بے حد حالات خراب تھے اور ہر طرف مکتی باہنی کا راج تھا۔ کھلنا، باریسال اور نرائن گنج میں غیر بنگالیوں کی بھاری تعداد کو قتل کر دیا گیا تھا۔

بہرحال یہ ہماری حماقت تھی یا جو کچھ بھی تھا۔ ہماری واکس ہال گاڑی شہر سے باہر نکل گئی تھی اور اب بوڑھی گنگا کا پتلا سا پل عبور کر رہی تھی۔ یہاں ون وے ٹریفک ہے۔ پل پر سے گذر کر ہم دکانوں کے قریب سے گذرے تو زُلفی نے کہا۔

"ادھر دیکھو!"

میں نے دیکھا۔ وہاں قطار اندر قطار دکانیں ٹوٹی پڑی تھیں۔ کئی دکانیں جل کر راکھ ہو چکی تھیں سڑک کنارے اینٹوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ اس نے کہا۔ "یہ تمام دکانیں غیر بنگالیوں کی تھیں۔ انہیں لوٹ کر ان کے مالکوں کو قتل کر دیا گیا۔"

میں پہلی بار کانپ سا گیا اور مجھے ۱۹۴۷ء کے فسادات کا زمانہ یاد آ گیا۔ جب میں بے خیالی میں امرتسر کے سکھوں کے علاقے میں داخل ہو گیا تھا۔ اب ہم ڈھاکہ سے دس میل باہر نکل آئے تھے۔ یہ سڑک سیدھی دوسرے بڑے شہر کو جاتی تھی۔ اس سڑک کے کنارے ٹوٹے ہوئے تھے اور جگہ جگہ اینٹوں اور پتھروں کے ڈھیر پڑے تھے۔ سڑک پر دو

جانب کھڑے سُنبل کے سرخ پھولوں والے درختوں کا سایہ تھا۔ ہم ان درختوں سے نکل کر کھلے میدان میں آ گئے۔ یہاں ہمیں دُور سے ایک جلوس نظر آیا۔ لمبے لمبے بانس۔ سُرخ ٹوپیاں اور لوگوں کا ہجوم...... زلفی نے کہا۔

"کہیں کوئی مصیبت نہ پڑ جائے۔ اس قسم کے جلوس غیر بنگالیوں کا قتل عام کیا کرتے ہیں۔"

اب ہم جلوس کے قریب پہنچ گئے تھے۔ جلوس سادر کی طرف جا رہا تھا۔ لوگوں کی پیٹھ ہماری طرف تھی۔ انہوں نے سڑک چھوڑ رکھی تھی۔ ہماری کار تیزی سے ان کے قریب سے گذر گئی۔ جلوس بڑے سخت اشتعال انگیز نعرے لگا رہا تھا۔ میں وہ نعرے یہاں نہیں لکھ سکتا دو میل کے فاصلے پر سادر کی جرمن کالونی تھی۔ ہماری کار کالونی کے بانس کے گیٹ میں سے اندر داخل ہو گئی۔ اندر ہو کا عالم طاری تھا۔ نہ بندہ نہ بندہ ذات.... زرد رنگ کی چھوٹی چھوٹی کوٹھیوں کے ویران برآمدوں میں سوکھے پتے گرے پڑے تھے۔ ایک بنگالی لڑکا درخت تلے بیٹھا تھا۔ ہم کار اس کے قریب لے گئے۔ میں نے ٹوٹی پھوٹی بنگالی میں اس سے پوچھا کہ یہ جرمن کالونی والے لوگ کہاں چلے گئے؟ اس نے نفرت سے ہماری طرف دیکھا۔ کیونکہ رنگ اور شکل و صورت کے لحاظ سے ہم صاف پنجابی معلوم ہو رہے تھے۔ اس نے کہا۔

"وہ لوگ یہاں سے چلے گئے ہیں۔ ادھر کوئی نہیں ہے۔"

"زلفی نے مجھے آنکھ ماری۔ میں نے گاڑی کا دروازہ بند کر لیا۔ ہم نے گاڑی کالونی کے گیٹ سے باہر نکال لی۔ زُلفی بولا۔

"ہم نے یہاں آ کر بڑی غلطی کی۔

ہمیں پہلی بار شدید تنہائی اور بے بسی کا احساس ہوا۔ ہم نے اپنے آپ کو بالکل اکیلا محسوس کیا۔ مکتی باہنی کے چھپے ہوئے ہندو غنڈوں کے نرغے میں گھرے ہوئے بالکل اکیلے ...... گاڑی سڑک پر آئی تو اس تنہائی میں پہلی بار دہشت کا رنگ آ گیا۔ کیونکہ وہی جلوس اب ہمارے بالکل سامنے سے چلا آ رہا تھا۔ زلفی نے چونک کر کہا

" مارے گئے یہ لوگ تو بالکل سڑک کے بیچ چلے آ رہے ہیں ۔"

سڑک زیادہ سے زیادہ آٹھ فٹ چوڑی تھی اور جلوس نے ساری سڑک روک رکھی تھی ۔ وہ بانس ہلا ہلا کر نعرے لگاتا ناچتا چلا آ رہا تھا ۔ شاید وہ کسی گاؤں پر حملہ کرنے جا رہا تھا ۔ ایک بار تو مجھے بھی پسینہ آ گیا ۔ گاڑی جلوس کے قریب پہنچ رہی تھی ۔ جلوس راستہ نہیں دے رہا تھا وہ سڑک نہیں چھوڑ رہا تھا ۔ شائد جلوس کے لوگوں نے ہمیں جاتے دیکھ لیا تھا اور پہچان لیا تھا کہ ہم پنجابی ہیں ۔ اب واپس ہماری گاڑی دیکھی تو سڑک کے بیچ میں آ گئے تھے تاکہ حملہ کر کے ہمیں گاڑی سمیت تہہ تیغ کر دیا جائے ۔

قریب پہنچ کر زُلفی نے بریک لگائی تو میں نے چیخ کر کہا

" خُدا کے لئے بریک نہ لگاؤ ۔ گاڑی کی سپیڈ اسی میل فی گھنٹہ کر دو ۔ اب جو ہو گا دیکھا جائے گا ۔"

زُلفی نے ایسا ہی کیا ۔ ایک دم سے کلّی دبائی اور گاڑی کی سپیڈ تیز ہو گئی ۔ سپیڈ تیز ہوتے ہی گاڑی جلوس کے اُوپر جا پہنچی ۔ لوگ ایک دم سے اِدھر اُدھر ہٹ گئے ۔ سڑک پر راستہ بن گیا ۔ زلفی اور میں نے اپنے سر نیچے کر لئے ۔ زُلفی صرف شیشے میں سے سڑک کو دیکھ رہا تھا گاڑی بے پناہ رفتار کے ساتھ جلوس کے بیچ میں سے گذر گئی ۔ لوگوں نے گاڑی پر زور زور سے بانس مارے ۔ انہوں نے گاڑی کے پیچھے بھی بانس پھینکے ۔ لیکن ہماری گاڑی موت کے منہ سے نکل چکی تھی ۔

کافی دور تک ہم میں سے کسی نے آپس میں کوئی بات نہ کی ۔ رنگ زُلفی کا بھی زرد ہو گیا تھا اور رنگ میرا بھی زرد ہو گیا تھا ۔ ہم سچ مچ موت کے منہ سے نکل کر آ رہے تھے ۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ تو کچھ بھی نہیں تھا ۔ مجھے تو ابھی ایسے ایسے بھیانک واقعات پیش آنے والے تھے کہ ان کے مقابلے میں یہ حادثہ ایک پرکاہ کی وقعت نہیں رکھتا تھا ۔ ڈھاکہ فال ہو جائے گا ۔ اس وقت تک تو کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا ۔

زُلفی نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا ۔

" یا اللہ تیرا شکر ہے ..... خدا نے ہمیں بچا لیا ۔ موت ہمارے بالکل سامنے کھ

تھی ۔ ان ظالم لوگوں نے ہمارا تِکّا بوٹی کر دینی تھی ۔"

ڈھاکہ شہر کی عمارتیں دُور سے نظر آنے لگیں ۔ ہمارے بائیں جانب میر پور کی بہاری بستی گذرنے لگی ۔ اب وہی بوڑھی گنگا والا تنگ سا بانس کا پُل آ رہا تھا ۔ زُلفی نے کہا

" خدا سے دعا کرو کہ وَن وے ٹریفک ہماری طرف سے کھلا ہو ۔"

مقصد یہ تھا کہ ہم وہاں رک کر انتظار کرنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے ۔ دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پی رہا تھا ۔ ہماری گاڑی پُل کے قریب پہنچی تو معاملہ برعکس نکلا ۔ پُل پر ٹریفک مخالف سمت سے جاری تھی ۔ ہم نے گاڑی ایک درخت کے نیچے کھڑی کر دی ۔ سامنے بنگالی پان والے کا کھوکھا تھا ۔ وہاں بیٹھے ہوئے بنگالی نوجوان بڑے غور سے ہماری طرف گھورتا نظر آ رہا تھا ۔ ایک ٹرک بالکل ہمارے قریب سے موڑ کاٹ کر گذر گیا ۔ زلفی نے جلدی سے کہا ۔

" دیکھا ! کم بخت ہمیں ٹکر مارنا چاہتا تھا ۔"

خدا خدا کر کے ٹریفک کھلی ۔ یہ وقفہ ہمیں ایک سال کا وقفہ لگ رہا تھا ۔ زُلفی نے گاڑی جلدی سے سٹارٹ کی اور ہم پُل پر سے گذر کر محمد پور کی طرف روانہ ہو گئے ۔ گھر آ کر ہم نے سکھ کا سانس لیا ۔ جب ساری کہانی فیفی کو سنائی تو وہ ہم دونوں پر برس پڑا ۔ پھر اس نے بھی خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ ہماری جان بچ گئی ۔ اُسی وقت اقبال ہال کی طرف دھماکہ ہُوا دکانیں جلدی جلدی بند ہو گئیں ۔ کسی نے ایک پنجابی سٹور پر دستی بم دے مارا تھا ۔ ہم بھی بھاگ کر ڈرائینگ روم میں آ گئے اور دروازے کھڑکیاں بند کر دیں ۔ اس کے ساتھ ہی دو دھماکے اور ہوئے ۔ پھر محمد پور میں گہری خاموشی چھا گئی ..... شام کو کہیں جا کر لوگوں نے کھڑکیاں دروازے کھولے اور ڈرتے ڈرتے باہر نکل کر سودا سلف کی خریداری کرنے لگے ۔

اس رات محمد پور میں ایک بہت بڑا دھماکہ ہُوا ۔ لوگوں نے اپنے اپنے گھروں کی روشنیاں گل کر دیں ۔ ہم نے بھی کھڑکیاں بند کر دیں ۔ ایک آدھ بار باہر جھانک کر دیکھا سامنے والی سڑک بالکل سنسان تھی ۔ ایک جیپ تیزی سے بھاگتی ہوئی گذر گئی ۔ سٹریٹ لیمپوں کی روشنی میں کچھ بنگالی نظر آئے جو اس میں لاٹھیاں لئے سوار تھے ۔ وہ رات محمد پور

پر بڑی بھاری گذری۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ سارے ڈھاکے شہر پر مکتی باہنی اور ہندو پراپیگنڈے سے متاثر جذباتی بنگالیوں کا قبضہ تھا جو جگہ جگہ غیر بنگالیوں کے محلوں میں بم مار رہے تھے۔ پاک فوج بارکوں میں بند تھی۔ شہر اس کے لئے آوٹ آف بانڈ قرار دے دیئے گئے تھے۔ چنانچہ عوامی لیگ کے غنڈے من مانی کر رہے تھے۔

دن چڑھا تو سب لوگ سے باہر نکلے۔ مارکیٹ میں بھی دکانیں کھل گئیں۔ پتا چلا کہ رات ایک بہاری کے مکان پر عوامی لیگ کے غنڈے بم مار گئے تھے۔ بم سے مکان ک ایک حصّہ گر گیا تھا۔ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ میں چھاؤنی گیا تو میرے فوجی عزیز نے کہا

"بھئی آپ لوگ محمد پور میں کیوں بیٹھے ہیں۔ یہاں چھاؤنی میں آ جائیں۔ وہاں حالات بہت سنگین ہو رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "آپ بھی تو یہاں کچھ اچھے حالات میں نہیں ہیں مجھے معلوم ہے کہ آپ کے سارے بنگالی ملازم بھاگ گئے ہیں اور آپ کو سبزی اور گوشت بھی بنگالی دکاندار سپلائی نہیں کر رہے۔"

دو روز پہلے میرے فوجی عزیز نے بتایا تھا کہ ان کا اردلی چھاؤنی کی ایک دکان سے گوشت اور سبزی لینے گیا تو بنگالی دکاندار نے یہ کہہ کر گوشت دینے سے انکار کر دیا کہ وہ پنجابی فوج کو مال نہیں دے گا۔ پھر تو وہ بنگالی دکاندار بھی چھاؤنی کی دکانیں بند کر کے بھاگ گئے تھے۔ اس روز میں ایئرپورٹ کے سامنے پاک ایئرفورس کے ہوسٹل میں اپنے دو حسن سے ملنے گیا۔ وہ نماز پڑھ رہا تھا۔ میں اس کے ڈرائینگ روم میں بیٹھ گیا۔ نماز سے فار ہو کر وہ گلے ملا۔ مجھے ان حالات میں ڈھاکے میں دیکھ کر حیران ہوا۔ اس کی زبانی معلوم ہو کہ آفیسرز میں کے سارے بنگالی باروچی اور ملازم بھاگ گئے ہیں۔

"ہم اپنا کھانا آپ بناتے ہیں اور کھانے کے بعد اپنی تھالیاں اور برتن خود صاف کر کے رکھتے ہیں۔"

یہ وہاں کے فلائیٹ آفیسروں اور سارے ہی آفیسروں کا حال تھا۔ وہ چوبیس چوب

گھنٹے ڈیوٹی دیتے تھے۔ دن میں صرف دو ایک گھنٹے ریسٹ کرتے تھے میں نے اُسے بتایا کہ میں واپس لاہور جا رہا ہوں۔ لیکن ابھی میرے پرمٹ کے نمبر کی باری دُور ہے۔ اس نے کہا۔

"غیر بنگالی یہاں سے جا رہے ہیں اور ادھر سے بنگالی خاندان یہاں دھڑا دھڑ چلے آ رہے ہیں۔ خدا جانے کیا ہونے والا ہے۔ اللہ ہمارے گناہ معاف کرے۔"

مجھے اس کے پاس بیٹھے بیٹھے شام ہو گئی تو وہ کچھ گھبرا سا گیا۔

"تمہیں اب واپس محمد پور نہیں جانا چاہیئے۔ یہ لوگ چلتے رکشا پر بھی بم مار دیتے ہیں۔ ان کو پتا لگ جاتا ہے کہ بنگالی کون ہے اور غیر بنگالی کون ہے۔ تم میرے ہوسٹل میں ہی ٹھہر جاؤ۔"

میں نے کہا۔ "کوئی بات نہیں یار۔ مجھے خدا پر بھروسہ ہے۔ جو رات قبر میں آنی ہے بس وہی رات آنی ہے۔ اچھا اب میں جاتا ہوں۔"

وہ کمرے سے باہر تک مجھے چھوڑنے آیا۔ سامنے درختوں میں اس کی جیپ کھڑی تھی جس پر ایک بہت بھاری بھرکم مشین گن لگی تھی۔ اس نے بڑے افسوس کے ساتھ کہا کہ وہ مجھے جیپ پر محمد پور تک نہیں چھوڑ سکتا۔ کیونکہ فوج کو شہر میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں ہوسٹل کے لان میں سے گذر کر گیٹ پر آ گیا۔ ایئرپورٹ کی عمارت پر روشنی ہو رہی تھی۔ ایئرپورٹ سے رکشا مل جاتے تھے۔ میں وہاں رک گیا۔ ایک رکشہ میرے قریب آ کر رُکا۔ بنگالی نوجوان نے مجھے غور سے دیکھا۔ میں اس میں سوار ہو گیا۔ یہ ہمارا اصول تھا کہ ہم کسی جگہ سے رکشے میں سوار ہوتے وقت محمد پور کا نام نہیں لیتے تھے کہ ہم غیر بنگالی ہیں۔ پھر بھی ہماری تسلّی ہو جاتی تھی۔

ایئرپورٹ والی سڑک سے بائیں طرف گھومے تو یہاں کچھ بنگالی کھڑے تھے۔ انہوں نے میرے رکشے کو گھور کر دیکھا۔ میں نے بنگالی زبان میں رکشے والے سے کہا۔ کہ رکشا روکے نہیں۔ میں دھان منڈی جا رہا ہوں شیخ مجیب سے ملنے۔ بنگالی رکشا والا کچھ مرعوب ہو گیا۔ وہ رکشا لے کر نکل گیا۔ محمد پور کی حدود میں داخل ہوا تو جان میں جان آئی۔ یہ مصیبت تھی کہ مجھے شام کو

محمد پور سے باہر نکلنے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہیئے تھا۔ وہ رات آرام سے گذر گئی۔ صبح یہ افواہ
عام تھی کہ نرائن گنج جیوٹ مل میں تمام غیر بنگالی ملازمین کے کنبوں کو ہلاک کر دیا گیا ہے۔
ایک آدمی وہاں سے کسی نہ کسی طرح اپنی جان بچا کر آیا تھا۔ اس نے جو بھیانک واقعے سنائے
تو اس سے لوگوں پر ایک ناقابلِ بیان دہشت طاری ہو گئی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم دھان منڈی کی طرف نکل گئے۔ میں شیخ مجیب کی کوٹھی
دیکھنا چاہتا تھا۔ زلفی گاڑی چلا رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ دھان منڈی کا علاقہ
بالکل ہمارے یہاں سمن آباد کی طرح کا ہے۔ بالکل اسی قسم کی کوٹھیاں دونوں طرف بنی ہوئی
ہیں۔ زلفی نے اشارہ کر کے بتایا کہ وہ سامنے شیخ مجیب کی کوٹھی ہے۔ کوٹھی کا پھاٹک اور
برآمدے کے ستون زنگ کے تھے۔ آدھا پھاٹک کھلا تھا۔ لان کے گھاس پر بنگالیوں کی
ٹولیاں بیٹھی آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ گیٹ پر مکتی باہنی کے آدمی سٹین گنیں ہاتھ میں لئے
پہرہ دے رہے تھے۔ کوٹھی کی دوسری منزل کی گیلری ویران ویران سی تھی۔ وہاں کوئی
انسان یا بچہ تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ سامنے والی کوٹھی کے لان میں الگنی پر بچوں کے کپڑے
سکھانے کے لئے ڈالے ہوئے تھے۔ جب مجھے پتا چلا کہ شیخ مجیب کی کوٹھی کو راکٹ مار کر تباہ
کر دیا گیا ہے تو میرے ذہن میں بے اختیار سامنے والی کوٹھی کا خیال آ گیا تھا جس کے لان
کی الگنی پر بچوں کے کپڑے سکھانے کے لئے ڈالے گئے تھے۔

زلفی نے یہاں گاڑی کی رفتار مدھم کر لی تھی۔ ہم کوٹھی سے آگے نکل گئے۔ اور پ
ہو کر پھر واپس اپنے گھر کے سامنے آ گئے۔ اب ہم بڑی شدت سے پی۔ آئی۔ اے کے جہ
پر اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ ہم روز صبح جا کر ائیرپورٹ پر پتا کرتے۔ آخر ایک
روز زلفی اور فیضی کی باری آ گئی۔ میرے پرمٹ کا نمبر ابھی چار روز بعد آنے والا تھا۔
دونوں واپس جانے پر تیار نہیں تھے۔ لیکن میں نے انہیں مجبور کر کے جہاز پر سوار کرا دیا
ائیرپورٹ بالکل کسی بس سٹاپ کا منظر پیش کر رہی تھی۔ لاؤنج جو کبھی گرمیوں میں ٹھنڈا
کرتا تھا اب گرم تھا۔ لوگوں کا ہجوم اکٹھا تھا۔ یہ تو ایک طرح سے مہاجرین کیمپ بنا ہ
تھا۔ جن کی باری ہفتے بعد آنے والی تھی وہ بھی وہاں بستر بچھائے تھوڑا بہت سا

رکھے بال بچوں کے ساتھ پڑے تھے۔ زلفی اور فیضی جہاز پر سوار ہو گئے اور جہاز انہیں لے
کر کراچی کی طرف پرواز کر گیا۔ میں اکیلا واپس محمد پور چلا گیا۔

دوسرے روز آدھی رات کو ایک دھماکہ ہوا اور پھر مسلسل سٹین گنیں چلنے کی آوازیں
سنائی دینے لگیں۔ محمد پور کے لوگ جاگ پڑے۔ یہ دھماکے بموں کے دھماکوں سے مختلف تھے
تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ فوج ایکشن میں آ گئی ہے۔ محب وطن بنگالی اور غیر بنگالی گھروں سے
باہر نکل آئے اور پاکستان زندہ باد، پاک فوج زندہ باد، قائداعظم زندہ باد کے نعرے لگانے
لگے۔ صبح ہونے تک شہر کی ساری عمارتوں سے سیاہ جھنڈے اتار دیئے گئے تھے اور وہاں
پاکستان کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ شہر کی سڑکوں پر پاک فوج کی جیپیں اور جوان گشت کر کے
امن و امان بحال کر رہے تھے۔ محب وطن عوام نے فوج کے اس ایکشن سے سکھ کا سانس لیا
تھا۔ بھارت کے بھیجے ہوئے ہندو کمانڈر اور مکتی باہنی کے ایجنٹ بھارت کی سرحد عبور
کر کے بھاگ گئے۔ شام تک سارے شہر میں امن و امان قائم ہو گیا۔ دکانیں کھل گئیں۔ کاروبار
پھر سے شروع ہو گیا۔ دفتر اور بینک کھل گئے۔

میں رکشے میں بیٹھ کر چھاؤنی گیا۔ میرا عزیز گھر پر نہیں تھا۔ میں نے وہاں ان کے بال
بچوں کے ساتھ کچھ وقت گذارا اور پھر شہر کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے نکل گیا۔ سارا
شہر جیسے سکھ کا سانس لے رہا تھا۔ محمد پور اور میر پور کے محب وطن لوگ آپس میں مٹھائی تقسیم
کر رہے تھے۔ سارے مشرقی پاکستان میں امن بحال ہو گیا تھا۔ اب میں نے سوچا کہ واپس
لاہور جانا چاہیئے کیونکہ ائیرپورٹ پر مہاجرین کی تعداد ایک دم سے بے حد کم ہو گئی تھی لوگ
واپس اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ میں ایک روز جہاز میں سوار ہوا اور واپس لاہور آ
گیا۔ ڈھاکے میں امن کی حالت کی بحالی کے بعد کاروبار بھی بے حد تیز ہو گیا تھا۔ زلفی اور
فیضی بھی واپس ڈھاکہ چلے گئے۔

لیکن دو مہینے بعد شر پسند عناصر نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ عام معافی مل جانے کے
بعد بھارتی حکومت نے اپنے بے شمار ماہر ہندو بنگالی کمانڈو مہاجرین کی صورت میں مشرقی
پاکستان میں دھکیل دیئے تھے۔ ان لوگوں نے مشرقی پاکستان میں آتے ہی وہاں کے مسلمانوں

میں فوج اور پاکستان کے خلاف زبردست پراپیگنڈا شروع کر دیا تھا۔ شیخ مجیب کی گرفتاری کے بعد غیر پاکستانی شرپسند عناصر زیر زمین چلے گئے تھے یا بھارت بھاگ گئے تھے۔ وہاں سے وہ نئے احکام لے کر بنگالی مہاجرین کی شکل میں واپس مشرقی پاکستان میں داخل ہو رہے تھے۔ بھارت نے زبردست پراپیگنڈا شروع کر دیا تھا۔ جگہ جگہ تخریبی کارروائیاں شروع ہو چکی تھیں۔

ان ہی دنوں ایک ضروری کام کے سلسلے میں، میں ایک بار پھر لاہور سے جہاز پر سوار ہو کر ڈھاکہ پہنچ گیا۔ ڈھاکہ ایئرپورٹ پھر سے اپنی اصلی حالت پر آ گیا تھا۔ محمد پور جانے سے بجائے میں اپنے عزیز کے ہاں چھاؤنی آ گیا۔ دوسرے روز محمد پور گیا۔ زُلفی اور فیضی پوری گرم جوشی سے پھر سے کاروبار میں لگے تھے۔ انہیں سر کھجلانے کی فرصت نہیں تھی۔ حالات معمول پر آ گئے تھے۔ اگرچہ کہیں کہیں شرپسند تخریبی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا کیوں نہ چٹاگانگ چل کر سجاتا سے ملاقات کی جائے۔

چنانچہ میں ایک روز ریل میں سوار ہوا اور چٹاگانگ کی طرف چل پڑا۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ سُجاتا وہاں نہیں ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ مشرقی پاکستان چھوڑ کر کلکتے جا چکی ہے۔

ان کی کوٹھی میں ایک مسلمان خاندان آباد تھا۔ یہ کوٹھی وہ فروخت کر گئے تھے۔ کوٹھی کے لان میں پھول کھلے تھے۔ بانس اور کیلے کے درخت اسی طرح کوٹھی کی چھت پر سایہ کئے ہوئے تھے۔ اس کوٹھی میں اب ایک کاغذ کا سوداگر رہتا تھا۔

میں واپس اپنے ہوٹل میں آ گیا۔ ہوٹل میں رات بسر کرنے کے بعد دوسرے روز ناشتا کر کے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا کہ ایک بہاری مسلمان سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے مجھ سے ماچس مانگی۔ میں نے ماچس دی۔ اس نے سگریٹ سلگا کر شکریہ ادا کیا تو میں نے یونہی وقت گذارنے کے لئے اس سے باتیں شروع کر دیں۔ اس کا نام عثمان تھا۔ وہ پٹ سن کے ایک کارخانے میں منشی تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھ گیا اور پاک فوج کی تعریف کرنے لگا جس کی مدد سے ملک میں امن قائم ہوا تھا اور بھارتی ایجنٹ بھاگ گئے تھے۔ اس وقت جو تخریبی سرگرمیاں ہو رہی تھیں ان کے

بارے میں بھی بہت فکرمند تھا۔ لیکن اُسے یقین تھا کہ فوج بہت جلد ان حالات کو بھی قابو میں کر لے گی۔

اگلے روز پھر منشی عثمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ اس کا گھر شہر سے باہر ایک سڑک سے ذرا ہٹ کر سپاری کے درختوں میں تھا۔ چھوٹا سا کوارٹر تھا۔ یہاں وہ اپنے دو بچوں اور بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ بیوی ابھی جوان تھی۔ بچے چھوٹے چھوٹے تھے اور بڑے پیارے تھے۔ بیوی نے ہمارے لئے جلدی سے چائے بنا ڈالی۔ ہم چائے پر دنیا جہان کی باتیں کرنے لگے۔ دوسرے روز میں پھر عثمان کے گھر چلا گیا۔ میں اپنے ساتھ بچوں اور بھابی کے لئے کچھ پھل اور دو چار ساڑھیاں بھی لیتا گیا۔ عثمان کے بچوں سے مجھے پیار سا ہو گیا۔ بڑے معصوم اور بھولے بھالے بچے تھے۔ اس کی دُبلی پتلی سانولی سی کم گو بیوی بڑی نیک اور وفا شعار عورت تھی۔ میں اس کا بڑا احترام کرتا تھا۔ یہ چھوٹی سی فیملی بڑے سکون اور امن سے زندگی بسر کر رہی تھی۔ ان کے کوارٹر کے صحن پر مولسری کے درخت کی گھنی چھاؤں تھی۔

شام کو ان کے صحن میں بید کی پُرانی سی کُرسیاں بچھا کر ہم دونوں بیٹھ جاتے۔ عثمان کی بیوی چائے بنا کر لاتی۔ معمولی قسم کے پیالوں میں ہم چائے ڈال کر پیتے اور میں انہیں لاہور کی باتیں سناتا۔ عثمان نواکھلی کے خون ریز ہندو مسلم فسادات کے دنوں میں ہجرت کر کے مشرقی پاکستان میں آباد ہو گیا تھا۔ اس کے ماں باپ انتقال کر چکے تھے۔ ایک بھائی ولایت میں تھا ایک بہن کوئٹہ میں اپنے خاوند اور بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔ عثمان کا کنبہ یہاں اکیلے ہی پُرسکون اور سادہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ دونوں میاں بیوی میں بڑی محبت اور سلوک تھا۔ میں ایک مہینہ چٹاگانگ میں رہا اور تقریباً ہر روز شام کو ان کے ہاں جاتا رہا۔ میں نے کبھی ان کے درمیان ہلکی سی رنجش ہوتے بھی نہیں دیکھی تھی۔

ایک مہینہ چٹاگانگ میں بسر کرنے کے بعد میں نرائن گنج آ گیا اور اپنے کاروبار میں مصروف ہو گیا۔ میں نے فوج میں کھانے پینے کی چیزیں سپلائی کرنے کا ٹھیکہ لے لیا تھا۔ میں کراچی سے دالیں اور گھی وغیرہ منگوا کر سپلائی کرتا تھا۔ وقت گذرتا چلا گیا۔ کبھی ڈھاکے، کبھی فرید پور

کبھی نرائن گنج اور کبھی ڈھاکے آجاتا۔ چٹاگانگ جب بھی جانا ہوتا عثمان کے کہنے سے روز ہی ملاقات ہوتی۔ اب حالات خراب سے خراب تر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ تخریب کاروں کی سرگرمیاں تیز ہو گئی تھیں۔ بھارت کے کمانڈوز نے سرحدوں کے اندر گھس کر ہر طرف افراتفری پھیلا دی تھی۔ بھارت کے ہندو بھی مہاجرین بن کر آگئے تھے اور وہاں کے مقامی باشندوں میں زہر گھول رہے تھے۔ شیخ مجیب الرحمٰن رہا ہو کر واپس آگیا تھا اور اس نے اپنی تقریروں سے ہر طرف نفرت کی آگ پھیلا دی تھی۔ اس نے بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرا دیا تھا

زلفی اور فریحی سے ڈھاکے میں ایک بار ملاقات ہوئی۔ ہم نے سوچا کہ واپس لاہور چلے جانا چاہیئے۔ لیکن کاروبار چھوڑ کر جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ پھر یہ خیال تھا کہ حالات جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ میں نرائن گنج گیا ہوا تھا کہ پتا چلا مغربی پاکستان کی سرحد پر بھارت نے حملہ کر دیا ہے اور وہاں جنگ شروع ہو گئی ہے۔ اس خبر نے ہر طرف بے چینی کی ایک لہر دوڑا دی۔ رات کو بلیک آؤٹ ہونے لگا۔ فوج مشرقی پاکستان میں بھی ہوشیار ہو گئی۔۔۔۔۔
تخریب کاروں کی کارروائیاں تیز ہو گئیں۔ فوج بکھر کر ملک کے گوشے گوشے میں تخریب کاروں اور بھارت کے گھس بیٹھے گوریلوں کے خلاف نبرد آزما تھی۔ میں نے کومیلا سے زلفی کو تار دیا کہ لاہور جانے کے لئے تیار رہو۔ میں آرہا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ مجھے کولمبو کے راستے واپس چلے جانا چاہیئے۔ کیونکہ مجھے لاہور میں اپنے خاندان والوں کا بھی فکر تھا۔ پی۔ آئی۔ اے کی سروس ابھی جاری تھی۔ میں کومیلا سے ایک ضروری پے منٹ لینے کے لئے چٹاگانگ پہنچا ہی تھا کہ معلوم ہوا بھارت نے مشرقی پاکستان پر بھی حملہ کر دیا ہے۔

اسی روز چٹاگانگ پر بھارت کے بمباروں نے بندرگاہ پر حملہ کر دیا۔ ہماری ایئر فورس نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور بھارت کے جہاز مار گرائے۔ اس کے ساتھ ہی ہوائی سروس بند ہو گئی۔ میں چٹاگانگ والے ہوٹل میں آکر ٹھہر گیا۔ رات کو عثمان کے گھر گیا تو وہ لوگ کچھ پریشان تھے۔ پھر بھی انہیں یقین تھا کہ ہماری بہادر فوج بھارت کے حملے کا دندان شکن جواب دے گی۔ لیکن اس کے ساتھ بھارت کے فوجی معاہدے نے حالات کو یکسر تبدیل کر دیا تھا۔ دوسرے مشرقی پاکستان میں صرف ڈھاکے کا ہی ایک ہوائی اڈہ تھا۔ جو جنگ میں آسانی

سے استعمال ہو سکتا ہے۔

بھارتی ہوابازوں نے پے در پے بمباری کر کے، اپنے جہازوں کا نقصان اٹھا کر بھی اس اڈے کو تباہ کر دیا۔ اب ہماری ایئر فورس مفلوج ہو کر رہ گئی۔ ہوائی اڈہ تباہ ہو جانے سے ہمارا جہاز نہیں اڑ سکتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فضاؤں پر بھارتی بمبار اور لڑاکا طیاروں کی حکومت ہو گئی۔ دشمن کے جہاز دن میں کئی بار آکر ڈھاکا اور چٹاگانگ پر بمباری کرنے لگے۔ دوسری طرف بھارت نے اپنی آدھی فوج مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر جھونک دی۔ اندر تخریب کاروں نے تباہی مچا رکھی تھی۔ ہماری فوج کو آگے اور پیچھے دونوں طرف مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا۔ پھر بھی ہمارے بہادر جیالے ایک ایک انچ زمین کے لئے دشمن کے ہزاروں سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار رہے تھے۔ ہلّی کے مقام پر جو تاریخی معرکہ ہمارے بہادر جوانوں نے لڑا اس کی تعریف دشمن کے جرنیلوں اور غیر ملکی ماہرین نے بھی کی۔

حالات اب بہت خراب ہو گئے تھے۔ میں چٹاگانگ میں بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ ریل کی سروس بے حد خطرناک ہو چکی تھی۔ راستے میں ریل کو بموں سے اڑایا جا رہا تھا۔ اور پھر وہ منحوس دن طلوع ہو گیا۔

میں چٹاگانگ شہر سے باہر سڑک پر سے گزر رہا تھا کہ میں نے پاک فوج کی ایک جیپ کو کھڑے ہوتے دیکھا۔ اس میں سے دو سپاہی چھلانگ لگا کر اترے اور سڑک کے کنارے کھڑے ایک درخت کے نیچے کچھ پھینک کر پھر جیپ میں سوار ہو کر آگے روانہ ہو گئے۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ وہاں کٹے پھٹے پرزہ پرزہ کاغذوں کا چھوٹا سا ڈھیر پڑا تھا۔ میں نے ایک پرزے کو اٹھا کر پڑھنے کی کوشش کی۔ مگر وہ اتنا چھوٹا تھا کہ کوئی بھی لفظ اٹھایا نہ گیا۔ میں شہر کی طرف آگیا۔ شہر میں فوج کا ایک ٹرک پھاٹک کے پاس کھڑا تھا۔ اس میں کچھ فوجی بڑے خاموش بیٹھے تھے۔ اتنے میں آسمان پر دشمن کا ایک ہیلی کاپٹر نمودار ہوا۔ جو شہر کے اوپر چکر لگا کر رانگاماتی کے جنگل کی طرف چلا گیا۔ پھر ایک بمبار جہاز غوطہ لگا کر نکل گیا۔

ٹرک میں بیٹھے فوجی خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ریل گاڑی گزر گئی۔ تو پھاٹک بھی کھل گیا۔ ٹرک چلا گیا۔ میں عثمان کے کوارٹر کی طرف آگیا۔ ایک دکان پر کچھ بنگالی

پاکستان کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ یہ مکتی باہنی کے ہندو تھے۔ کچھ مسلمان بنگالی بوڑھے انہیں حقارت سے دیکھتے ہوئے گذر گئے۔ ایک بنگالی کو میں نے روتے دیکھا۔ وہ سسکیاں بھرتا ہوا کہہ رہا تھا:

"ہندو اپنی سازش میں کامیاب ہو گیا۔ ہماری فوج کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ ہماری فوج کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔"

مجھ پر گویا بجلی گری۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں وہاں سے سیدھا عثمان کے گھر آ گیا۔ عثمان مکان کے باہر کھڑا تھا۔ وہ بھی پریشان تھا۔ میں نے کہا عثمان بھائی! تم نے کچھ سنا ہے؟"

عثمان کی آنکھیں اداس اور ویران ویران تھیں۔ کہنے لگا۔

"اندر آ جاؤ۔"

ہم اندر کمرے میں آ کر تخت پوش پر بیٹھ گئے۔ اس کی بیوی بھی پریشان تھی۔ اس نے بتایا کہ یہ خبر شہر میں عام ہے کہ فوج نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور بھارتی فوج ڈھاکہ میں داخل ہو گئی ہے۔ میں حیرت زدہ ہو کر رہ گیا تھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے عثمان! یہ ہماری جیالی فوج کی شاندار روایات کے خلاف ہے۔"

عثمان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"جو تقدیر میں لکھا تھا وہ ہو گیا ہے بھائی! ہماری بہادر فوج کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگا دیا گیا۔ چٹاگانگ کی بندرگاہ پر بھارتی جہاز آ رہے ہیں۔"

عثمان کی بیوی نے پریشان ہو کر کہا:

"اب کیا ہو گا بھائی جان! ہم کہاں جائیں گے؟ ہمارا کیا بنے گا؟ ہمارے بچوں کا کیا بنے گا؟ مکتی باہنی تو ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گی۔"

میں نے کہا "ہمیں گھبرانا نہیں چاہیئے بھابی۔ اگر یہ بھیانک حادثہ گذر چکا ہے تو پھر ہم یہاں سے نکل چلیں گے۔"

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ شہر کے اوپر بھارتی فوج کے کئی ہیلی کوپٹر پرواز کرتے گذر گئے۔ باہر چوک کی طرف سے لوگوں کے نعرے اور چیخوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ بھارتی فوج کے حق میں اور پاکستان کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر مکان کی عقبی کھڑکی کا پٹ کھول کر دیکھا۔ دور کھیت سے پرے سڑک پر ہندو بنگالی نوجوانوں کا ایک چھوٹا سا ہجوم لاٹھیاں لہرا لہرا کر نعرے لگا رہا تھا اور شاید ایک دکاندار کے سامان کو توڑ پھوڑ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی۔ عثمان کے بچے اور بیوی سہمے بیٹھے تھے میں نے عثمان سے کہا:

"عثمان بھائی! آپ لوگوں کا یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ مکتی باہنی کے یہاں پہنچ جائیں گے وہ غیر بنگالیوں کو اب کھلم کھلا قتل کریں گے اور ان کے مکانوں دکانوں کو آگ لگائیں گے۔"

عثمان کی بیوی رونے لگی۔ میں نے کہا:

"بھابی، خدا پر بھروسہ رکھو! اللہ ہمارا نگہبان ہو گا۔ اگر ہماری زندگی ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت ہمیں نقصان نہ پہنچا سکے گی۔"

عثمان نے کہا۔ "مگر ہم اب کر بھی کیا سکتے ہیں؟ ہم یہاں سے اٹھ کر کہاں جائیں گے؟ کہاں جا کر پناہ لیں گے؟ ہمارا تو یہاں کوئی بھی رشتے دار نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "تم لوگ یہاں سے اٹھ کر گول پاڑہ میں میرے ایک بنگالی محب وطن دوست کے ہاں چلے چلو۔"

عثمان بولا۔ "کیا ہم اس پر بھروسہ کر سکتے ہیں؟"

"ہاں! ضرور! وہ ایک بوڑھا محب وطن بنگالی ہے اس نے مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے لئے اپنے ایک بچے کی قربانی دی ہے۔ وہ ایک سچا مسلمان اور پاکستانی بنگالی ہے میں اس سے بات کر چکا ہوں۔ تم لوگ ابھی اسی وقت میرے ساتھ ناگ پاڑہ چلو گے۔ میں کسی سواری کا بندوبست کرتا ہوں ضروری سامان ساتھ لے چلنا۔ باقی سب کچھ اسی جگہ پڑا رہنے دو۔"

میں وہاں سے سیدھا ناگ پاڑہ چل دیا۔ یہ بستی عثمان کے گھر سے شمال کی جانب اونچے
نیچے ٹیلوں کے درمیان میں ایک تالاب کے کنارے پر تھی۔ دس بارہ کوارٹر نما اک منزلہ
مکان تھے۔ ذرا پرے ہٹ کر مولسری کے درخت والا میرے محب وطن بنگالی دوست مومن
بھائی کا مکان تھا۔ یہ بھی اک منزلہ مکان تھا جس کا ایک صحن اور ساتھ ساتھ لگے تین کمرے
تھے۔ مومن بھائی اس مکان میں اکیلا رہتا تھا۔ اس کے گھر والے بحرین گئے ہوئے تھے۔
مجھے وہ اپنے مکان میں ہی مل گیا۔ وہ ریڈیو پر خبریں سن رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑا
ہوا اور مجھ سے لپٹ کر بولا:

"یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ ہماری فوج نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔
ہماری فوج کو مجبور کر دیا گیا ہے۔ بے بس کر دیا گیا ہے۔ اس فوج نے جرمن
جرنیل رومیل کے آگے ہتھیار نہ ڈالے۔ ہماری فوج کے دامن پر یہ کس نے
داغ لگا دیا ہے؟"

اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا:

"بہت بڑا انقلاب آگیا ہے۔ یہ سب کچھ ہندو کی سوچی سمجھی سازش
کے تحت ہوا ہے۔ ہم سب کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔ خیر جو خدا کو منظور ہوگا
وہی ہوگا۔"

میں نے اُسے بتایا کہ میں اپنے دوست عثمان بھائی اور اس کی فیملی کو
وہاں لا رہا ہوں۔ اس نے کچھ سوچ کر کہا:

"یہ ایک کھُلا گھر ہے۔ ہم تم اگر شہید کر بھی دیئے گئے تو کوئی بات نہیں۔
پاکستان کے لئے میں اپنے ایک بچے کی قربانی دے چکا ہوں۔ اب اگر میں بھی شہید
ہو گیا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لیکن بچوں کا قتل عام نہیں ہونا چاہیئے۔ عثمان بھائی
کے بچوں کو کسی دوسری جگہ چھپانا ہوگا۔"

میں نے کہا "مومن بھائی! ایسی جگہ تو مجھے کہیں بھی نظر نہیں آتی۔"
اس نے کہا۔ "رانگا ماتی میں وہ حالات کے معمول پر آنے تک محفوظ

رہ سکتے تھے۔ لیکن رانگا ماتی یہاں سے بہت دور ہے اور راستہ خطرناک ہے
بہتر یہ ہوگا کہ میں عثمان بھائی کے بیوی بچوں کو یہاں سے چھ سات میل دور اپنے
ایک دوست کے گاؤں میں چھپا دوں۔ اگر تم بھی چاہو تو وہاں پناہ لے سکتے
ہو۔"

"نہیں مومن بھائی! میں اسی گھر میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔"

ٹھیک ہے۔ پھر جلدی سے ان لوگوں کو لے آؤ۔ یہاں تھوڑی ہی دیر
میں مکتی باہنی کی اور بھارت کی ہندو فوج آجائے گی ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا
چاہیئے۔

میں مومن بھائی کو ناگ پاڑہ اس کے گھر چھوڑ کر واپس عثمان کے گھر آیا۔ ان کے بال بچوں
کو ساتھ لیا اور مومن بھائی کے گھر لے آیا۔ مومن ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے کہیں سے
ایک بیل گاڑی کا بندوبست کر لیا تھا۔ جلدی جلدی بچوں کو بیل گاڑی میں سوار کرایا اور
ہم ان کو لے کر چٹا گانگ سے رانگا ماتی کی طرف روانہ ہو گئے۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد
ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں مومن بھائی کے دوست کا گھر تھا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ اس کا گھر
خالی پڑا تھا۔ عثمان کے بیوی بچوں کو اس مکان میں چھپا دیا گیا۔ عثمان کو تاکید کی کہ وہ وہاں
سے ہرگز ہرگز باہر نہ نکلے۔ یہ مکان کیلے کے درختوں کے جھنڈ میں چھپا ہوا تھا۔ پاس ہی بنگالی
مچھیرے رہتے تھے۔ وہ مومن بھائی کی بڑی عزت کرتے تھے۔ مومن بھائی نے انہیں تاکید کر دی
کہ عثمان کے کنبے کی ہر قیمت پر حفاظت کی جائے۔ انہیں وہاں چھوڑ کر ہم واپس ناگ پاڑہ
آگئے۔

واپس آکر ہمیں احساس ہوا کہ ہم نے سخت غلطی کی جو واپس آگئے۔ ہمیں بھی اس مکان
میں چھپ جانا چاہیئے تھا۔ کیونکہ ابھی ہم مکان کے اندر جا کر بیٹھے ہی تھے کہ چوک میں دو ٹرک
آکر کھڑے ہو گئے۔ لوگوں نے مکتی باہنی زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ ٹرکوں
میں سے مکتی باہنی کے فوجی چھلانگیں لگا کر باہر کودے اور لوگوں نے انہیں گھیرے میں لے
لیا۔ کوئی سگریٹ پیش کر رہا ہے تو کوئی انہیں سوڈا واٹر پیش کر رہا ہے۔ مکتی باہنی والے ان

سے پوچھنے لگے کہ یہاں پاکستان کا حمائتی کون کون ہے اور کہاں کہاں ہے ؟

لوگوں نے انہیں بستی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ ہندو بنگالی فوج ایک مکان کے اندر گھس گئے اور وہاں سے کچھ لوگوں کو گھسیٹ کر باہر چوک میں لے آئے۔ ہم کھڑکی کا پٹ ذرا سا کھول کر یہ سارا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ مکتی باہنی والوں نے ہمارے دیکھتے دیکھتے چار آدمیوں کو سنگینیں مار مار کر زمین پر گرا لیا اور پھر ان پر گولیاں برسا دیں۔ زخمی تڑپ تڑپ کر شہید ہو گئے۔ یہ وہ بنگالی تھے جو پاکستان سے محبّت کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ ایک دکاندار کے اندر سے دو بہاریوں اور دو پنجابیوں کو گھسیٹ کر باہر لے آئے۔ اُنہوں نے انہیں چوک میں زمین پر دو زانو بٹھا دیا۔ پھر ایک ایک مکتی باہنی کا فوجی ان کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ لوگ نعرے لگا رہے تھے۔ انہوں نے اپنی رائفلیں ہوا میں اُٹھائیں اور پوری طاقت سے سنگینیں اُن قیدیوں کی پُشت پر بھونک دیں۔

چاروں زمین پر اوندھے منہ گر پڑے۔ پھر اُن پر سنگینوں کی بارش ہونے لگی۔ ان لاشوں کو چوک میں تڑپتا چھوڑ کر مکتی باہنی ہندو سپاہی دوسرے شکار کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھرنے لگے۔ دوسرے لوگ ان کے ساتھ ساتھ تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔ مومن بھائی نے کھڑکی بند کر دی اور تشویش ناک لہجے میں کہا؛

"اب یہ لوگ میرے گھر میں آئیں گے۔ اس علاقے میں مَیں بھی محبِّ وطن مشہور ہوں۔ سب لوگوں کو معلوم ہے کہ میں پاکستان کا زبردست حامی ہوں اور سچا مسلمان ہوں۔"

میں بھی گھبرا گیا تھا۔ اب مجھے بھی احساس ہونے لگا تھا کہ میں نے یہاں آ کر سخت غلطی کی ہے۔ لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ جو ہونے والا تھا وہ ہو رہا تھا۔ اب تو ہر قیمت پر آخری حد تک اپنی جان بچانا فرض تھا۔ میں نے کہا:

"مومن بھائی! ہم یہاں سے کہاں جائیں گے؟ عثمان کے بال بچوں کا کیا ہو گا؟"

"میں انہیں بھی وہاں سے نکال کر کسی دوسری جگہ لے جاؤں گا۔ چلو

میرے ساتھ۔ اب یہاں کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ اس شہر پر موت کا رقص شروع ہو گیا ہے۔"

ہم دونوں مکان سے نکل کر چٹا گانگ سے رانگا ماتی جانے والی پتلی سی سڑک پر آ گئے۔ یہ سڑک درختوں کے سائے میں سے ہو کر رانگا ماتی کی طرف چلی گئی تھی۔ ابھی ہم مکان سے نکلے ہی تھے کہ ہم نے مکتی باہنی والوں کو مکان کی طرف آتے دیکھا۔ مومن بھائی نے کہا:

"جلدی سے میرے ساتھ بھاگو۔"

ہم مکان کے پچھواڑے سے بھاگ کر آ گئے۔ یہاں سُنبل کا ایک بہت بڑا اور گنجان درخت تھا۔ مومن نے اشارہ کیا کہ اس پر میرے ساتھ چڑھ چلو۔ ہم دونوں بڑی تیزی سے اس درخت پر چڑھ گئے۔ میں اس سے پہلے کبھی اتنی پھرتی سے درخت پر نہیں چڑھا تھا۔ لیکن چونکہ موت پیچھے لگی تھی شاید اس لئے ہم میں اتنی تیزی اور طاقت آ گئی تھی۔ ہم نے درخت کی گھنی شاخوں اور چوڑے پتوں میں اپنے آپ کو چھپا لیا۔ ہم خاموشی سے مکتی باہنی کے فوجیوں کو تکنے لگے جو مومن بھائی کے مکان کی طرف آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ لوگ نعرے لگاتے، بنگلہ دیش کا جھنڈا لہراتے چلے آ رہے تھے۔ مومن بھائی نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"یہ لوگ مجھے قتل کرنے آ رہے ہیں۔"

مکتی باہنی مومن بھائی کے مکان کے سامنے آ کر رُک گئی۔ دروازہ بند تھا۔ انہوں نے پاؤں کی ٹھوکر مار کر دروازہ چوپٹ کھول دیا اور شور مچاتے اندر گھس گئے۔ مگر اندر انہیں کوئی انسان نہ ملا۔ وہ سامان کو توڑنے پھوڑنے لگے۔ سارے گھر کا سامان توڑ کر ڈھیر کر دیا۔ بستر اور کپڑے لوٹ کر لے گئے۔ مکتی باہنی والے گولیاں چلا رہے تھے۔ رائفلوں اور سٹین گنوں کا منہ آسمان کی طرف کر کے بار بار فائر کر رہے تھے۔ باہر آ کر انہوں نے مکان کو آگ لگا دی۔ مومن بھائی کا مکان بانس کا بنا ہوا تھا۔ اس نے دیکھتے دیکھتے آگ پکڑ لی اور دھڑا دھڑ جلنے لگا۔ مومن بھائی نے میرے کان میں کہا۔

"مجھے اپنے مکان کی فکر نہیں۔ پریشانی اُن لاکھوں لوگوں میں بڑے انسانوں کی ہے جو پاکستان سے محبت کرتے ہیں۔ جنہوں نے پاک فوج کے

ساتھ مل کر دشمن کا مقابلہ کیا تھا۔ اُن کے ساتھ بھی دھوکہ ہُوا ہے۔ یہ لوگ ان
کو گن گن کر قتل کریں گے۔ یہ انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں جانتا ہوں
بھائی! بنگالی مسلمان کو ورغلایا گیا ہے۔ اُسے شیخ مجیب نے دھوکہ دیا ہے
وہ دھوکے میں آگیا ہے۔ یہ لوگ جو مکتی باہنی کے ساتھ نعرے لگا رہے ہیں اور
انہیں پھل مٹھائی پیش کر رہے ہیں یہ سارے ہندو ہیں۔ ان کی وفاداریاں
شروع ہی سے بھارت کے ساتھ تھیں۔ یا اللہ! تُو ہمیں اپنی پناہ میں رکھنا۔"

مومن بھائی کا مکان جل رہا تھا۔ دھواں ہمارے درخت تک بھی آ رہا تھا۔ ہمیں
تھا کہ ہمیں زیادہ دھواں لگنے سے کھانسی آگئی تو ہماری خیر نہیں ہے۔ لیکن خدا کا شکر رہا۔
کا رخ بدل گیا۔ اور دھواں دوسری سمت کو جانا شروع ہو گیا۔ مکان جل کر خاک سیاہ
گیا۔ مکتی باہنی والے وہاں سے چلے گئے تھے۔ ناگ پاڑہ کی بستی کے تقریباً آدھے سے زیادہ م
جلا دیئے گئے تھے۔ لوگوں کو گھروں سے گھسیٹ گھسیٹ کر قتل کیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ ہن
فوجی کر رہے تھے اور ہندو بنگالی خوشی سے تالیاں بجا رہے تھے۔

اب شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ مومن بھائی نے کہا کہ اب ہمیں نیچے اترنا چاہیئے۔ مَیں
تو درخت میں بیٹھے بیٹھے بُری طرح سے تھک گیا تھا۔ ہم دونوں درخت پر سے نیچے اُتر آ
وہاں سناٹا چھایا ہُوا تھا۔ فضا میں جلے ہوئے بانسوں کی بُو رچی ہوئی تھی۔ مومن نے میرا ہاتھ
اور مجھے ساتھ لے کر تالاب کے عقبی درختوں کے جھنڈوں میں گھُس گیا۔ یہاں سے ہم نے دوڑنا شر
کر دیا۔ ہم کافی دور نکل گئے۔ ہم تھک گئے تھے۔ مومن بھائی نے مجھے ایک جگہ پتھروں کے پا
بیٹھنے کو کہا۔ ہم گھاس پر لیٹ گئے۔ جب ہمارا سانس ٹھیک ہوا تو ہم نے ایک تالاب
جھک کر پانی پیا۔

مومن بھائی بولا۔ "میرے دوست! خُدا نے ہمیں موت کے منہ سے بچا لیا ہے۔
اب ہمیں چل کر عثمان کے خاندان اور بال بچوں کی خیریت معلوم کرنی چاہیئے۔ مجھے
ڈر ہے کہ کہیں انہیں کوئی نقصان نہ پہنچ چکا ہو۔"

میں نے کہا۔ "ہم سڑک پر سے ہو کر جائیں گے؟"

"نہیں۔" مومن بھائی نے کہا۔ "میں اس جنگل کے راستے کو جانتا ہوں۔ یہ ایک معمولی
سا جنگل ہے جس میں سوائے چھوٹے چھوٹے درختوں اور جھاڑیوں کے اور کچھ نہیں ہے۔ تم
میرے ساتھ ساتھ رہنا۔ ہم رات ہونے سے پہلے پہلے اپنے دوست کے گھر تک پہنچ جائیں گے۔"

ہم نے آگے چلنا شروع کر دیا۔ ہمیں دور گولیاں چلنے اور لوگوں کے چیخنے اور شور مچانے کی
آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ مکتی باہنی والے محب وطن لوگوں کو
قتل کر رہے تھے اور ہندو بنگالی خوشی سے نعرے لگا رہے ہیں۔ آسمان پر ستارے نکل آئے
تھے۔ کہیں چاند نہیں تھا۔ بڑی اندھیری رات تھی۔ جھاڑیوں میں جھینگر بولنے لگے تھے۔ دسمبر کا
موسم ہونے کی وجہ سے فضا میں گرمی اور حبس زیادہ نہیں تھا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اندر
ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں ہم نے عثمان اور اس کے بیوی بچوں کو چھپایا گیا تھا۔ مومن بھائی نے
کہا کہ ہمیں گاؤں کے دوسرے ماہی گیروں سے بھی نہیں ملنا چاہیئے۔ کسی کو نہیں بتانا چاہیئے کہ
ہم یہاں سے کوچ کر گئے ہیں۔ ہم رات کے اندھیرے میں ایک خفیہ جگہ سے گھر کے اندر داخل
ہو گئے۔ ہماری آوازیں سُن کر عثمان نے دروازہ کھول دیا۔ ہمارے چہرے دیکھ کر انہیں اندازہ
ہو گیا کہ حالات بہت خراب ہیں۔

اس نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ آپ لوگ پریشان کیوں نظر آ رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "اس وقت ہر محب وطن پاکستانی پریشان ہے۔ موت اس شہر میں
اتنی سستی ہو جائے گی مجھے اس بات کا کبھی یقین نہیں تھا۔

مومن بھائی نے اور میں نے اُسے بتایا کہ مومن کا مکان جلا دیا گیا۔ چوک چوک میں مکتی باہنی
کے ہندو سپاہی بے گناہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں۔ ہر طرف کہرام مچا ہے۔ وہ
پریشان ہو گیا۔ یہ سب باتیں ہم نے اُسے الگ لے جا کر بتائی تھیں۔ تاکہ اس کی بیوی اور
رونا نہ شروع کر دیں۔

○

عثمان نے مجھ سے پوچھا اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ اس ناگہانی آفت سے اپنے بال بچوں
کی جان کس طرح بچائیے؟ مومن بھائی نے اُسے بتایا کہ وہاں سے پچاس میل دور جنگل میں

ایک پرانا ریسٹ ہاؤس ہے جہاں وہ کبھی کٹائی کے دنوں میں جا کر رہا کرتا تھا۔ اگر ہم کسی طرح وہاں چلے جائیں تو حالات کے ٹھیک ہونے تک وہاں محفوظ رہ سکتے ہیں۔ آخر یہی طے پایا کہ ہم سب کو وہاں سے کوچ کر جانا چاہیئے۔ چنانچہ اسی وقت ہم نے عثمان کی بیوی بچوں کو ساتھ لیا اور اس تالاب والے گھر کو چھوڑ کر رانگامانی جانے والی سڑک کے ساتھ ساتھ آگے کو چل پڑے۔ ہم سڑک سے ہٹ کر درختوں اور جھاڑیوں میں سے ہو کر گذر رہے تھے عثمان نے ایک بچے کو اور ایک بچے کو میں نے کندھے پر اٹھا رکھا تھا۔ آدھی رات تک ہم چلتے چلے گئے۔ آخر تھک کر ایک جگہ ندی آگئی تو وہاں بیٹھ گئے۔ عثمان کی بیوی کے پاؤں زخمی ہو گئے تھے۔ مومن بھائی نے کھانے کو تھوڑے سے چاول ساتھ رکھ لئے تھے۔ یہاں بچوں کو اور عثمان کی بیوی کو تھوڑے تھوڑے چاول کھلائے گئے۔ طے یہ ہوا کہ رات کا باقی حصہ اسی جگہ بسر کیا جائے۔ صبح کو سفر شروع کیا جائے۔

عثمان کی بیوی بچے سو گئے۔ ہم وہاں بیٹھے آپس میں باتیں کرتے رہے۔ پچھلے پہر ہمیں بھی نیند آگئی۔ ہماری آنکھ اس وقت کھلی جب دھوپ خوب چمک رہی تھی۔ میں نے مومن بھائی کو جگایا۔ پھر ہم سب اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ ہم سب نے چاول کھائے، پانی پیا اور آگے چل پڑے۔ دو گھنٹے تک چلتے رہنے کے بعد عثمان کی بیوی تھکن سے گر پڑی اور سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ ہم رُک گئے۔ بچوں کو اٹھائے اٹھائے ہم بھی بے حد تھک گئے تھے۔ طے یہ پایا کہ اس طرح سے پچاس میل کا فاصلہ طے نہ ہو سکے گا۔ لہٰذا کہیں سے بیل گاڑی حاصل کی جائے

"یہاں سے دائیں جانب ایک کوس پر گاؤں ہے۔ اگر میں وہاں جا کر کوشش کوشش کروں تو شاید بیل گاڑی مل جائے۔ میرے پاس کچھ روپے ہیں۔"

چھ سات سو روپے میرے پاس بھی تھے۔ ہزاروں روپوں میں سے بس یہی چند ایک سو روپے میں بچا سکا تھا۔ میں نے کہا:

"مومن بھائی! آپ میرے روپے بھی اپنے روپوں میں شامل کر لیں اور بیل گاڑی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے بغیر بھابی اور بچے سفر نہ کر سکیں گے۔"

ہم اسی جگہ رک گئے اور مومن بھائی بیل گاڑی لینے ساتھ والے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں اور عثمان حالات کے ایک دم بدل جانے اور تباہی نازل ہونے کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ عثمان نے اپنی قمیص پھاڑ کر اپنی بیوی کے پاؤں کے زخموں میں باندھ دی تھی۔ کافی دیر بعد ہمیں دور سے جھاڑیوں میں ایک چھوٹی سی بیل گاڑی آتی دکھائی دی۔ اس کی چھت ٹوٹی ہوئی بانس کی تھی اور آگے ایک مریل سا گدھا نما بیل جتا تھا۔ ہم بڑے خوش ہوئے۔ مومن بھائی بیل گاڑی لے کر پہنچ گیا تھا۔ ہم نے جلدی جلدی بھابی، بچوں اور عثمان کو گاڑی میں بٹھایا اس کے بعد میں اور مومن بھی گاڑی میں بیٹھ گئے اور ہمارا سفر شروع ہو گیا۔

بیل گاڑی میں ہم بڑے آرام سے سفر کر رہے تھے۔ صرف کسی وقت تنگ جھاڑیوں میں سے گذرتے ہوئے وقت پیش آتی تھی۔ کھلی سڑک ہم نے اس لئے چھوڑ دی تھی کہ ڈر تھا اگر کوئی بھارتی یا مکتی باہنی کا کوئی فوجی ٹرک گذرے گا تو مصیبت پڑ جائے گی۔ شام تک ہم سڑک کے ساتھ ساتھ جھاڑیوں میں سفر کرتے رہے۔ شام کے بعد ہم سڑک پر آگئے۔ یہاں بیل گاڑی زیادہ تیزی سے چلنے لگی۔ ایک جگہ رک کر ہم نے تھوڑے بہت چاول نمک کے ساتھ کھائے۔ پانی پیا۔ بیل کو پانی پلایا اور پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ رات بھر بیل گاڑی چلتی رہی۔

پچھلے پہر ایک جگہ سے ہماری بیل گاڑی جنگل کو جاتی کچی پگڈنڈی کی جانب مڑ گئی۔ یہ پگڈنڈی جنگل میں سے ہو کر اس ریسٹ ہاؤس کی طرف چلی گئی تھی جہاں ہمیں پہنچنا تھا۔

ہم کئی درختوں، جھاڑیوں اور ٹیلوں کا چکر کاٹ کر ندی نالوں پر سے ہوتے ہوئے آخر اس ریسٹ ہاؤس میں پہنچ گئے۔ یہ ایک اُجاڑ سی ویران جگہ تھی۔ بانس کی کھپریل والا ایک ریسٹ ہاؤس تھا جس کے برآمدے میں ایک ٹوٹی ہوئی کرسی کونے میں اوندھے پڑی تھی یہاں کوئی نہیں تھا۔ اندر ایک کمرہ تھا جہاں دو لکڑی کے تخت رکھے تھے۔ ان پر بستر لگا دیئے گئے چولہا جلایا گیا اور ساتھ لائے ہوئے چاول اُبلنے رکھ دیئے گئے۔ یہ سارا کام عثمان کی بیوی نے کیا۔ ہم جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لے آئے۔ ریسٹ ہاؤس میں ہی پڑی ہوئی ایک کلہاڑی مل گئی تھی۔ مومن بھائی نے بتایا کہ یہ ریسٹ ہاؤس اب ویران ہو گیا ہے کیونکہ اس طرف سے گورنمنٹ نے جنگل کی کٹائی پر پابندی لگا دی تھی۔

سارا دن اسی جگہ گذر گیا۔ شام کو ہم نے تھوڑے بہت اُبلے ہوئے چاول کھائے۔ بغیر دودھ
کے چائے کی پتی اُبال کر پی۔ اب مچھروں نے حملہ کر دیا۔ یہ مچھر بڑے موٹے موٹے تھے۔ عقب میں
آگ جلا دی گئی۔ اس کے دھوئیں سے مچھر بھاگ گئے۔ ریسٹ ہاؤس میں بچے سو رہے تھے۔
اُن پر پرانی چادریں تان دی گئیں۔ آدھی رات تک میں، مومن بھائی اور عثمان آپس میں باتیں
کرتے رہے کہ ہم یہاں کب تک رہ سکیں گے؟ مومن نے کہا۔

"بھائی! میرا تو خیال ہے کہ اب ہمیں یہاں اس وقت تک رہنا ہوگا جب تک کہ حالات
پوری طرح ٹھیک نہیں ہو جاتے۔ بھارتی فوج واپس نہیں چلی جاتی۔"

عثمان نے کہا۔ "غدار مجیب نے یہ علاقہ بھارتی حکومت کے ہاتھوں بیچ دیا ہے۔ وہ
اب یہاں سے واپس نہیں جائیں گے۔"

مومن بھائی کہنے لگا۔ "میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ شیخ مجیب کا بھوت بہت جلد
لوگوں کے سروں سے اتر جائے گا۔ ان لوگوں کی اصل پاکستانی ہے۔ یہ لوگ بڑے سچے مسلمان
ہیں۔ سازش ہندو نے کی ہے اور ہندو بنگالی نے ہی مکتی باہنی نے مل کر ملک میں تباہی مچائی
ہے۔ حالات بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ ہم پھر واپس اپنے اپنے گھروں کو جائیں گے۔ لوگوں
کو بہت جلد احساس ہو جائے گا کہ انہیں بیوقوف بنایا گیا ہے۔ اُن کے ساتھ بڑا بھیانک
دھوکہ ہوا ہے۔"

عثمان نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "پھر پچھتانے سے کیا ہوگا مومن بھائی؟"

ہم نے تین دن اس جنگل کے ویران ریسٹ ہاؤس میں بڑے آرام سے گذارے۔ پھر ہمارا
راشن ختم ہو گیا۔ بچوں کے لئے سوائے چاول کے ہمارے پاس اور کچھ نہیں ہے دودھ پئے انہیں
ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ وہ کمزور اور زرد ہو گئے تھے۔ عثمان کی بیوی کو چوتھے روز ملیریا ہو گیا
اس روز کا بخار چڑھا کہ وہ نیم بے ہوش ہو گئی۔ ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہاں ہم اس
کا کوئی علاج نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں بھی مومن بھائی کا تجربہ کام آیا۔ وہ جنگل میں گیا اور ا
سے کسی درخت سے خاص قسم کے کڑوے پتے توڑ کر لایا۔ ان پتوں کو گرم پانی میں اُبالا گیا۔ ا
کا کڑوا رس نکال کر بھابی کو ایک چمچ پلایا گیا۔ ساری رات بخار سے بے چاری کا بدن پھ

رہا۔ صبح کہیں جا کر بخار ٹوٹا اور اس نے آنکھیں کھول کر اپنے خاوند کو دیکھا اور پھر بچوں کو
اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مومن بھائی نے اُسے تسلی دے کر کہا:

"بھابی! تمہیں اب ہمت سے کام لینا ہے۔ مصیبت صرف ہم پر ہی نازل نہیں ہوئی۔
سارے ملک پر یہ بجلی گری ہے۔ ایسی بھی مائیں ہیں جن کے سامنے اُن کے بچوں کو زندہ آگ
میں پھینک دیا ہے۔ تمہیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ تم اپنے خاوند اور بچوں کے ساتھ
زندہ سلامت ہو۔ خدا نے چاہا تو ہم اس مصیبت سے بھی ایک نہ ایک دن نکل جائیں گے
ہمارے ساتھ تمہیں بھی حوصلے سے کام لینا چاہیئے۔"

مومن کی باتوں کا بھابی پر خاطر خواہ اثر ہوا اور اس نے اپنے آنسو پونچھ دیئے۔ دوسرے
روز وہ صحت مند ہو گئی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ چاول اور دال وغیرہ کہاں سے لائی جائے
قریب ہی ایک تالاب تھا۔ عثمان اور میں نے بنسی بنائی اور وہاں مچھلیاں پکڑنے لگے۔ شام
تک بڑی مشکل سے دو چار مچھلیاں پکڑ سکے۔ اس تالاب میں مچھلیاں ہم کم تھیں۔ مومن نے کہا۔

"میں جنگل میں جا کر پھل توڑ کر لاتا ہوں۔ کچھ روز ہمیں اسی طرح گذارا
کرنا ہوگا۔ اس کے بعد گاؤں جا کر راشن لے آؤں گا۔ ابھی حالات ایسے نہیں
ہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی وہاں جانے کا خطرہ مول لے۔"

میں نے کہا۔ "میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا جنگل میں۔"

عثمان اپنے بچوں کے پاس رہا اور میں مومن بھائی کے ساتھ جنگل میں پھلدار درختوں
کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ تھوڑی ہی دور ہمیں کیلے کے درختوں کے جھنڈ مل گئے۔ ان
میں کیلے کے زرد زرد گچھے لٹک رہے تھے۔ ہم نے کلہاڑی مار کر گچھے توڑے اور ریسٹ
ہاؤس لا کر سب کو کھلائے۔ بچوں نے کیلے شوق سے کھائے۔ بچوں کے بھی کپڑے
پھٹ گئے تھے۔ بھابی نے اپنی ایک نئی ساڑھی پھاڑ کر بچوں کے لئے دھوتیاں
بنا کر انہیں باندھ دیں۔ ہم نے تالاب پر اپنے میلے کپڑے دھو کر سکھائے اور
پہنے۔ پاس ہی اناناس کے درخت بھی مل گئے۔ جنہیں کاٹ کر ہم لے آئے۔ سب
نے شوق سے انہیں کھایا۔ یہ جنگلی اناناس تھے اور ترش تھے۔

کو نکل پڑا۔ اس روز آسمان پر صبح ہی سے بادل چھائے ہوئے تھے۔ بوندا باندی ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ مشرقی پاکستان میں ابھی بارشوں کا موسم نہیں آیا تھا۔ پھر بھی اس روز آسمان ہلکے سرمئی رنگ کے بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ میری تقدیر میں ابھی زندگی کے کچھ دن اور لکھے تھے کہ مقدر نے مجھے جنگل کی طرف بھیج دیا۔ میرے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ جب واپس آؤں گا تو میں دشمنوں کے درمیان بالکل اکیلا رہ گیا ہوں گا۔

میں کچھ دیر جنگل میں پھل توڑتا رہا۔ میں نے کیلوں کے دو بڑے گچھے توڑ کر کندھے پر ڈالے اناناس ابھی کچے تھے اور واپس ریسٹ ہاؤس کی طرف چل پڑا۔ ابھی میں دور ہی تھا کہ مجھے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ میں چوکنا ہو کر وہیں جھک گیا اور آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے جھاڑیوں جھاڑیوں ہو کر ایک جگہ پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ ریسٹ ہاؤس کے باہر مکتی باہنی کے چند فوجی بھاگ رہے ہیں۔ ایک فوجی کے ہاتھ میں کٹا ہوا سر لٹکتا دیکھ کر میرے جسم میں دہشت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس سر کو بالوں سے پکڑ کر لٹکائے رکھا تھا۔ میں اسی جگہ ایک دم دبک کر چھپ گیا۔ دوپہر تک میں ان جھاڑیوں کے اندر ہی دبکا بیٹھا رہا۔

کافی دیر بعد جب ہر طرف گہرا سناٹا طاری ہو گیا تو میں جھاڑیوں میں سے نکل کر ریسٹ ہاؤس کی طرف بڑھا۔ دبے پاؤں قدم اٹھاتے ہوئے میں عقب سے ہو کر ریسٹ ہاؤس پہنچا تو وہاں کا بھیانک نقشہ دیکھ کر میں کانپ اٹھا۔ یہ ایک دل ہلا دینے والا منظر تھا۔ بھابی اور اس کے دونوں معصوم بچوں کی لاشیں جن کے سینے سنگینوں سے چھلنی کر دیئے گئے تھے برآمدے میں پڑی تھیں۔ عثمان بھائی کی لاش باہر درخت کے نیچے پڑی تھی اور مومن بھائی کا سر کٹا دھڑ ریسٹ ہاؤس کے اندر فرش پر پڑا تھا۔ یہ کام کسی مخبر نے کیا تھا۔ اس نے مکتی باہنی والوں کو خبر کر دی تھی کہ مومن بھائی جنگل کے ریسٹ ہاؤس میں چھپا ہوا ہے۔ دشمن اس کی تلاش میں چٹاگانگ سے پیچھے لگا تھا۔ آخر اس نے اُسے پکڑ لیا۔ مکتی باہنی کے ہندو سپاہی مومن بھائی کا سر کاٹ کر ساتھ لے گئے تھے۔ یہ دل ہلا دینے والا منظر تھا۔ میری آنکھوں میں بے گناہ بچوں اور ان کی ماں کی لاشیں دیکھ کر آنسو آ گئے۔ عثمان بے چارہ بھی شہید ہو گیا تھا۔ کاش! یہ لوگ یہاں نہ آتے۔ لیکن اس سے کیا ہوتا تھا؟ چٹاگانگ میں بھی انہیں

زندہ نہ چھوڑا جاتا۔ میں ایک دم سے لاشوں پر سے توجہ ہٹا کر محتاط ہو گیا۔ یہ لوگ تو شہید ہو گئے تھے۔ اب مجھے اپنی زندگی کی حفاظت کرنی تھی۔ اور اپنے آپ کو مکتی باہنی کے غنڈوں سے بچانا تھا۔ اگرچہ میری کسی سے دشمنی نہیں تھی اور میں ڈھاکے کی مشہور شخصیت بھی نہیں تھا۔ پھر بھی میرا پنجابی ہونا اور ایک وقت میں پاک فوج کو آٹا دال سپلائی کرنا ہی ایک ایسا جرم تھا جسے کبھی نہیں معاف کیا جا سکتا تھا۔ سب سے پہلے تو میں نے ایک جگہ آڑ میں چھپ کر یہ اندازہ لگایا کہ وہاں کوئی مکتی باہنی تو چھپا ہوا نہیں ہے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ لوگ ظلم ڈھا کر چلے گئے ہیں تو میں آڑ میں نکلا۔ کلہاڑی لے کر ایک جگہ زمین کھودنی شروع کر دی۔ شام تک بڑی سخت مشقت کر کے میں بمشکل پانچ گڑھے کھودنے میں کامیاب ہو سکا۔ میں نے باری باری ہر ایک گڑھے میں لاشوں کو دفن کر دیا۔ ان کی ارواح کے لئے دعائے فاتحہ پڑھی اور ریسٹ ہاؤس میں آ کر بیٹھ گیا۔

میں بے حد تھک گیا تھا۔ کچھ کیلے کھائے۔ پانی پیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ میرے لئے یہ ایک بہت بڑا امتحان اور کھلا چیلنج تھا کہ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں اور کب تک ان خطرناک جنگلوں میں جان بچائے پھرتا رہوں۔ یہ تو خیر اتنے خطرناک جنگل نہیں تھے۔ جنگل تو اس سے آگے شروع ہو رہے تھے جہاں شیر، چیتے، اژدہا اور ہاتھی رہتے تھے۔ ظاہر ہے میں واپس چٹاگانگ نہیں جا سکتا تھا۔ ڈھاکے بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ان شہروں پر بھارتی فوج کا قبضہ ہو چکا تھا اور شیخ مجیب کے عوامی لیگی محب وطن لوگوں اور غیر بنگالیوں کا قتل عام کر رہے تھے۔ اگر میں آگے رانگا ماتی کی طرف نکل گیا تو پھر دریائے کرنافلی عبور کر کے میں برما کی طرف جا سکتا تھا۔

لیکن یہ راستہ بے حد دشوار گزار، لمبا اور خطرناک تھا۔ یہ سُندربن کا علاقہ تھا جس کی دلدلیں اور شیر مشہور ہیں۔ ویسے بھی مجھے کوئی علم نہیں تھا کہ مشرقی پاکستان کی سرحد کہاں اور کس جگہ سے برما کی سرحد پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ مجھے کاکس بازار کے جنگل طے کر کے آگے جانا تھا جو بے حد مشکل کام تھا۔ اور پھر یہ علاقہ بھارتی تخریب کاروں اور بھارتی کمانڈوز کی آماجگاہ تھا۔ اس طرف سے بھاگنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اب صرف ایک ہی راستہ باقی تھا کہ کسی طرح

سے اگر میں مشرقی پاکستان کی سرحد عبور کرکے بھارت میں داخل ہو جاؤں تو میں مکتی باہنی کی سنگینوں سے بچ سکتا ہوں۔ اگرچہ بھارت میں بھی پکڑا جا سکتا ہوں لیکن وہاں قید ہو جاؤں گا۔ اور اگر کوشش کروں تو کسی نہ کسی طریقے سے سمگلروں کے ساتھ مل کر پنجاب کی سرحد عبور کرکے پاکستان میں داخل ہو سکتا ہوں۔

بہرحال ایک بات تو طے تھی کہ مجھے مشرقی پاکستان سے جلد از جلد نکل جانا چاہیئے۔ دوسری بات یہ کہ مجھے بھارت میں داخل ہو جانا چاہیئے۔ برما کی طرف یا نیپال کی سمت جانا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے برابر تھا۔ کیونکہ یہ سارے علاقے، اور ان علاقوں کے سارے جنگل، دریا اور پہاڑ میرے لئے بالکل اجنبی تھے۔ اب میں سوچنے لگا کہ بھارت کی سرحد کس مقام سے عبور کروں۔ یہ جگہ ہلّی کے علاقے میں ہی تھی۔ ہلّی وہی جگہ ہے۔ جہاں پاک فوج کے جیالوں نے شجاعت اور بہادری کی ایک نئی تاریخ اپنے خون سے لکھی تھی اور بھارتی حملہ آوروں کو ناکوں چنے چبوا دیئے تھے۔ اگر سپلائی لائن کٹ جائے۔ ہیڈکوارٹر سے رابطہ ٹوٹ جائے اور تخریب کار جگہ جگہ ملک کے اندر اور محاذ کے پیچھے تخریبی کارروائیاں کر رہے ہوں تو وہاں دنیا کی کوئی بھی فوج زیادہ دیر تک نہیں لڑ سکتی۔

ہلّی میں کئی بار گیا تھا۔ یہاں سے بھارت کی سرحد دو چار میل کے فاصلے پر تھی۔ اس راستے میں بھی مکتی باہنی اور بھارتی فوجیوں سے مڈھ بھیڑ ہونے کا پورا پورا امکان تھا۔ لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ڈھاکے جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہلّی سے سرحد پار کرکے بھارت میں داخل ہونے کا ایک ہی صورت تھی کہ میں بنگالی بن کر یہاں سے چلوں۔ میرا رنگ ان چھ سات دنوں میں سانولا پڑ گیا تھا۔ بنگالی زبان میں بڑی روانی سے بول لیتا تھا۔ اتنا مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس وقت بھارت کی سرحد پوری طرح سے کھلی ہوگی اور ادھر سے بھارتی ہندو سیٹھ ڈھاکے اور چٹاگانگ کے کارخانوں اور مسلمانوں کی دکانوں پر قبضہ کرنے کے لئے دھڑا دھڑ چلے آ رہے ہوں گے۔

ایک بار اگر میں بچتا بچاتا ہلّی پہنچ جاؤں تو وہاں سے سرحد عبور کرکے بھارت میں داخل ہونا کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ دل میں یہی فیصلہ کرکے میں ریسٹ ہاؤس کے کمرے میں ایک

...ف جا کر لیٹ گیا۔ رات میں نے اسی خونی ریسٹ ہاؤس میں گزاری اور صبح ہوتے ہی میں وہاں ...ے واپس چل پڑا۔ واپسی پر بھی بیل گاڑی نے مجھے بڑا فائدہ دیا۔ میری داڑھی اور سر کے بال ...ت بڑھ گئے تھے۔ اچانک مجھے اُن بیراگیوں کا خیال آ گیا۔ جنہیں میں نے سُجاتا کے ساتھ ان کی ...ٹھی کے قریب گاتے بجاتے دیکھا تھا۔ کیوں نہ میں جوگیوں ایسا حلیہ بنا لوں؟ اس طرح سے مجھے ...ئی پہچانے گا بھی نہیں اور مجھ پر شک نہیں کیا جائے گا۔ اپنا یہ خیال مجھے پسند آیا۔ میں نے ...صلہ کر لیا کہ کسی گاؤں میں پہنچ کر جوگی بن جاؤں گا۔

جوگی بننے کے لئے صرف مجھے گیروے رنگ کی ایک دھوتی چاہیئے تھی اور بس...... یہ ...روے رنگ کی دھوتی مجھے کسی نہ کسی جگہ سے مل سکتی تھی۔ میں بیل گاڑی میں سوار واپس ...ٹاگانگ کی طرف جا رہا تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل تھے۔ بارش نہیں ہوئی تھی۔ بادل کل ...ن سے چھائے ہوئے تھے۔ بیل گاڑی سارا دن چلتی رہی۔ رات کو میں نے جنگل ہی میں ایک جگہ ...یام کیا۔ صبح صبح اُٹھا۔ ایک تالاب پر منہ ہاتھ دھویا۔ اپنا چہرہ پانی میں دیکھا تو ڈر گیا۔ یہ کسی ...گل کا چہرہ تھا۔ ایک اعتبار سے اچھا بھی تھا کہ کسی کو مجھ پر کبھی شک نہیں ہو سکتا تھا کہ میں ...جابی ہوں۔ میری گوری چٹی رنگت گہری سانولی ہو گئی تھی۔ میں کسی طرح سے بھی وہ نہیں تھا جو ...ھاکے میں تھا۔ اس حلیے میں لوگ مجھے پاگل تو سمجھ سکتے تھے لیکن جوگی نہیں۔

اور میں جوگی بن کر اس ظالم دیس سے نکل جانا چاہتا تھا۔ میں بیل گاڑی پر سوار ہو کر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ شام ہو رہی تھی کہ دور سے مجھے چٹاگانگ شہر کی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ میں مومن بھائی کے مکان کے قریب جا کر گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ اب مجھے بیل گاڑی کی ضرورت نہیں تھی۔ مومن بھائی کا مکان آدھا جلا ہوا تھا۔ میں اس کے اندر نہیں گیا۔ باہر ہی سے دیکھ کر سڑک پر آ گیا۔ یہ سڑک شہر کو جاتی تھی۔ میری جیب میں ڈھائی سو روپے ابھی تک محفوظ پڑے تھے۔ یہ شہر کے مضافات کا علاقہ تھا۔ ایک درخت کے نیچے کھوکھا سا بنا تھا۔ اس میں مجھے ایک حجام نظر آیا جو ایک آدمی کی شیو بنا رہا تھا۔ میں بھی اس کے پاس ہی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کی باتوں سے معلوم ہوا کہ سارے ملک پر بھارتی فوج پھیل گئی ہے۔ شیخ مجیب نے بنگلہ دیش کا اعلان کر دیا ہے اور سرکاری عمارتوں

پر بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرا دیا گیا ہے۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ شہر شہر گاؤں گاؤں غیر بنگالیوں کو چن چن کر قتل کیا جا رہا ہے۔ میر
شیخ مجیب کا بنگالی حامی بن کر ان کی باتوں میں شریک ہو گیا اور شیخ مجیب اور مکتی باہنی
تعریف کرنے لگا۔ اس حجام نے مجھ سے پوچھا کہ میرے بال اتنے کیوں بڑھ گئے ہیں۔ میں
رازدارانہ انداز میں کہا:

"میں نے ایک مہینے سے سندر بن کے جنگلوں میں مکتی باہنی کے لئے کام کرتا رہا ہوا

اس انکشاف پر انہوں نے مجھے تعریفی نگاہوں سے دیکھا اور میرے لئے چائے منگوائی۔
پیتے ہوئے میں نے انہیں اپنی بہادری اور بنگلہ دیش کی خدمت کے سلسلے میں کئی ایک جھو
قصے سنائے۔ پھر میں نے اپنا سر منڈوا دیا۔ داڑھی مونچھ صفاچٹ کروائی اور سگریٹ سلگا
باہر آ گیا۔ وہاں سے سیدھا ایک کپڑے کی دکان پر پہنچا۔ وہاں سے گیروے رنگ کا دس بارہ گ
کپڑا خریدا۔ اور سیدھا ایک معمولی سے ہوٹل میں آ کر کمار گپتا کے نام سے کمرہ بُک کرا لیا
رات اس ہوٹل میں بسر کی۔ صبح اُٹھ کر نہایا۔ گیروے رنگ کی دھوتی پہنی۔ اسی کو شانوں
اوپر ڈال لیا۔ اب میں پورا سادھو یا جوگی بن گیا تھا۔ ہوٹل سے نکل کر ایک جوتوں کی دکا
گیا۔ وہاں سے ایک چپل خرید کر پہنی اور چٹاگانگ کے ایک باغ میں جا کر بیٹھ گیا اور سو
لگا اب کیا کرنا چاہیئے۔

پھر دل میں ایک فیصلہ کر کے اٹھا اور سیدھا چٹاگانگ ریلوے سٹیشن پر آ گیا۔ کبھی
یہاں سوٹ بوٹ پہن کر بڑی آزادی سے گھوما پھرا کرتا تھا۔ کبھی میں دل محبت کا میٹھا میٹ
درد لئے یہاں سے نکل کر سُجاتا سے ملنے جایا کرتا تھا۔ لیکن اب پانسہ پلٹ گیا تھا۔ بساط اُلٹ
گئی تھی۔ ہر شے اُوپر تلے ہو گئی تھی کل جو گلے میں باہیں ڈال کر چلتے تھے آج اجنبی بن گئے تھے
سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ مکتی باہنی کے ہندو فوجی پاکستان دوست لوگوں کی جان کے د
ہو رہے تھے اور انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلاک کر رہے تھے۔ میں ویٹنگ روم میں آ کر بیٹھ گ
گاڑی ابھی پلیٹ فارم پر نہیں آئی تھی۔ میں نے چائے پی اور سگریٹ سلگا کر سادھوؤں
طرح آلتی پالتی مار کر بنچ پر بیٹھ گیا۔ میں جوگی بابا کی طرح سے اداکاری کر رہا تھا۔ دو ایک بنگا
نے میری طرف عقیدت سے دیکھا اور پرنام کر کے گذر گئے، میں نے بھی آنکھیں بند کر کے اُن کے
نمسکار کا ہاتھ سے جواب دیا اور سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد پلیٹ فارم پر گاڑی آ کر لگ گئی۔ میں نے ٹکٹ پہلے ہی سے لے رکھا تھا۔
میں تھرڈ کلاس کے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ بڑا رش تھا۔ بھارتی فوج کے دو چار سپاہی بھی اس
ڈبے میں سوار تھے۔ ہندو بھی تھے اور مسلمان مسافر بھی ..... مگر ان سب کی پہچان مشکل تھی
میں کسی سے زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں خاموش بیٹھا تھا۔ لوگ مجھے عقیدت
بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں خاموش تھا اور مسکرا کر لوگوں کے سلام کا جواب دے
رہا تھا۔ گاڑی چل پڑی۔ سٹیشن پر سٹیشن آ کر گذرتے تھے۔ گاڑی کی رفتار تیز تھی۔ دوپہر
کے بعد بھی میں ایک ریلوے سٹیشن پر اُتر گیا۔ یہاں سے ہلی سٹیشن کے لئے مجھے گاڑی بدلنی تھی۔

کچھ دیر کے لئے میں ریلوے سٹیشن کے بنچ پر آلتی پالتی مارے بیٹھا رہا۔ یہاں بھارتی فوجی
اور مکتی باہنی کے سپاہی چل پھر رہے تھے۔ مجھ پر کسی کو شک نہیں ہو رہا تھا کہ میں پنجابی ہوں اور
ڈھاکے سے فرار ہو رہا ہوں۔ جوگی کا بھیس مجھے بڑا فائدہ پہنچا گیا تھا۔ کچھ لوگ اور عورتیں میرے
پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ میں انہیں آشیرباد دیتا رہا۔ کوئی اولاد کا پوچھ رہی تھی تو کوئی اپنی بیماری
کے بارے میں دعا کرانا چاہتا تھا۔ میں ان کی بیماریوں کے علاج میں انہیں بتا رہا تھا اور کانی آنکھ
سے اس ٹرین کو بھی دیکھ رہا تھا جو ابھی ابھی وہاں آ کر رُکی تھی اور جس نے مجھے اپنے ساتھ لے
کر میری منزل مقصود تک جانا تھا۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے کہ میں ہلی پہنچ گیا۔ یہاں کی انڈیا کی سرحد تھوڑے
فاصلے پر ہی تھی۔ سرحد کی طرف جو سڑک جاتی تھی اس پر لوگ آ جا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ
سرحد کھول دی گئی ہے۔ انڈیا سے بھی لوگ بھاری تعداد میں چلے آ رہے تھے۔ میں نے
ریلوے سٹیشن پر پاکستانی روپوں کے بدلے میں بھارتی کرنسی تبدیل کروا لی۔ ایک ٹرک جس
میں سامان لدا تھا انڈیا کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ دے کر روک لیا۔ ڈرائیور
ہندو بنگالی تھا۔ اس نے مجھے ہندو جوگی سمجھ کر اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ ٹرک بھارت کی سرحد
عبور کر کے انڈیا میں داخل ہو گیا۔ یہ مغربی بنگال کا علاقہ تھا جہاں ناریل کے درخت

دُور دُور تک پھیلے تھے۔ چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں کے بیچوں بیچ میں کہیں تالاب بھی تھے شام کے گہرے ہوتے سایوں میں ان جھونپڑیوں میں سے کہیں کہیں دھواں اُٹھ رہا تھا۔ میرا دل اداس ہو گیا۔ ہندو بنگالی ڈرائیور مجھے بتا رہا تھا کہ وہ چٹاگانگ سے مسلمانوں کا سامان لوٹ کر کلکتے لے جا رہا ہے۔ اور یہ اس کا چوتھا پھیرا ہے۔

میں اس کی ہاں میں ہاں ملائے جا رہا تھا اور سوچ بھی رہا تھا کہ یہ کیسا انقلاب آگیا ہے۔ ٹرک ایک پھاٹک پر رک گیا۔ اُدھر سے مال گاڑی آ رہی تھی۔ کچھ انڈین فوجی آکر ٹرک کی پڑتال کرنے لگے۔ ڈرائیور نے انہیں ریڈیو اور بجلی کی استری اور تھرمس بوتل دے کر پیچھا چھڑایا۔

جب وہ چلے گئے تو ڈرائیور انہیں بُرا بھلا کہنے لگا۔

"کم بخت ہر پھیرے پر کچھ نہ کچھ ضرور ہتھیا لیتے ہیں۔"

ٹرین آکر گذر گئی۔ پھاٹک کھل گیا۔ رات گیارہ بجے کے بعد ہم کلکتے میں داخل ہو گئے۔ اس شہر سے میں خوب واقف تھا۔ ۶۵ء سے پہلے کئی بار یہاں آیا تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے بھی اس شہر میں آنا جانا رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ زکریا سٹریٹ میں مسجد ناخدا اور امجدیہ ہوٹل کے ارد گرد کا علاقہ امرتسر کے کشمیری مسلمانوں کا علاقہ رہ چکا ہے۔ وہاں اب امرتسر کے کشمیری مسلمان دو ایک ہی تھے۔ جنہوں نے نقل مکانی نہیں کی تھی اور یہیں ٹھہر گئے تھے۔ میرا ارادہ اسی علاقے میں جا کر کسی پنجابی مسلمان سے رابطہ پیدا کر کے انڈیا سے پاکستان کی طرف سمگل ہونے کا تھا۔

ٹرک شام بازار کے آس پاس رُکا تھا۔ میں نے وہاں سے ایک ٹیکسی لی اور لوئر چت پور روڈ پر سراج بلڈنگ کے پاس آکر گاڑی چھوڑ دی۔ اب میں آپ کو یہاں تک بتاؤں کہ کلکتے کے مسلمانوں کا غم سے کیا حال تھا؟ انہیں سقوط ڈھاکہ کا بے حد صدمہ ہوا تھا۔ لیکن وہاں کے ہندو بنگالیوں کی خوشیوں میں شریک تھے۔ کیا کرتے۔ مجبور تھے۔ دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ لیکن زبان سے کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ میں نے چوک والے پنواڑی کی دکان سے سگریٹ خریدے اور امجدیہ ہوٹل میں آکر ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔ ہوٹل کے مالک کو میں نے کچھ نہ بتایا۔ دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔ بستر پر گرتے ہی سو گیا۔ صبح اُٹھا۔ منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کیا اور

ہوٹل میں آکر کرسی پہ بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔

میں جوگی بنا ہوا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہاں بھارتی سی آئی ڈی کے کچھ لوگ ادھر اُدھر گھوم پھر رہے تھے۔ ایک دُبلا پتلا پکی عمر کا آدمی مجھے تھوڑی تھوڑی دیر بعد گہری نظروں سے دیکھ لیتا تھا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ یہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے۔ پھر وہ میرے پاس آکر کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے لئے چائے کے کپ کا آرڈر دے کر مجھ سے بولا۔

"مہاراج! آپ چائے پئیں گے؟"

"میں نے سر ہلا کر کہا۔ "نہیں۔ میں نے ابھی چائے پی ہے۔"

یہ جملہ میں نے بنگالی زبان میں ادا کیا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آ رہا ہوں۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں سنیاسی ہوں بہار میں پیدا ہوا اور ساری زندگی ہمالیہ کے جنگلوں میں جڑی بوٹیوں کی تلاش میں پھرتا پھراتا رہا ہوں۔ وہ میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ جیسے سب کچھ جانتا ہوں کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔

"مہاراج! آپ ڈھاکے سے آ رہے ہیں کیا؟"

یہ سوال اس نے اچانک کر دیا تھا۔ میں اس کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔ ایک پل کے لئے گھبرا گیا۔ لیکن جلدی ہی اپنے احساسات پر قابو لیا۔

"ہم بیراگی لوگ ہیں بابا! سنسار ہی گھر ہے منہ پھر [illegible] رہتے ہیں۔"

"ڈھاکہ میں آپ کہاں ٹھہرے ہوئے تھے؟"

یہ شخص آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ میں نے اس سے جلدی گلو خلاصی کرانے کے لئے کہا۔

"بابا! ہم ڈھاکہ سے نہیں آئے۔ ہم تو گیا بھگوان بدھ کی یاترا کے لئے گئے تھے۔ ابھی ادھر اپنے ایک چیلے سے ملنے آئے ہیں۔ وہ کالی جی کے مندر میں رہتا ہے۔ سوچا یہاں چائے پیتے چلیں۔"

سی۔ آئی۔ ڈی کا آدمی مسکرائے جا رہا تھا جیسے اُسے میری بات کا بالکل اعتبار نہ ہو۔ پھر وہ اچانک بولا "مہاراج! میرے ساتھ آپ کو تھوڑی دیر کے لئے تھانے چلنا

ہو گا۔"

تھانے کا نام سُن کر میں سہم گیا۔ بھارتی پولیس کے قبضے میں آنے کا مطلب یہ تھا کہ میں پاکستانی جاسوس بن کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے امرتسر یا نابھہ جیل کی کال کوٹھڑی میں محبوس کر دیا جاؤں گا۔ پھر اذیت ناک سزاؤں کا دردناک منظر میری آنکھوں کے سامنے آگیا میں نے ان سزاؤں کا ذکر ان لوگوں سے سن رکھا تھا جو بھارتی جیل خانوں میں قید رہ چکے تھے۔ اب وقت آگیا تھا کہ میں اپنے جوگی ہونے کا پورا پورا فائدہ اٹھاؤں۔

میں نے ایک ہاتھ اٹھا کر ہوا میں بلند کیا اور گرج دار آواز میں بولا۔

"ہم سنیاسی بابا ہیں۔ ہم دنیا سے منہ موڑ چکے ہیں۔ ہمیں تنگ نہ کرو بابا! جاؤ اپنا کام کرو۔ اگر تم نے ہمیں پریشان کیا تو بھگوان تم سے تمہارا بچہ واپس لے لے گا۔ ہماری بد کبھی خالی نہیں گئی۔"

یہ ایک اتفاق تھا اور میری خوش قسمتی تھی کہ اس آدمی کا بچہ بیمار تھا بلکہ کئی روز سے بیمار تھا۔ میرے منہ سے بچے کی موت کا ذکر سن کر وہ لرز اُٹھا۔ جلدی سے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"معاف کر دیں مہاراج! مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میرے بچے کے لئے بھگوان سے پرارتھنا کریں۔ وہ بہت بیمار ہے۔"

اُلٹا وہ میرے پاؤں چھونے لگا۔ میں نے اپنے پاؤں اور آگے کر دیئے۔ میں اس کم بخت سے پوری خدمت کرانا چاہتا تھا۔ میں نے جھوٹ موٹ جیب سے ایک سفوف سا نکال کر اسے پڑیا میں باندھ کر اُسے دیا اور کہا۔

"یہ لے! اسے پانی میں گھول کر اپنے بچے کو پلا دینا۔ بھگوان نے چاہا تو تمہارا بچہ دو دن میں اچھا ہو جائے گا۔"

اس نے دوائی لے کر جیب میں رکھ لی اور دس روپے کا نوٹ نکال کر میرے قدموں میں ہاتھ جوڑ کر رکھ دیا۔

مہاراج! میں غریب ہوں۔ اس سے زیادہ آپ کی سیوا نہیں کر سکتا۔"

میں نے دس کا نوٹ لے کر جیب میں ڈال لیا۔ اب اس نے اعتراف کیا کہ وہ

آئی ڈی کا آدمی ہے اور ان لوگوں کی ٹوہ میں ہے جو بنگلہ دیش سے نکل کر بھارت میں ہے ہیں۔ اس کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ سی آئی ڈی سارے کلکتے میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس میرا چائے کا بل بھی ادا کیا اور جاتے ہوئے جھک کر میرے قدموں کو چھو کر گیا۔ میں نے سوچا جوگی بن کر پھرنا خواہ مخواہ دوسروں کی نظروں میں آنے کے برابر ہے۔ کیوں نہ میں یہ حلیہ ل کر سیدھے سادے انسانوں والا لباس پہن لوں؟ یہ بات مجھے پسند آئی۔ جھٹ بازار گیا۔ ر وہاں سے اپنے لئے ایک پتلون دو قمیصیں خرید لایا۔ شام کو میں نے یہ لباس پہنا اور ٹ سینما کے نزدیک اپنے ایک پرانے واقف کار کے ہاں آگیا۔ یہ شخص قالینوں کی ایجنسی کرتا ا اور کوئی چالیس برس سے کلکتے میں تھا۔ بوڑھا آدمی تھا اور میرے والد صاحب کا دوست ا تھا۔ مجھے دیکھ کر پہلے تو بڑا حیران ہوا۔ پھر مجھے گلے سے چمٹا لیا اور بولا۔ "تم کیسے یہاں گئے؟"

میں نے اُسے اپنے فرار کی ساری کہانی سنا ڈالی۔ وہ بڑی حیرانی سے میری باتیں سنتا رہا۔ سقوطِ ڈھاکہ سے اُسے بے حد صدمہ ہوا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میں بغیر پاسپورٹ کے گیا ہوں اور سی۔ آئی۔ ڈی میرے پیچھے لگی ہے تو گھبرا سا گیا۔

"بیٹا! اگرچہ میں کافی عرصے سے اس شہر میں رہ رہا ہوں پھر بھی یہاں کی پولیس مسلمانوں کے خلاف ہے۔ وہ ہماری ایک بات بھی نہیں سُنتی۔ یہ لوگ تمہارے ساتھ مجھے بھی پکڑ کر جیل میں ڈال دیں گے۔ بہتر ہے کہ تم یہاں سے کالی گھاٹ کی طرف چچا عبدالکریم کے پاس چلے جاؤ۔"

چچا عبدالکریم بھی ہمارے والد کے پرانے ملنے والوں میں سے تھا۔ میں زکریا سٹریٹ سے اُٹھ کر کالی گھاٹ عبدالکریم چچا کے پاس چلا گیا۔ یہ کچھ ہمت والا نکلا۔ اس نے مجھے حوصلہ دیا کہ میں پریشان نہ ہوؤں۔ وہ مجھے ایک ایسے شخص سے ملا دے گا جو پنجاب کی سرحد پر سمگلنگ کرنے والوں سے واقف ہے۔ میں بڑا خوش ہوا۔ کیونکہ میں یہی چاہتا تھا۔ چچا کے پاس رہتے ہوئے مجھے تین روز گذر گئے۔ اس عرصے میں مجھے بہت کم باہر نکلنے دیا گیا۔ میں گھر کی چار دیواری میں قید ہو کر رہ گیا۔ طبیعت بڑی گھبرانے لگی۔ چچا اس آدمی کے انتظار میں تھا جو سمگلنگ کے گروہ میں سے تھا۔

چوتھے روز میں بیٹھک میں بیٹھے بیٹھے تنگ آ گیا۔ میں نے کہا

"چچا! میں ذرا بازار سے سگریٹ وغیرہ لے آؤں۔ میں تو اندر بیٹھے بیٹھے تھک گیا۔ چچا نے مجھے تا
کی کہ میں زیادہ دُور نہ جاؤں اور جلدی سے واپس آ جاؤں۔ میں کالی گھاٹ کے علاقے میں گھ
پھرنے لگا۔ یہ علاقہ ہندو اکثریت کا علاقہ تھا۔ ایک ہوٹل میں کانن بالا کا ریکارڈ بج رہا تھا۔ م
وہاں بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ چائے پی کر میں نے پان کھایا اور سگریٹ سلگا کر بڑے مزے مز
واپس گھر کی طرف چل پڑا۔ میں نے محسوس کیا کہ ایک شخص میرا تعاقب کر رہا ہے۔ میں نے گھ
کر دیکھا۔ وہ بھاری بدن کا پتلون قمیص والا ہندو تھا۔ شکل سے صاف سی آئی ڈی والا معلو
ہوتا تھا۔ میں تیز تیز چلنے لگا اور چچا کے گھر میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ میں نے چچا کو
بتایا تو وہ پریشان ہو کر باہر جھانکنے لگا۔ سامنے درختوں کے نیچے بچھے ہوئے بنچ پر وہی بھار
شخص بیٹھا ہوا تھا۔ چچا نے کہا۔

"یہ تو پنجاب کی سی آئی ڈی کا آدمی ہے۔ یہ سپیشل سی آئی ڈی کا سٹاف
یہاں آیا ہوا ہے۔ تم نے غلطی کی جو باہر چلے گئے۔ اگر چلے بھی گئے تھے تو واپس تمہیں
اِدھر اُدھر کے چکر لگا کر آنا چاہیئے تھا۔ لیکن خیر ـــــ دیکھا جائے گا۔

دیکھا کیا جانا تھا۔ دوپہر کو ہم کھانا کھا کے فارغ ہوئے تھے کہ بنگال پولیس کے سپاہیوں نے
دروازے پر سامنے لا کر جیپ کھڑی کر دی۔ چچا نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا تو چیخ کر بولا۔

"پولیس آ گئی۔ پچھلی دیوار پھاند کر بھاگ جاؤ۔ یہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ صحن کی عقبی دیوار پھاند کر دوسری طرف گلی میں چھلانگ لگا
یہ گلی کچرا گلی تھی اور عمارتوں کے پچھواڑے یہاں لگتے تھے۔ میں بھاگتا چلا گیا اور کئی بلڈنگوں کو
پیچھے چھوڑ کر گھوم پھر آخر ایک سڑک پر نکل آیا۔ یہ سڑک چھوٹی سی تھی۔ ایک ٹرام بڑی سست
رفتاری سے چلی آ رہی تھی۔ میں لپک کر اس میں سوار ہو گیا۔ ٹرام مجھے لے کر کلکتے کے بازار
میں سے گذرنے لگی۔ میں سوچنے لگا کہ جانے بے چارے چچا پر کیا گذر رہی ہو گی۔ ظاہر ہے پولیس
اس سے ضرور میرے بارے میں پوچھ گچھ کرے گی۔ اسے تنگ کرے گی کہ بتائے میں کہاں ہوں
لیکن میں کر سکتا تھا سوائے بھاگنے ـــــ چچا نے خود مجھے بھگا دیا تھا۔ بے چارے نے خود

مصیبت مول لے لی اور میری جان چھڑا دی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ایک بار میں پولیس
کے قبضے میں چلا جاتا تو پھر اس سے رہائی بڑی مشکل تھی۔

ٹرام بازاروں میں سے گذر رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ کہاں جاؤں؟ کہاں اتروں ٹرام
سے؟ میری جیب میں پچاس کے قریب انڈین کرنسی تھی۔ میں خضر پور کی طرف نکل آیا تھا۔ یہاں
میں ٹرام سے اُتر گیا۔ اس جگہ رام بھرو سے نام کے ایک ہوٹل کو میں جانتا تھا۔ اس ہوٹل میں میں
نے کرشن کمار کے نام سے ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔ کمرے میں آ کر میں پلنگ پر لیٹ گیا۔ اور
سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ دل نے کہا کلکتے سے نکل چلو اور دلی کی طرف چلتے ہیں لیکن
وہاں جا کر کیا کروں گا۔ کس سے مل کر سرحد پار کرنے کی کوشش کروں گا۔ کیوں نہ ایک بار چچا
کے پاس جا کر اس شخص کا پتا حاصل کروں جو سمگلروں سے واقف ہے؟ جب رات ہو گئی
تو میں کھانا کھا کر ہوٹل سے نکلا اور ٹرام میں بیٹھ کر کالی گھاٹ کی طرف آ گیا۔

چھپتا چھپاتا، اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں سے بچاتا میں عقبی دیوار پھاند کر چچا عبدالکریم
کے کوارٹر میں کود گیا۔ چچا مجھے دیکھتے ہی ایک کمرے میں لے گیا۔ اور بتانے لگا کہ پولیس میری تلاش
میں ہے۔

"مجھے تو انہوں نے چھوڑ دیا ہے لیکن میرے گھر کی برابر نگرانی کی جا رہی ہے
تم نے اچھا کیا کہ سامنے والے دروازے سے نہیں آئے۔ بہر حال تمہاری تلاش میں
سارے شہر کی پولیس اور سی آئی ڈی کو خبردار کر دیا گیا ہے۔"

میں نے اس آدمی کا ایڈریس مانگا جس سے چچا مجھے ملوانے والا تھا۔ اس نے مجھے ایک
کاغذ پر اس کا ایڈریس لکھ کر دیا اور تاکید کی کہ میں پھر ادھر نہ آؤں جب تک کہ حالات ٹھیک
نہیں ہو جاتے۔ میں دیوار پھاند کر وہاں سے نکل گیا۔ ٹرام میں سوار ہو کر واپس اپنے ہوٹل
آیا اور ایڈریس دیکھا۔ یہ کوئی گنگولی نام کا ہندو تھا جو شام بازار میں رہتا تھا۔ رات ہوٹل
میں بسر کی۔ صبح سویرے منہ ہاتھ دھو کر ناشتا کر کے باہر نکلا اور ٹرام میں بیٹھ کر شام بازار
آ گیا۔ گنگولی مجھے گھر پر ہی مل گیا۔ میں نے اُسے چچا کا خط دیا۔ خط پڑھ کر اس نے مجھے سر سے
لے کر پاؤں تک دیکھا اور مسکرا کر بولا:

"تم پنجاب جانا چاہتے ہو؟ میرا مطلب ہے پاکستان کے پنجاب جانا چاہتے ہو"؟

"ہاں! جی ہاں۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ گنگولی ہنس پڑا۔ پھر اس نے مجھے نہایت اعلیٰ امریکی سگریٹ پینے کو دیا اور کہنے لگا۔

"پرسوں رات کو آجانا میرے پاس۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

میں اس کے مکان سے باہر آگیا۔ سیدھا واپس اپنے ہوٹل پہنچا۔ ابھی یہاں مجھے دو راتیں اور دو دن بسر کرنے تھے۔ میں زیادہ وقت ہوٹل کے کمرے میں ہی گذارتا۔ باہر نکلنے سے سی آئی ڈی کی نظروں میں آجانے کا ڈر تھا۔ میں ایک دشمن ملک میں تھا جہاں قدم قدم پر پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔ مجھے ایک لمحے کے لئے بھی یاد نہ آیا کہ سجاتا بھی اسی شہر میں رہتی ہے۔ یا شاید اس نے کہا تھا کہ وہ بمبئی چلے گئے ہیں۔ کلکتے میں ان کا آبائی گھر تھا۔ لیکن اس وقت مجھے اپنی پڑی ہوئی تھی اور عشق ومحبّت سب کچھ بھول چکا تھا۔ بھارتی پولیس کی قید میں جانا موت سے بدتر تھا۔ میں نے ان لوگوں کی بڑی ہوئی تھی اور عشق ومحبت سب کچھ بھول چکا تھا۔ بھارتی پولیس کی قید میں جانا موت سے بدتر تھا۔ میں نے ان لوگوں کی بڑی دردانگیز کہانیاں سن رکھی تھی جو بھارت میں جاسوسی کے الزام میں پکڑے گئے اور پھر جیل خانوں میں پولیس اور سی آئی ڈی کی اذیتیں برداشت کرتے کرتے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اسی لئے میں ہوٹل سے باہر نکلنے کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ صرف شام کے بعد تھوڑی دیر کو ٹہلنے کے لئے نکلتا۔ اب میرے پاس روپے بھی کم ہو رہے تھے۔ بس اتنی رقم باقی تھی کہ ہوٹل کا بل ادا کر کے یہاں سے نکل سکوں۔ تیسرے دن میں صبح صبح ہوٹل سے نکل گیا۔

سیدھا شام بازار گنگولی سمگلر کے گھر جا پہنچا۔ یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں اس نے پولیس میں میری مخبری نہ کر دی ہو۔ ڈرتے ڈرتے برآمدے میں داخل ہوا۔ نوکر نے اندر جا کر اطلاع دی۔ گنگولی نے مجھے اندر بلا لیا۔ وہ ناشتا کر رہا تھا۔

اس نے مجھے چائے بنا کر دی اور بولا:

"میں تمہارے چچا کی بہت عزت کرتا ہوں۔ اس وقت ملک کے حالات ایسے نہیں کہ میں تمہیں بارڈر کراس کرنے کا مشورہ دوں۔"

میں نے اسے بڑے ادب سے قائل کرنے کی کوشش کی کہ میرا یہاں سے نکلنا بہت ضروری ہے۔ پاکستان میں میرے پیچھے پریشان ہوں گے۔ انہیں میری زندگی اور موت کی کوئی خبر نہیں ہے۔ اس لئے آپ مہربانی کریں اور مجھے کسی طرح سے بارڈر کراس کرا دیں۔ میں آپ کا بہت شکرگزار رہوں گا۔ گنگولی نے مجھے سگریٹ پینے کو دیا اور اٹھ کر ایک الماری کھولی۔ اس میں سے ایک کاپی نکال کر اس میں سے کچھ پڑھا۔ پھر ایک کاغذ پنسل لے کر اس پر کچھ لکھنے لگا۔ میں اُسے دیکھتا رہا۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا لیکن چہرہ بھرا بھرا اور صحت مند تھا۔ کاغذ تہہ کر کے مجھے دیتے ہوئے بولا:

"یہاں سے تم سیدھا دلی جانا۔ وہاں ایک محلہ ہے چتلی قبر۔ یہ محلہ جامع مسجد کے ساتھ ہی ہے۔ وہاں تمہیں ہرنام سنگھ سکھ کی دکان تلاش کرنی ہوگی یہ ترکھان ہے۔ اسے جا کر میرا یہ خط دے دینا۔ باقی کام وہ خود کرے گا"۔

پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "تمہارے پاس کرائے کے پیسے ہیں؟"

میں نے اُسے بتایا کہ صرف پندرہ روپے باقی رہ گئے ہیں۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اپنے چچا سے رقم لے سکتا ہوں؟ میں نے اُسے بتایا کہ رقم تو میں ان سے لے لوں مگر وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں۔ وہاں سی آئی ڈی کا پہرہ ہے۔ اس پر گنگولی نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر مجھے دیا اور کہنے لگا۔

"یہ تم اپنے پاس رکھو۔ میں تمہارے چچا سے لے لوں گا۔ اب تم جاؤ۔ دوپہر کو پنجاب میل چھوٹتی ہے۔ تم اس پر سوار ہو کر دہلی پہنچو۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور شام بازار آ کر ایک ٹیکسی پر سوار ہوا اور سیدھا سیالدہ سٹیشن پر آگیا۔ یہاں بڑی رونق تھی۔ میں ایک جگہ چھپ کر بنچ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر ابھی نہیں لگی تھی۔ دوپہر کا کھانا میں نے سٹیشن پر ہی کھایا۔ کبھی اس اسٹیشن پر ہم شام کو سیر کرنے آیا کرتے تھے اور آج میں چوروں کی طرح چھپ کر سہما ہوا بیٹھا تھا۔ خدا خدا کر کے دلی جانے والی گاڑی پلیٹ فارم پر آکر کھڑی ہو گئی۔ میں اس کے ایک چھوٹے سے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ اڑھائی بجے دوپہر کو اس گاڑی نے دلی کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ ریل چھوٹے چھوٹے سٹیشن

چھوڑتی بھاگی چلی جا رہی تھی۔ بنگال کا صوبہ ختم ہو گیا۔ میں ڈبے میں خاموشی سے دبکا بیٹھا رہا۔ مغل سرائے کے سٹیشن پر اُتر کر میں نے پانی پیا۔ سگریٹ سلگا کر اس کے کش لگائے اور دوبارہ اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ یہاں سے یوپی کی پولیس ٹرین میں سوار ہو گئی۔ سپاہی ہر ڈبے میں جھانک جھانک کر دیکھنے لگے۔ میں نظریں ملاتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ خدا خدا کر کے ٹرین نے چلنا شروع کیا۔

ساری رات گاڑی سفر کرتی رہی۔ دوسرے دن دوپہر کو دلّی کے مضافات شروع ہو گئے۔ دلّی۔ جو کبھی مسلم تہذیب و ثقافت کا گہوارہ تھی۔ دُور سے مجھے جامع مسجد کے مینار نظر آئے۔ مسلم تہذیب کے اس نشان کو دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کیسے کیسے انقلاب دیکھے تھے ان میناروں نے! کیسے کیسے طوفان گذرے تھے اس شہر پر سے — ٹرین دلّی کے بہت بڑے اسٹیشن وسیع یارڈ میں سے گذر رہی تھی۔ جمنا کا پل ہم عبور کر آئے تھے۔ مختلف ریل کی پٹڑیوں سے ہوتی ہوئی گاڑی ایک بارونق پلیٹ فارم پر آ کر رُک گئی۔ میں ڈبے میں سے دوسرے مسافر کے ساتھ نیچے اتر آیا۔

میں جانتا تھا کہ یہاں بھی سی آئی ڈی کے بے شمار آدمی ہوں گے جو ان لوگوں کی تلاش میں ہوں گے جو مشرقی پاکستان سے فرار ہو کر آئے ہیں۔ میں سب کی نظروں سے بچتا بچاتا بڑی خاموشی اور اعتماد کے ساتھ سٹیشن سے باہر آ گیا۔ یہ سارا علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ میں ایک رکشے پر سوار ہوا اور سیدھا جامع مسجد آ گیا۔ مجھے چتلی قبر بازار کا راستہ معلوم تھا میں نے رکشا چھوڑ دیا اور پیدل ہی چتلی قبر کے بازار کی طرف روانہ ہو گیا۔ کبھی یہ خالص مسلمانوں کی آبادی تھی۔ مگر اب یہ بے شمار ہندوؤں اور سکھوں کی دکانیں اور مکان تھے۔ مسلمان بڑے دب کر چل پھر رہے تھے ہر عورت برقعے کے بغیر نظر آ رہی تھی اور اس نے ماتھے پر تلک لگا رکھا تھا۔ ظاہر ہے ان میں مسلمان عورتیں بھی تھیں۔ چند ایک بوڑھی عورتیں برقعوں میں نظر آئیں۔

پوچھتے پوچھتے آخر میں ہرنام سنگھ ترکھان کی دکان پر پہنچ گیا۔ یہ ہٹا کٹا سکھ رندے سے ایک لکڑی کا تختہ چھیل رہا تھا۔ میں نے جا کر آداب عرض کیا تو اس نے بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھا کام پھر بھی کرتا رہا۔ میں نے جیب سے کاغذ نکال کر اسے دیا۔ اس نے رقعہ پڑھا اور مجھے اپنے ساتھ دکان کے اندر لے گیا۔ یہ پردے کے پیچھے ایک بیٹھک سی بنی تھی جہاں ایک چارپائی بچھی تھی

پاس ہی ایک آرام کرسی تھی دیوار پر گورونانک کی فریم کی ہوئی تصویر لگی تھی۔ اس نے خالص اور ٹھیٹھ پنجابی میں مجھ سے پوچھا کہ میں پنجابی ہوں کیا؟ میں نے کہا۔

"جی ہاں سردار جی! پنجابی ہوں۔ لاہور کا رہنے والا ہوں۔ مشرقی پاکستان میں کاروبار کرتا تھا۔ انقلاب کے بعد وہاں سے فرار ہو کر کلکتہ پہنچا۔ گنگولی صاحب سے ملا۔ انہوں نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔"

ہرنام سنگھ ہنس پڑا۔ پھر میرے شانے پر ہاتھ مار کر کہنے لگا۔

"یار لاہور کا کیا حال ہے؟"

میں نے اُسے بتایا کہ لاہور نے بہت ترقی کر لی ہے۔ بڑی بڑی عمارتیں بن گئی ہیں۔ نئی سڑکیں تعمیر ہو گئی ہیں۔ ہرنام سنگھ نے صندوق میں سے انگریزی شراب کی بوتل نکال کر کہا۔

"یار لاہور۔ لاہور ہی اے — پیئو گے؟"

"شکریہ سردار جی! میں نہیں پیا کرتا۔"

"یار تم لاہور کے ہو اور شراب نہیں پیتے؟ لاہور کے لوگ تو بڑے زندہ دل ہوتے ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔"

اس نے اپنا گلاس شراب سے بھرا اور اُسے غٹا غٹ پی گیا۔ پھر پیالی میں سے تھوڑا سا نمک لے کر زبان پر رکھا اور سر کو جھٹکا دے کر بولا۔

"تو پھر تم لاہور جانا چاہتے ہو بھائی جی۔"

"جی ہاں! میرے چھوٹے چھوٹے بچے بہت پریشان ہوں گے۔"

ہرنام سنگھ بولا۔ "بچے سب کے سانجھے ہوتے ہیں۔ ایک تو تم پنجابی ہو۔ اُوپر سے لاہوری ہو۔ پھر تم میرے بڑے گہرے یار رام گنگولی کا خط لائے ہو۔ میں تمہاری ضرور مدد کروں گا۔"

میں بڑا خوش ہوا کہ چلو کام بن گیا۔ اس نے شراب کا دوسرا گلاس پی کر مجھے بتانا شروع کیا کہ آج کل بارڈر پر دونوں طرف کی فوجیں ہر وقت گشت کرتی رہتی ہیں۔ جگہ جگہ فوجوں نے بارودی سرنگیں بچھا رکھی ہیں۔ سمگلروں نے آمد و رفت وقتی طور پر بند کر دی ہے۔

"اس لئے ہو سکتا ہے تمہیں امرتسر جا کر کچھ دیر انتظار کرنا پڑے۔ لیکن فکر نہ کرو۔ گورجی کی کرپا سے تم کو بارڈر کراس کرادوں گا۔ ابھی تم یہاں ہی ٹھہرو۔ دلّی کی سیر کرو۔ مزے کرو۔"

میں نے کہا۔ "سردار جی! میں بہت جلد واپس جانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ مجھے اپنے دوست کے پاس امرتسر بھجوادیں تو میں بہت مشکور ہوں گا۔"

اس پر ہرنام سنگھ نے غصے میں کہا۔

"مرتے کیوں جاتے ہو۔ تمہیں اس طرح تو بارڈر کراس نہیں کراؤں گا کہ تمہاری لاش وہاں پڑی رہ جائے۔ ذرا صبر کرو۔ مجھے سوچنے دو۔"

میں چپکا ہو رہا۔ ہرنام سنگھ نے میز پر انگلی بجاتے ہوئے سوچنا شروع کردیا۔ مجھے معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ وہ سوچ رہا ہے یا صرف میز پر انگلی بجا رہا ہے۔ جب وہ سو چکا تھا تو اس کی انگلی رک گئی۔ اس نے اپنی پگڑی ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا یار تم بھی کیا یاد کروگے کہ کسی سکھ سے پالا پڑا ہے۔ تم میرا خط لے کر یہا سے سیدھے امرتسر چلے جاؤ۔ وہاں کٹڑہ میاں سنگھ میں سیوا سنگھ سے مل لینا۔ شریف پورے کے باہر اس کی ریڈیو کی دکان ہے۔ بس یہ میرا خط اُسے جا کر دے دینا باقی سا کام وہ خود کرے گا۔"

ہرنام سنگھ نے مجھے گورمکھی میں ایک خط لکھ کر دیا۔ جسے میں نے تہہ کر کے قمیص جیب میں رکھ لیا۔ ہرنام سنگھ نے مجھے مسلمان ہوٹل سے کھانا منگوا کر کھلایا۔ اب اُ شراب چڑھ گئی تھی اور وہ اپنی ساس کو نہایت پھٹے دار گالیاں دے رہا تھا کیونکہ ا نے ہرنام سنگھ کی بیوی کو اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ میں اس کی باتیں سنتا رہا اور اونگ رہا۔ پھر وہ چارپائی پر گر کر سوگیا اور خراٹے لینے لگا۔ میں خاموشی سے اُٹھا اور بازار چت میں آگیا۔ یہ وہی گلی کوچے تھے جسے شاعر نے اوراقِ مصوّر کہا تھا۔ اب وہاں سکھوں کی شک جا بجا مل رہی تھیں۔ جامع مسجد کے باہر آکر میں نے ایک ریستوران میں بیٹھ کر چائے چائے پیتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ ایک آدمی ذرا پرے میز پر بیٹھا مجھے

سے دیکھ رہا ہے۔ میں ڈر گیا۔ مجھے خواہ مخواہ یقین ہوگیا کہ یہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے۔ مجھ سے اب وہاں بیٹھا نہ گیا۔ میں نے جلدی جلدی چائے ختم کی۔ بل ادا کیا اور ہوٹل سے باہر آکر گراؤنڈ میں سے ہو کر ریلوے سٹیشن والی ہارڈنگ لائبریری کی طرف چلنا شروع کردیا۔ اس لائبریری میں کبھی میں دیر تک بیٹھا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ آج اس لائبریری کے قریب سے پریشان ہو کر گذر رہا تھا۔ میں نے یوں ہی کسی بہانے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہی آدمی برابر میرے پیچھے چلا آرہا تھا۔ اب تو اس میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ یہ شخص سی۔آئی۔ڈی کا ہے اور اُسے مجھ پر شک پڑ گیا ہے۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ ایک دم بھاگ اُٹھوں۔ پھر سوچا کہ یہ بڑی خطرناک بات ہوگی۔ اس طرح تو یہ سارے لوگ مجھے پکڑنے کے لئے میرے پیچھے بھاگ کھڑے ہوں گے۔ تو پھر کیا کیا جائے؟ وہ آدمی تو برابر میرا پیچھا کر رہا تھا۔ میں ہارڈنگ لائبریری کے عقب سے ہو کر سامنے مزار والی سڑک پر آیا تو وہی آدمی میرے آگے آکر کھڑا ہوگیا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بڑی خباثت تھی اور شکل صورت سے بڑا مکار آدمی معلوم ہو رہا تھا۔ میں گھبرا گیا۔ اس نے سیدھا سؤر کی طرح حملہ کردیا۔

"تم ڈھاکے سے آئے ہو؟"

ایک بار تو مجھے پسینہ آگیا۔ پھر سنبھل کر کہا کہ میں ڈھاکے سے ہرگز نہیں آیا۔ بلکہ میں کلکتے سے آیا ہوں جہاں میں پیدا ہوا اور اپنے چچا کے ساتھ مل کر کاروبار کرتا ہوں اور دلی اپنے ذاتی کام سے آیا ہوں۔ میں بنگالی زبان بڑی روانی سے بول سکتا تھا۔ اس نے تیز نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا۔

"تمہیں میرے ساتھ ذرا تھانے تک چلنا ہوگا۔"

یہ وہ جملہ تھا جو میری جان نکالنے کے لئے کافی تھا۔ اس ایک جملے سے ہی میں ڈرتا تھا۔ میں تھانے نہیں جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ تھانے جانے کا مطلب یہ تھا کہ میری زندگی ختم ہو گئی اور میں پھر کبھی اپنے بال بچوں کا منہ نہ دیکھ سکوں گا۔ میرا دماغ بڑی تیزی سے بھاگنے کے متعلق سوچنے لگا۔ میں نے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ارد گرد نظر دوڑا کر دیکھ

لیا کہ وہاں بھاگنے کو بہت جگہ تھی۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ سارا علاقہ کھلا تھا۔ وہاں کوئی گلیاں نہیں تھیں جہاں میں نظروں سے اوجھل ہو سکتا۔

میں نے کہا۔ "آپ کے پاس اگر وارنٹ ہیں تو دکھائیں۔ اس طرح میں آپ کے ساتھ تھانے نہیں جاؤں گا۔"

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بھائی صاحب مجھے معلوم ہے کہ آپ بنگالی نہیں ہیں۔ آپ پنجابی ہیں اور ڈھاکے سے فرار ہو کر آئے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ آپ سیدھے سبھاؤ میرے ساتھ تھانے چلے چلیں نہیں تو مجبوراً مجھے تشدد سے کام لینا پڑے گا۔"

میں نے دل ہی دل میں ایک سکیم بنائی اور کہا۔

"چلئے۔ میں تیار ہوں۔ تھانے جاکر سوائے شرمندگی کے اور کچھ نہ ملے گا آپ کو۔"

وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر واپس چل پڑا۔ مجھے معلوم تھا کہ تھانہ اس علاقے کا جگت سینما کے پیچھے ایک تنگ سے بازار میں ہے۔ ہم جگت سینما کے قریب آگئے۔ وہ اس طرح میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا کہ میں بھاگ نہ سکتا تھا۔ لیکن اب میری سکیم پر عمل کرنے کا وقت آگیا تھا۔ تھانہ دو قدم کے فاصلے پر تھا۔ موت دو قدم کے فاصلے پر تھی مجھے معلوم تھا کہ اگر ایک بار میں تھانے میں داخل ہو گیا تو دنیا کی کوئی طاقت پھر مجھے وہاں سے زندہ سلامت باہر نہیں نکال سکے گی۔ میں نے دائیں جانب دیکھا۔ ایک چھوٹی سی گلی گھوم رہی تھی۔ سامنے تھانہ تھا۔ میں چلتے چلتے دائیں جانب ہو گیا۔ سی آئی ڈی والا بھی اس طرف ہو گیا۔ میں اس کے پیچھے آگیا۔ وہ پلٹ کر مجھے دیکھنے لگا۔ بس یہی وہ لمحہ تھا جب ایک بجلی سی چمکی اور میں نے پوری طاقت سے اسے دھکا دے کر زمین پر گرا دیا۔

اس کے گرتے ہی میں گلی کی طرف بھاگا۔ میں بجلی ایسی تیزی کے ساتھ گلی میں مڑ گیا۔ یہ گلی آگے جاکر بائیں جانب مڑ گئی تھی۔ میں بے تحاشا بھاگا جا رہا تھا۔ تین چار موڑ گھوم کر مجھے ایک جگہ گلی میں قبر بنی ہوئی نظر آئی۔ اس کے پیچھے شرینہہ کا درخت تھا ساتھ ہی ایک گھر کا دروازہ آدھا کھلا تھا میں بے دھڑک اس دروازے میں داخل ہو گیا اور پٹ بند کر کے

میں کھڑا ہانپنے لگا۔ پھر میں نے گلی میں کسی کے بھاگ کر آگے نکل جانے کی آواز سنی۔ میرا دشمن میری تلاش میں آگے نکل چکا تھا۔ اب میں نے اپنے ارد گرد نظر ڈالی۔ مکان کا صحن بالکل خالی تھا۔ کونے میں ایک پختہ سیڑھی اوپر کو جاتی ہے۔ اوپر چوبارہ تھا۔ جس کی کھڑکیاں بند تھیں۔ گھر میں شاید کوئی بھی نہیں تھا۔ صحن میں ایک طرف چولہا بنا تھا اور پمپ بھی لگا تھا۔ اب میرا باہر نکلنا ٹھیک نہیں تھا مجھے اس گھر میں پناہ حاصل کرنی تھی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ یہ گھر کس کا تھا؟

میں کچھ دیر دروازے کے ساتھ لگا کھڑا رہا۔ پھر میں نے چوبارے کا اوپر والا دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ اس کے بعد ایک دبلی پتلی، سانولی سی لڑکی جس نے گرم شال اوڑھ رکھی تھی ہاتھ میں ایلومینیم کی چائے کی کیتلی لئے نمودار ہوئی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہاتھ سے کیتلی گرتے گرتے بچی۔ مجھے اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ یہ مسلمان کا گھر ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

"بیٹی! مجھے اپنے والد صاحب یا بھائی جان سے ملا دو۔ میں مسلمان ہوں اور اس گھر کی پناہ لینے آیا ہوں۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور واپس بھاگ گئی۔ میں شش و پنج میں تھا کہ اوپر سیڑھی پر ایک بھاری بھرکم سفید ریش آدمی نمودار ہوا جس کے ہاتھ میں لٹھ تھا۔ اس نے کڑک دار آواز میں کہا۔

"کون ہو تم؟"

میں نے کہا۔ "میرے محترم! اگر آپ مجھے اتنی اجازت دیں کہ میں آپ کے سامنے اپنی دردناک کہانی بیان کر سکوں تو میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں گا۔ میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ میں ایک شریف مسلمان ہوں۔ اور اس وقت زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہوں۔"

میری باتوں نے اس شخص پر خاطر خواہ اثر کیا۔ اس نے وہیں سے اشارہ کر کے مجھے اوپر بلا لیا۔ میں نے احتیاطاً دروازے کی کنڈی چڑھا دی اور اوپر چوبارے میں آگیا۔ یہ ایک سیدھا سادہ کمرہ تھا۔ جس میں ایک پلنگ، ایک تخت اور دو کرسیاں رکھی تھیں۔ دیواروں

پر مکے مدینے کی فریم کی ہوئی تصویریں لگی تھیں۔ وہ لڑکی ایک طرف کھڑی مجھے حیرانی سے
تک رہی تھی۔ اس بزرگ نے مجھے بیٹھنے کو کہا اور لڑکی سے چائے لانے کی ہدایت کی۔ لڑکی
چلی گئی تو بزرگ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"ہاں بھائی صاحب! اب آپ بتائیے کیا ہے آپ کی درد بھری کہانی؟
کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں جاکر ختم ہوتی ہے اور یہ آپ کیوں شریف
لوگوں کے گھروں میں گھُسے چلے آرہے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "سب سے پہلی بات جو میں آپ کے گوش گذار کرنا چاہتا
ہوں یہ ہے کہ میں پاکستانی مسلمان ہوں اور ڈھاکے سے فرار ہو کر یہاں آرہا ہوں۔"

"ایں؟" بڑے میاں کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ وہ اپنی جگہ پر ہل گئے
اور بڑے غور سے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھنے لگے۔ پھر ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور
انہوں نے مجھے اُٹھ کر اپنے گلے سے لگا لیا۔ اُن کے اس دردمندانہ رویّے سے مجھے بے
حوصلہ ہؤا۔ پھر میں نے انہیں الف سے لے کر یے تک اپنی ساری کہانی سنا ڈالی۔ میری
سن کر وہ بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے لٹھ زمین پر مار کر کہا۔

"میاں! تم جب تک چاہو یہاں چھُپے رہو۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس گھر
میں آکر تمہیں گرفتار کرے۔ یہ میرے بیٹے کا گھر ہے۔ وہ دفتر گیا ہؤا ہے۔ یہ میری
بہو تھی جو تمہارے لئے چائے لینے گئی ہے۔"

بڑے میاں کی بہو کا نام آمنہ تھا۔ بڑی شریف لڑکی تھی۔ وہ چائے لے کر آگئی۔ بڑے
میاں اور میں چائے پینے لگے۔ انہوں نے ڈھاکے کے حالات کرید کرید کر مجھ سے پوچھے اور
بیچ بیچ میں ٹھنڈی آہیں بھی بھرتے رہے۔ انہیں ایک سچے مسلمان کی طرح سقوط ڈھاکہ کا
صدمہ ہؤا تھا۔ مجھے اندر ہی اندر یہ خدشہ بھی تھا کہ کہیں سی آئی ڈی والا یہ کچھ ابھی تک
گلی میں نہ منڈلا رہا ہو۔ بڑے میاں پر میں نے اپنے دل کی بات ظاہر کی تو وہ بولے۔

"ارے میاں! گھبراؤ نہیں۔ یہاں کسی کو شک نہیں ہو سکتا۔ میں ایک
مشہور کتب خانے میں خزانچی تھا۔ اب ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہا ہوں۔ محلے

میں میری بڑی ساکھ ہے۔ پولیس والے کبھی ادھر نہیں آئے۔ تم اطمینان سے
بیٹھو۔ ہاں یہ بتاؤ کہ تمہارے ارادے کیا ہیں؟"

میں نے انہیں بتایا کہ میں امرتسر جا رہا ہوں۔ وہاں ایک سمگلر کے نام میرے پاس
خط ہے۔ اس کی مدد سے بارڈر کراس کرنے کی کوشش کروں گا۔

بڑے میاں بولے "خدا کرے کہ تم اس میں کامیاب ہو جاؤ۔ ویسے تمہیں
ہوشیار رہنا ہوگا۔ آج کل کا زمانہ کسی پر بھروسہ کرنے کا زمانہ نہیں ہے۔ اور
پھر جس کے پاس تم جا رہے ہو وہ مسلمان بھی تو نہیں ہے۔"

بڑے میاں کا قیاس بالکل درست تھا۔ لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا
کسی نہ کسی پر تو مجھے بھروسہ کرنا ہی تھا۔ اور پھر میں نے یہ بھی سُن رکھا تھا کہ یہ سمگلر لوگ
بڑے بھروسے کے آدمی ہوتے ہیں۔ ان کا آپس میں بھی بڑا اچھا لین دین ہوتا ہے۔ جس کسی کو چاہیں
یہ بڑی حفاظت سے بارڈر کراس کر دیا کرتے ہیں۔

○

شام کو بڑے میاں کا لڑکا بھی آگیا۔ پہلے تو وہ مجھے دیکھ کر حیران ہؤا۔ پھر اُس کے والد نے
میرا تعارف کروایا اور اُسے بھی میری ساری کہانی مختصراً سنائی۔ اس کی باتوں سے محسوس ہؤا کہ
وہ کچھ گھبرا رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ سرکاری ملازم تھا۔ رات کا کھانا ہم نے مل کر کھایا۔ رات
کو دیر تک یہ لوگ مجھ سے پاکستان کی باتیں سنتے رہے اور سقوط ڈھاکہ پر افسوس کرتے رہے۔
میں نے اندازہ لگایا کہ بڑے میاں کا لڑکا میری آمد پر پریشان ہے۔ سونے کے لئے مجھے نچلے
کمرے میں چارپائی بچھا دی گئی۔ رات گذر گئی۔ صبح بڑے میاں کا بیٹا میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"بھائی صاحب! میں دل کا صاف آدمی ہوں۔ آپ سے کوئی لگی لپٹی نہیں
رکھنا چاہتا۔ بات یہ ہے کہ میں آپ کے یہاں رہنے سے پریشان ہو گیا ہوں۔ میں
ایک غریب ہیڈ کلرک ہوں۔ سرکاری ملازم ہوں۔ آپ تو چلے جائیں گے۔ اگر کسی
کو معلوم ہو گیا کہ آپ کو میں نے اپنے گھر میں پناہ دی ہے تو میرا سارا مستقبل تباہ
ہو جائے گا۔ اس لئے اگر آپ بُرا نہ مانیں تو جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جائیں۔

......مجھے یہ کہتے ہوئے بڑی شرم محسوس ہو رہی ہے۔ لیکن میں بے بس ہوں۔ مجبور ہوں۔ یہاں کے مسلمان پہلے ہی بھارتی حکومت کے عتاب میں ہیں۔ اب اگر انہیں معلوم ہوا کہ میں نے پاکستان کے ایک مفرور مسلمان کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی تو وہ مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے۔ اباجان نے جذباتی ہو کر آپ کو پناہ دے دی تھی بہر حال ایک دو روز تو شاید میں بھی آپ کی مدد کر دیتا۔ لیکن اس سے زیادہ آپ کی مدد کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔"

یہ بھارت میں رہنے والے ہر مسلمان کے دل کی آواز تھی۔ یہ نوجوان بالکل سچ کہہ رہا تھا یہ اس کا دل بول رہا تھا۔ ناراض ہونے کی بجائے مجھے اس کی حالت پر ترس آ رہا تھا۔ وہ واقعی مجبور تھا۔ بے بس تھا۔ میں نے کہا۔

"میرے بھائی! میں تمہاری پوزیشن کو بڑی اچھی طرح سے سمجھتا ہوں۔ تم کہتے ہو میں آج ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔ لیکن تم میرا صرف ایک کام کر دو۔ میرے لئے دلّی سے امرتسر تک کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ خرید کر لے آؤ اور یہ پتا کر آؤ کہ گاڑی کس وقت جاتی ہے۔ یہ لو ٹکٹ کے پیسے۔"

اُس نے ہاتھ پیچھے کھینچ کر کہا۔

"ایسا نہیں ہے۔ میں پیسے نہیں لوں گا۔ کم از کم اتنی مدد تو مجھے کر لینے دیں میں آج دفتر سے آتے ہوئے ساری معلومات حاصل کر کے آؤں گا۔ میرا خیال ہے کہ گاڑی پنجاب کی طرف شام کو جاتی ہے۔"

وہ دفتر چلا گیا۔ بڑے میاں نے مجھے بُلا کر پوچھا کہ اس کا بیٹا مجھے کیا کہہ رہا تھا۔ میں نے ٹال دیا اور کوئی بات بیان نہ کی۔ صرف اتنا کہا کہ میں آج شام جا رہا ہوں۔ اس نے تعجب کا کرتے ہوئے کہا کہ کہیں اس کے بیٹے نے تو مجھے جانے پر مجبور نہیں کیا؟ میں نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔ یہ میرے لئے آرام کا نہیں کا وقت ہے اور یہ کہ میں جلد از جلد اس ملک سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ بڑے میاں خاموش ہو گئے۔ ایسے لگتا تھا جیسے انہیں پتا چل گیا ہے کہ اُن کے بیٹے نے مجھ سے کیا باتیں کی ہیں۔

وہ بھی بے بس تھے۔ اپنے بیٹے کی مرضی کے خلاف وہ بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ میں سارا دن اس مکان میں، اس انمول پناہ گاہ میں بیٹھا اخبار اور رسالے پڑھتا رہا۔ دوپہر کو کھانا کھا کر لیٹ گیا۔ مگر نیند کوسوں دُور تھی۔ میری منزل بھی کوسوں دُور تھی، ہزاروں، لاکھوں میل دور تھی۔ خدا دن کب لائے گا جب میں اپنے وطن، اپنی پہلی اور آخری پناہ گاہ پاکستان کی سرزمین میں قدم رکھوں گا؟

کوئی تین بج رہے تھے کہ بڑے میاں کا لڑکا آ گیا۔ اُس نے مجھے ٹکٹ دے کر بتایا کہ پنجاب میل ٹھیک سوا پانچ بجے شام چھوٹ جاتی ہے۔ میں نے تیاری شروع کر دی۔ تیاری کیا کرنی تھی۔ ایک کمبل اور گرم کوٹ ان لوگوں نے مجھے سردی سے بچنے کے لئے دے دیا تھا۔ کمبل کو میں نے تہہ کر لیا۔ گرم پانی سے غسل کیا۔ چائے پی۔ سانولی بیٹی نے مجھے دو پراٹھے بنا کر ساتھ دیئے اب میں اس گھر سے نکلنے کی تیاری کرنے لگا۔ ٹھیک ساڑھے چار بجے میں نے بڑے میاں کو اس کے لڑکے اور ان کی بہو کو سلام کیا۔ ان کا شکریہ ادا کیا اور کواڑ کھول کر دروازے کے قریب کھڑا ہو گیا۔ بڑے میاں کا لڑکا باہر نکل گیا۔ اس نے گلی میں گھوم کر پھر دیکھا۔ وہاں کوئی بھی دوسرے محلے کا آدمی نہیں تھا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے میزبانوں کا شکریہ ادا کیا۔ انہیں خدا حافظ کہا اور گلی میں آ گیا۔

میں گلیوں گلی اُوپر سے ہوتا ہوا دوسری سمت کو ایک بازار میں نکل آیا۔ یہاں ایک ٹیکسی مجھے خالی مل گئی۔ اس کا ڈرائیور سکھ تھا۔ میں نے اُسے لیڈی ہارڈنگ لائبریری چلنے کو کہا میں قصداً اُسے یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں ریلوے اسٹیشن جا رہا ہوں اور لائبریری ریلوے سٹیشن کے سامنے ہی تھی۔ سکھ ڈرائیور نے راستے میں مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ بس اپنے دھیان میں گاڑی چلاتا رہا۔ لائبریری کے سامنے جا کر گاڑی رُک گئی۔ میں نے کرایہ ادا کیا اور نیچے اُتر آیا۔ میں یوں ہی جھوٹ موٹ لائبریری کے اندر چلا گیا۔ جب اس بات کی تسلی ہو گئی کہ ٹیکسی ڈرائیور دور نکل گیا ہو گا تو بڑی خاموشی سے لائبریری کی عمارت سے باہر نکلا اور ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ دلّی کا ریلوے سٹیشن بالکل ویسا ہی تھا۔ کہیں کہیں نئے بلاک تعمیر ہوئے تھے۔ باہر سے بناوٹ بالکل وہی تھی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ پلیٹ فارم پر بڑی رونق تھی ٹکٹ

میرے پاس موجود تھا۔ ریل پلیٹ فارم نمبر ۳ سے روانہ ہوتی تھی۔ میں وہاں آگیا۔ امرتسر جالندھر کی سمت جانے والی سواریاں وہاں گاڑی کا انتظار کر رہی تھی۔ ان میں زیادہ سواریاں سکھوں کی تھیں۔ ہندو بھی تھے۔ یہ پنجاب کے لوگ تھے۔ لیکن مجھے ان کے ساتھ اُردو یا بنگالی ہی بولنی تھی۔ مجھے یہی ظاہر کرنا تھا کہ میں بنگالی ہوں اور کاروبار کے سلسلے میں امرتسر کا دورہ کر رہا ہوں۔ میں پنجابی میں ان کے ساتھ بات نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے کہ مسلمان اپنی پنجابی سے فوراً پہچانا جاتا ہے اور بھارت کے پنجاب میں کوئی مسلمان نہیں تھا میری پنجابی سے اُن کو شک پڑ سکتا تھا کہ کہیں میں پاکستان کا جاسوس تو نہیں ہوں۔

ٹھیک پانچ بجے ریل گاڑی چھک چھک کرتی پلیٹ فارم نمبر ۳ میں داخل ہو گئی۔ یہ دس پندرہ منٹ لیٹ تھی۔ ہر شخص کو اپنی پڑ گئی۔ لوگ سامان اٹھا کر ڈبوں کی طرف بھاگنے لگے۔ میرے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ میں کسی بھی ڈبے میں سوار ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے سیکنڈ کلاس کے ساتھ والا نوکروں کا ڈبہ پسند کیا اور اس میں سوار ہو گیا۔ یہ ڈبہ اس لئے بھی موزوں تھا کہ یہاں عام طور پر افسروں کے بیرے سفر کرتے تھے اور وہ سوائے اپنے افسروں کی عادتوں اور بیگم کی برائیوں کے اور کسی موضوع پر بات نہیں کرتے۔ ان لوگوں کا سفر میں ساتھ میرے لئے نقصان دہ اور خطرناک نہیں تھا۔ مجھے کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر کونے میں جگہ مل گئی۔ یہاں پہلے ہی سے دو ہندوستانی بیرے بیٹھے تھے۔ میں نے اُن سے بنگالی میں بات شروع کی تو وہ ہنس کر بولے۔

"بابا ہم کو بنگلہ بھاشا نہیں آتی۔"

میں ہنس پڑا اور ٹوٹی پھوٹی اُردو میں بنگالیوں کی طرح باتیں کرنے لگا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں کلکتے میں رہتا ہوں اور اپنے بھائی کے ساتھ پلاسٹک کا کام کرتا ہوں اور امرتسر اس کام کی مارکیٹ معلوم کرنے جا رہا ہوں۔ ایک بیرا بولا۔

"اُدھر پنجاب میں بڑی مانگ ہے۔ ہمارا صاحب تو کہتا ہے آج کے زمانے میں ہر شے پلاسٹک کی ہو گئی ہے۔"

ہم اسی قسم کی باتیں کرتے رہے اور ریل کے انجن نے سیٹی بجا دی۔ گارڈ نے بھی سیٹی

بائی آخری وسل کے بعد ریل گاڑی شور مچاتی دلی کے ریلوے سٹیشن سے نکل کر باہر کھلے رڈ میں آ گئی اور امرتسر کی طرف روانہ ہو گئی۔ مجھے امرتسر کی طرف جاتے عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ میں اس شہر میں زندگی کے چھ سال بسر کر چکا تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے میں وہاں والد صاحب کے ساتھ سلولائیڈ کا کاروبار کرتا تھا۔ والد صاحب کی دکان ہال بازار میں مسجد خیر دین کے سامنے تھی۔ تب میری عمر بارہ برس کی تھی۔ ظاہر ہے اب مجھے وہاں کوئی بھی نہیں پہچان سکتا تھا۔ میں نے ویسے بھی تھوڑی داڑھی بڑھا لی تھی جیسی کہ بنگالی عام طور پر بڑھا لیا کرتے ہیں۔ گاڑی اڑی چلی جا رہی تھی۔

ساری رات گاڑی اپنا سفر کرتی رہی۔ دن چڑھا تو ہم پنجاب میں داخل ہو چکے تھے۔ راستے میں جانے کون سے سٹیشن پر گاڑی ایک گھنٹہ لیٹ ہو گئی۔ جالندھر کا ریلوے سٹیشن آ گیا۔ ہر طرف سکھ ہی سکھ تھے۔ یہاں سے گاڑی چلی تو اس نے بہت زیادہ رفتار پکڑ لی۔ مجھے ۱۹۴۷ء کے فسادات کا زمانہ یاد آ گیا۔ اس زمانے میں یہاں کھیتوں میں چاروں طرف مسلمانوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ مہاجرین کے قافلے بے یار و مددگار پاکستان کی طرف رواں تھے۔ راستے میں اُن پر جگہ جگہ حملے ہوتے تھے۔ چیخ و پکار مچتی اور حملہ آور ہندو سکھ انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ کر آگے نکل جاتے۔ مانانوالہ سٹیشن بھی گذر گیا۔ اب امرتسر شہر کے مضافات شروع ہو گئے تھے بائیں جانب کہیں کہیں کوٹھیاں اور مکان نظر آنے لگے۔ پھر شریف پورہ آ گیا جو کبھی امرتسری مسلمانوں کی بڑی طاقت در بستی تھی۔ عیدگاہ بھی گذر گئی۔ گاڑی اُونچے پل کے نیچے سے گذر کر امرتسر ریلوے سٹیشن کے اندر داخل ہو گئی۔

دن کے دس بجے کا وقت تھا۔ سردی اچھی خاصی تھی۔ دھوپ بھی نکلی ہوئی تھی۔ لیکن سرد ہوا چل رہی تھی۔ دوسرے مسافروں کے ساتھ میں بھی گاڑی سے اتر پڑا۔ ریلوے سٹیشن سے باہر آ کر ٹیکسی یا تانگہ لینے کی بجائے میں پیدل ہی شریف پورے کی طرف چل پڑا۔ مجھے کٹڑا مہاں سنگھ والے سیوا سنگھ کی دکان کی تلاش تھی جو وہاں ریڈیو کی دکان کرتا تھا۔ میں اُونچے پل پر سے گذر کر مسلم ہائی سکول کو جانے والی سڑک پر ہو لیا۔ (جو کبھی مسلم ہائی سکول تھا۔) یہاں بھی اب بڑا رش ہو گیا تھا۔ تانگے، سائیکل، رکشا اور پیدل لوگ آ جا رہے تھے۔ میری طرف

کسی نے بھی تعجب سے نہ دیکھا۔ میں ایک عام بنگالی ہندو کے لباس میں تھا۔ کالا بوٹ
پاجامہ اور گرم کوٹ، بغل میں کمبل لپٹا ہوا تھا۔ میں سگریٹ کا دھواں اڑاتا بظاہر بڑ
بے پرواہی سے چلا جا رہا تھا لیکن اندر سے بہت ہوشیار اور چوکنا تھا۔ مجھے کوئی نہیں د
رہا تھا لیکن میں ہر آتے جاتے کو پورے غور سے تک رہا تھا کہ کہیں کوئی سی آئی ڈی کا آد
تو میرے پیچھے نہیں لگ گیا۔

اس شہر میں سی آئی ڈی کے بہت آدمی عام لباس میں گھوم پھر رہے تھے۔ کیونکہ
بارڈر ٹاؤن تھا اور پاکستان کی سرحد یہاں سے سولہ سترہ میل کے فاصلے پر تھی۔ اب شہر ا
پورے کی آبادی شروع ہو گئی تھی۔ اس کا نام اب شاید سنگھ پورہ پڑ گیا تھا۔ وہی پرانے م
تھے۔ کئی جگہوں پر نئے مکان بھی بن گئے تھے۔ باہر کے رُخ پر جہاں کبھی ایک مکان بھی د
نہیں تھی۔ اب دکانوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ دکانوں کے سائن بورڈ گورمکھی میں لکھے
مسلم ہائی سکول کے گیٹ پر بھی گورمکھی کا بورڈ لگا تھا۔ ظاہر ہے اب یہ مسلم ہائی سکول نہیں
پاتھی گراؤنڈ میں بھی مارکیٹ بن گئی تھی۔ شریف پورے کے جی ٹی روڈ والے دروازے ک
آس پاس دکانیں ہی دکانیں تھیں۔ یہ تقریباً ساری دکانیں سکھوں کی تھیں۔ میں ریڈیو
دکان کی تلاش میں تھا۔ آخر ایک دکان پر مجھے بہت سے ریڈیو اور ٹرانسسٹر الماریوں
سجے ہوئے دکھائی دیئے۔ میں اس دکان میں داخل ہو گیا۔ ایک سکھ لڑکے نے مجھے ریڈیو د
شروع کر دیئے۔ میں نے اس سے سیوا سنگھ کے بارے میں پوچھا۔

میں ٹھیک دکان پر آیا تھا۔ یہ سیوا سنگھ کی دکان ہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ سیوا
ذرا ہال بازار تک گیا ہے ابھی واپس آ جائے گا۔ اُس نے مجھے کرسی دی۔ میں اس پر بیٹھ گ
دکان پر گورونانک اور گوروگوبند سنگھ کی تصویریں لگی تھی۔ ریڈیو اور ٹرانسسٹر الماریو
میں قرینے سے رکھے تھے۔ جاپانی عورتوں کے کیلنڈر بھی لگے تھے۔ سکھ لڑکا مجھ سے پوچھ
لگا کہ میں کہاں سے آیا ہوں؟ میں نے اُسے یوں ہی بتایا کہ دلی میں میری ریڈیو کی دکا
ہے۔ میں کچھ مال خریدنے امرتسر آیا ہوں۔ اس نے ساتھ والی دکان سے میرے لئے چا
منگوائی۔ میں چائے پینے لگا۔ دل ہی سوچ رہا تھا کہ کیا میں کبھی یہاں سے نکل کر لاہو

پہنچ سکوں گا؟ کیا یہ سکھ سیوا سنگھ مجھے بارڈر کراس کرا دے گا؟ میرا وطن پاکستان، میرا
شہر لاہور وہاں سے چند میلوں کے فاصلے پر تھا جہاں میرے ہم وطن، مجھ سے محبت کرنے
والے لوگ اور میرے پیارے بچے اور میری بیوی میری راہ دیکھ رہی تھی۔ وہ تو یہی
سمجھ بیٹھی ہو گی کہ میں کہیں مر کھپ گیا ہوں یا بھارتی فوج نے مجھے قیدی بنا لیا ہے۔ وہ
خون کے آنسو رو رہی ہو گی۔ مزاروں پر جا کر منتیں مانگ رہی ہو گی۔ میرے بچے مجھے
یاد کر کے اداس ہو جاتے ہوں گے۔ کاش! میرے پر نکل آتے اور میں اُڑ کر اپنے وطن پہنچ جاتا!

لیکن ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ میں انسان تھا۔ پرندہ نہیں تھا۔ مجھے تکلیفوں اور تجربوں
کی بھٹی سے نکل کر آگے بڑھنا تھا۔ چائے پی کر میں سگریٹ سلگانے لگا تو مجھے خیال آ گیا کہ یہ
سکھ کی دکان ہے اور سکھ سگریٹ نوشی کو پسند نہیں کرتے۔ میں نے ڈبیا جیب میں ہی رہنے
دی۔ اتنے میں ایک خوش پوش گرم سوٹ میں ملبوس صحت مند نوجوان سکھ دکان میں داخل
دکان میں داخل ہوا۔ اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔

"میں آپ کی کیا سیوا کر سکتا ہوں؟"

میں نے اس سے کہا۔

"میں سیوا سنگھ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"میں ہی سیوا سنگھ ہوں جناب! فرمایئے۔"

"کیا آپ کٹڑہ مہاں سنگھ میں رہتے ہیں؟"

"جی ہاں! آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟"

میں نے جیب سے خط نکال کر اُسے دے دیا۔ خط اس نے آدھا پڑھا تھا کہ مجھے اپنے
ساتھ دکان کے پیچھے لے گیا۔ اور پردہ آگے کر دیا۔ یہاں ایک پلنگ بچھا تھا۔ ریڈیو میز پر
رکھا تھا۔ اس نے مجھے پلنگ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود کرسی پر بیٹھ کر خط پڑھنے لگا۔ خط
پڑھ کر اس نے پھاڑ کر جلا دیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

"میرے یار نے مجھے بڑے مشکل کام کے لئے کہا ہے۔ مگر یہ کام کرنا بھی
ضرور ہو گا کیونکہ اوپر سے گنگولی کا حکم بھی ہے۔ خیر دیکھا جائے گا۔ پہلے آپ یہ

بتائیں کہ پیسے گئے کیا؟"

"شکریہ سردار جی! میں نے ابھی چائے پی ہے۔"

مجھے وہیں بیٹھنے کو کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ اس کے باہر جاتے ہی میرے دل میں وہم جاگ پڑا کہ وہ پولیس کو بلانے گیا ہے۔ اس وہم نے اتنی شدّت پکڑی کہ میں اُٹھ کر دکان میں آ گیا اور پھر باہر سڑک پر ٹہلنے لگا۔ سردار سیوا سنگھ کہیں بھی نہیں تھا۔ اس وقت مجھے سارا شہر دشمن معلوم ہو رہا تھا۔ میں جلدی سے دکان پر آ کر بیٹھ گیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا بس یہی خیال ستا رہا تھا کہ ابھی پولیس کی جیپ آئے گی اور مجھے گھیرا ڈال کر گرفتار کر لیا جائے گا۔ مجھے اتنی سردی میں بھی پسینہ آ گیا۔ سکھ لڑکے نے ریڈیو آن کر دیا۔ آواز آئی! "یہ ریڈیو پاکستان لاہور ہے۔"

میرے دل نے ایک آہ نکل گئی۔ یہ میرے شہر کی آواز تھی۔ میرے لوگوں کی آواز تھی۔ کیا میں کبھی لاہور پہنچ سکوں گا۔ کاش! میں اس شہر سے کبھی باہر نہ نکلتا۔ لاہور سے پنجابی فلمی گانے ہو رہے تھے۔ نور جہاں کی آواز پر سکھ جھوم رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس دکان سے بھاگ جانا چاہیئے۔ کیونکہ سیوا سنگھ ضرور پولیس کو خبر کرنے گیا ہے۔ آخر وہ میری دشمن قوم سے تعلق رکھتا ہے اُسے کیا پڑی ہے کہ میری خاطر اتنی مصیبت مول لیتا پھرے؟ وہ ضرور مجھے گرفتار کروا کر نیکنامی حاصل کرے گا۔ پولیس کے محکمے سے بہتر کارکردگی کا سرٹیفکیٹ لے گا۔ میں اپنی خدشوں میں گھرا ہوا تھا کہ مجھے سامنے سے سیوا سنگھ آتا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ ایک اور سکھ تھا۔ یہ نووارد سکھ ادھیڑ عمر کا موٹی توند والا تھا۔ ڈھیلی ڈھالی سفید پگڑی اس نے سر پر لپیٹ رکھی تھی۔ ہاتھ میں دو سونے کی انگوٹھیاں ضرور پہن رکھی تھی۔ سیوا سنگھ نے اشارے سے مجھے دکان کے پیچھے آنے کو کہا۔ میں اندر چلا گیا۔ نووارد سکھ کا نام لیشن سنگھ تھا۔ اُس نے مجھے سر سے پیر تک بڑے غور سے دیکھا اور بولا۔

"بھائی جی! بارڈر کراس کرانا آج کل بڑا مشکل ہے۔ کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ لیکن تمہاری جان جانے کا خطرہ بھی ہے۔ بارڈر پر فوج بہت گشت کرتی ہے۔ بارودی سُرنگیں بھی جگہ جگہ لگی ہیں۔ ہم خود مال لے کر نہیں جا رہے۔"

میں نے کہا۔ "آپ کی بڑی مہربانی ہو گی سردار جی! میرا بارڈر کراس کرنا بہت ضروری ہے۔"

"بھائی جی! ضروری تو ہے پر ہمیں بھی تو دیکھنا ہے کہ کہیں تمہیں بارڈر کراس کراتے کراتے خود ہی نہ پکڑے جائیں۔ یا اگلے سنسار نہ پہنچ جائیں۔ میں تمہیں خط لکھ دیتا ہوں۔ یہ خط لے کر اٹاری میں فوجا سنگھ ذیلدار سے ملو۔ وہ تمہیں ٹھیک ٹھیک بتائے گا کہ بارڈر کی پوزیشن کیا ہے۔"

ڈھیلی ڈھالی پگڑی والے سکھ نے مجھے خط لکھ کر دے دیا۔ اس سے زیادہ بات کرنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اٹاری کی طرف جانا کسی خطرے کا باعث بھی بن سکتا تھا۔ کیونکہ اُدھر بارڈر شروع ہو جاتا تھا اور وہاں سے سی آئی ڈی قدم قدم پر تھی۔ لیکن مجھے ضرور جانا تھا۔ یہ خطرہ مول لینا تھا۔ چنانچہ میں نے وقت ضائع نہیں کیا۔ دکان سے اُٹھ کر سیدھا ریلوے سٹیشن پر آیا۔ گاڑی اُدھر کوئی نہیں جا رہی تھی۔ وہیں سے مجھے ایک بس مل گئی۔ بس میں سوار ہو کر میں اٹاری پہنچ گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ کبھی یہ ایک بہت بڑا قصبہ ہوا کرتا تھا لیکن بارڈر کے قریب آ جانے کی وجہ سے اس کی اہمیت کم ہوتی چلی گئی۔ بڑے بڑے جاگیردار سکھ اپنی جائیدادیں فروخت کر کے امرتسر یا جالندھر کی طرف کوچ کر گئے۔ لاری اڈے پر اُتر کر میں ایک کھوکھے والے سکھ کی دکان پر جا کر کھڑا ہو گیا اور چائے کا ایک کپ طلب کیا۔ میں اُس سے فوجا سنگھ ذیلدار کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن ایسا کہتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ خُدا جانے وہ کتنا بڑا سمگلر ہو گا اور یہ کھوکھے والا مجھے کیا سمجھے گا۔ لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ چائے پیتے ہوئے میں نے دکاندار سے فوجا سنگھ کے بارے میں پوچھا۔ اس نے میری طرف گھور کر دیکھا اور کہا۔

"اسی بازار میں سے ہو کر آگے چلے جاؤ۔ داہنی طرف آموں کا ایک باغ آئے گا۔ اس باغ میں ایک پُرانی حویلی ہے۔ فوجا سنگھ اسی حویلی میں رہتا ہے۔"

چائے کے پیسے دے کر میں سیدھا آموں کے باغ میں آ گیا۔ یہاں بیچ میں ایک پُرانی حویلی کی اک منزلہ عمارت کھڑی تھی۔ باہر چارپائی پر دو سکھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ گردن گھما کر میری طرف تکنے لگے۔ میں قریب جا کر کھڑا ہو گیا ایک سکھ نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں؟ میں نے کہا کہ میں فوجا سنگھ ذیل دار سے ملنے آیا ہوں۔ اس سکھ نے بتایا کہ فوجا سنگھ وہی ہے۔ میں نے جیب سے خط نکال کر اُسے دے دیا۔ سردار نے خط پڑھ کر پہلے سکھوں کی طرح مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور کہا۔

"بیٹھ جاؤ بھائی صاحب! تو آپ ڈھاکے سے آئے ہیں؟"

یہ بات اس نے صاف آواز میں دوسرے سکھ کے سامنے بے دھڑک کہہ دی۔ میں کانپ گیا اور کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ اپنا ہی آدمی ہے۔"

پھر اُس نے مجھے بتایا کہ وہ مجھے بارڈر کراس کرا دے گا۔ مگر آج نہیں بلکہ کل۔ آج رات وہ مجھے اپنا مہمان بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔ سچی بات ہے میں اُن سے کچھ گھبرا گیا تھا میرا دل وہاں ٹھہرنے کو بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔ مجھے فضا میں خطرے کی بُو محسوس ہو رہی تھی۔ مگر انکار کی جُرأت نہ تھی۔ انکار کر کے میں جاتا بھی کہاں۔ میں نے تو اپنے پتے اُن کے حوالے کر دیئے تھے انہیں صاف صاف پتا چل گیا تھا کہ میں پاکستانی ہوں۔ مسلمان ہوں اور ڈھاکہ سے آ رہا ہوں۔ میں ایک طرح سے اُن کے قبضے میں تھا۔ بس دل میں ایک ہلکا سا خیال تھا، ایک ٹمٹماتی ہوئی اُمید تھی کہ یہ لوگ مجھے بارڈر کراس کرا دیں گے۔

میں نے رات بھر کے لئے وہاں ٹھہرنے کی ہامی بھر لی۔ رات کو انہوں نے مجھے دال پراٹھے کھلائے۔ ایک کوٹھری میں چارپائی ڈال کر بستر لحاف لگا دیا۔ سردی بہت تھی میں لحاف میں دبک کر سوچنے لگا کہ صبح کب ہو گی؟ یہ لوگ کب مجھے پاکستان کی سرحد میں داخل کرائیں گے؟ اتنا مجھے معلوم تھا کہ پاکستان کا بارڈر یہاں سے تھوڑی ہی دُور ہے یہاں شمال مغرب کی طرف دریائے راوی بہتا ہے یہی وہ دریا ہے جو آگے جا کر لاہور شہر میں داخل ہو جاتا ہے۔ شائد یہ لوگ بھی مجھے دریا کے ذریعے دریا پار کرانا چاہتے تھے مجھے کیا خبر تھی کہ انہوں نے خفیہ طور پر مجھے گرفتار کروانے کی سکیم تیار کر رکھی ہے اور پولیس

کو اطلاع دینے کے لئے ایک آدمی روانہ بھی کر دیا ہے۔

ایک بات میں نے خاص طور پر محسوس کی تھی کہ جب سے میں ڈھاکہ سے فرار ہوا تھا میرے اندر خطرے کو کچھ وقت پہلے بھانپ لینے کی چھٹی حس پیدا ہو گئی تھی۔ خطرے کو قریب آتے دیکھ کر میں غیر شعوری طور پر بے چین سا ہو جاتا تھا۔ اس رات بھی ایسا ہی ہوا۔ رات کا پہلا حصہ گذر چکا تھا۔ یہی کوئی دس ساڑھے دس بجے کا وقت ہو گا میں کوٹھڑی میں خاموش بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ خدا کرے یہ آخری مرحلہ بھی خیر و عافیت سے گذر جائے۔ طاق میں مٹی کے تیل کا لیمپ جل رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ میری آنکھوں میں میری بیوی اور بچوں کی شکلیں گھوم رہی تھیں۔ میں اُن کی یاد میں بے حد سوگوار تھا کہ اچانک میں نے فضا میں خطرے کی بُو محسوس کی۔ میں نے جلدی سے سگریٹ بجھا دیا اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔

حویلی کے عقبی حصّے کی جانب سے کچھ لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دل نے کہا کہ اس کوٹھڑی سے باہر نکل جاؤ۔ میں نے تیزی سے لحاف پرے پھینک دیا۔ کوٹ پہنا۔ کمبل وہیں چھوڑا اور جلدی سے کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ سردی بہت شدید تھی۔ باہر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ حویلی کی طرف سے آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں لیکن خطرے کی بو تیز ہو گئی تھی۔ ضرور کوئی طوفان آنے والا تھا۔ میں نے ایک دم وہاں سے ایک طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دور جا کر مجھے احساس ہوا کہ میں کہیں غلط سمت تو نہیں بھاگ رہا؟ پھر کیا کروں؟ مجھے اپنے پیچھے لوگوں کی اُونچی اُونچی آوازیں سنائی دی۔ قریب ہی شیشم کا ایک گنجان درخت تھا۔ میں اس پر چڑھ گیا اور دور جا کر شاخوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

اب مجھے لوگوں کی آوازیں صاف سنائی دینے لگیں۔ کوئی دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ بھاگ کر نہیں جا سکتا۔ کہاں جائے گا؟ ہم اُسے گرفتار کر کے رہیں گے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ پولیس کے سپاہی تھے۔ وہ میرے درخت کے نیچے سے باتیں کرتے مجھے تلاش کرتے آگے نکل گئے۔ میں بُری طرح پھنس گیا تھا۔ اب خدا کی رحمت ہی مجھے دشمن کے چنگل سے بچا سکتی تھی۔ میرے چاروں طرف دشمن ہی دشمن تھے۔ اس سرزمین پر سوائے اس درخت کے

میرا کوئی اور دوست نہ تھا۔ اس درخت نے مجھے وقتی طور پر پناہ دے رکھی تھی۔ رات کے اندھیرے میں میں کسی کو دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔ لیکن دن کا اُجالا پھیلتے ہی لوگ ضرور مجھے دیکھ لیں گے اس خیال سے میرا خون خشک ہو گیا۔ بھارتی پولیس کے عقوبت خانے پھانسی کا پھندا اور اذیت ناک موت میری آنکھوں کے آگے گھوم گئی۔ میری بیوی بچوں کی شکلیں کہیں دُور..... بہت دُور جا کر خلاؤں میں کھو گئیں۔

کوئی پندرہ منٹ کے بعد پھر وہی آوازیں سنائی دیں۔ سپاہی واپس آرہے تھے۔ میرے درخت کے قریب سے گذرے تو مجھے ان کے جملے صاف سنائی دیئے۔ ایک کہہ رہا تھا۔

"ضرور یہ کوئی بہت خطرناک جاسوس ہے اور ہماری حکومت کے راز لے کر واپس پاکستان جا رہا ہے۔"

دوسرے نے کہا "وہ بچ کر نہیں جا سکتا سردار جی! ہم نے بارڈر پولیس کو خبردار کر دیا ہے۔ اگر وہ اس طرف گیا ہے تو ضرور پکڑا جائے گا۔ کیونکہ وہاں بارڈر پولیس گشت کر رہی ہے۔"

وہ لوگ واپس حویلی کی طرف چلے گئے۔ ان کی باتوں سے مجھے اس بات کا ضرور علم ہو گیا کہ بارڈر اسی طرف ہے جدھر میں بھاگا تھا اور یہ کہ بارڈر زیادہ دور نہیں ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اب مجھے ہمت اور دلیری سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ ہمت ہارنے اور گھبرانے سے میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو سکتا تھا۔ میں نے سوچنا شروع کیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ دل نے کہا کہ ابھی رات کے اندھیرے میں یہاں سے نکل چلو۔ دن نکل آیا تو تمہارا پکڑا جانا ایک قدرتی بات ہے۔ کیونکہ صبح کو ساری پولیس تمہاری تلاش میں ادھر آ جائے گی۔ میں خدا کا نام لے کر درخت پر سے نیچے اُتر آیا اور اندازہ لگا کر بارڈر کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

یہاں اب کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ یہ کماد کے اُونچے اُونچے کھیت تھے۔ میں تیز قدم اٹھاتا کھیتوں کے ساتھ ساتھ پگڈنڈی پر چلتا چلا گیا۔ ایک جگہ کھیتوں میں مجھے ایک چارپائی نظر آئی جس پر کوئی شخص لحاف اوڑھے سو رہا تھا۔ میں اس سے دور ہٹ کر گذر گیا۔

رات اندھیری تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ چاندنی نہیں تھی وگرنہ میں کھیتوں میں چلتا ہؤا دور سے دیکھا جا سکتا تھا۔ میں کتنے ہی کھیتوں میں سے گذر گیا۔ اب کچھ ایسے کھیت شروع ہو گئے جہاں شاید سبزیاں اُگی تھیں۔ میرا پاجامہ پنڈلیوں تک شبنم سے بھر گیا تھا۔ لیکن مجھے ایک پل کے لئے سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ تیز تیز چلنے سے میرا خون گرم ہو گیا تھا۔ کھیتوں کا سلسلہ ختم ہؤا تو سرکنڈوں کی جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اُونچے اُونچے سرکنڈے جگہ جگہ اُگے ہوئے تھے۔ میں اندازے سے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں بارڈر کی طرف جا رہا ہوں یا دشمن کے کسی گاؤں یا مورچے کی طرف چلا جا رہا ہوں۔

سردیوں کا آسمان تاروں سے بھرا چمک رہا تھا۔ یہی آسمان لاہور..... میرے وطن میں بھی ستاروں کو لے کر چمک رہا ہو گا۔ میرے بیوی بچے سو رہے ہوں گے۔ اُنہیں کیا معلوم کہ اس وقت میں زندگی اور موت کی کش مکش میں آگ کا دریا عبور کر رہا ہوں۔ سرکنڈوں کے قریب سے گذرتے ہوئے اچانک مجھے گھوڑوں کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے سرکنڈوں کے اندر گھس کر چھپ گیا۔ گھوڑوں کی ٹاپ قریب آتی گئی۔ میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ یہ سکھ تھے جنہوں نے بارڈر پولیس کی وردی پہن رکھی تھی۔ گلے میں سٹین گنیں لٹک رہی تھیں۔ وہ آپس میں کسی ایسے شخص کے بارے میں بات کر رہے تھے جس کے بارے میں انہیں خبر ملی ہو کہ وہ خطرناک جاسوس ہے اور بھاگ رہا ہے۔

ظاہر ہے یہ سوائے میرے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ سکھ بارڈر پولیس والے اچانک رک گئے۔ ایک بلند آواز سے کہا۔

"اوئے اوہ بھاگ کر بارڈر کراس نہیں کر سکتا۔"

"آگے تو جگہ جگہ بارودی سرنگیں بچھی ہیں۔"

دوسرے نے کہا۔ "مر جائے گا اپنے آپ ہی......"

ایک نے کہا "کہیں وہ ان سرکنڈوں میں تو نہیں چھپا ہوا؟"

اس جملے کے ساتھ ہی میں سُن ہو کر رہ گیا ہے۔ اب مجھے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ موت میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے ایک دم سے اپنا سانس روک لیا۔ ایک سپاہی سرکنڈوں کی جھاڑیوں کی طرف بڑھا۔ دوسرے نے وہیں سے آواز دی۔

"اوئے یہاں کہاں آجائے گا وہ ماں کا یار.....

چل اگے چلئے۔ ابھی کتنی گشت باقی ہے۔"

جن سرکنڈوں میں میں چھپا ہوا تھا اس کے قریب آیا ہوا بارڈر پولیس کا سکھ واپس چلا گیا موت میرے قریب...... بالکل قریب آکر واپس چلی گئی۔ میں دم سادھے سرکنڈوں میں سرکنڈا بنا کر بیٹھا تھا۔ میری آنکھیں بند تھیں۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو دونوں سکھ گھوڑوں کو آگے بڑھا چکے تھے۔ میں نے یوں اطمینان کا سانس لیا۔ جیسے پانی کے اندر لمبی ڈبکی مارنے کے بعد باہر نکلا ہوں۔ میں دیر تک انہی جھاڑیوں میں دبکا بیٹھا رہا۔ جب گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز کافی دور چلی گئی تو میں سرکنڈوں میں سے باہر نکل آیا۔ میں کچھ دیر وہاں چپ چاپ کھڑا رہا۔ بارڈر پولیس کے سکھ سپاہی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ آگے بارودی سرنگوں کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آگے جانا موت کو آواز دینے کے برابر تھا۔ پھر کیا کروں؟ واپس جانا بھی موت کے کنوئیں میں چھلانگ لگانے کے برابر تھا۔

مجھے آگے جانا تھا۔ آگے بارودی سرنگیں تھیں۔ لیکن اس کے بعد میرا پیارا وطن تھا۔ پاک تھا۔ لاہور تھا۔ میری بیوی اور بچوں کے چہرے تھے جو مجھے ملنے کو بیتاب تھے۔ مجھے بارو سرنگوں میں سے بچ کر نکلنا تھا۔ مجھے اس قسم کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے اللہ کا نام اور آگے روانہ ہوگیا۔ میں نے اتنا ضرور کیا کہ سامنے چلنے کی بجائے دائیں جانب کو ہو کر سرک عبور کرنے لگا۔ اب رات کا پچھلا پہر شروع ہو چکا تھا۔ آسمان پر مشرق کی طرف نیلی نیلی روش پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر میں سورج کا اجالا پھیلنے والا تھا۔ دن کی روشنی میرے لئے انتہائی ہلاکت کا باعث بن سکتی تھی۔ مجھے صبح ہونے سے پہلے پہلے بارڈر کراس کرنا تھا۔ میں نے پاگلوں کی طرح فیصلہ کر لیا تھا کہ چاہے بارودی سرنگوں میں گھر کر مرجاؤں لیکن بھار سیکورٹی فورس کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ خدا میرے ساتھ ہے۔ وہ مجھ پر ضرور اپنا کرم کرے گا۔ وہ ضرور میری رہنمائی کرے گا۔ اس نے جگہ جگہ مجھے موت کے منہ سے بچایا ہے۔ وہ یہاں سے بھی مجھے بچا کر نکال لے جائے گا۔

مجھے دریائے راوی کی تلاش تھی۔ یہی دریا میری نجات کا وسیلہ تھا۔ اگر کسی طر

ے میں دریا کے کنارے پہنچ جاؤں تو اس میں سے ہو کر میں پاکستان کے علاقے میں داخل ہو تا تھا۔ میرا خیال تھا کہ دریا پانی سے لبالب بھرا ہوا ہوگا اور میں اس میں تیر کر آگے نکل جاؤں گا یہ میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ سردیوں کے موسم میں دریا خشک ہو جاتا ہے۔ اور شک دریا کا مطلب یہ تھا کہ وہاں بھی بھارت کی سیکورٹی فورس کے سپاہی گشت کر ے ہوں گے۔ میں چلتا چلا گیا۔ اب مشرق میں دن کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ میرے اردگرد اڑیاں، سرکنڈے اور دُور دُور تک بے آباد زمین نظر آنے لگی تھی۔ میں پھونک پھونک کر دم اٹھا رہا تھا۔ مجھے ہر قدم پر گمان ہوتا کہ کہیں میرا پاؤں کسی بارودی سُرنگ پر نہ پڑ ائے۔ پھر ایک دھماکہ ہوتا اور میرے جسم کے پرخچے اڑ جاتے۔ مشرق سے سورج نکل آیا۔ اروں طرف اس کی روشنی پھیل گئی۔ میں محتاط ہو گیا۔ میں جھک کر سرکنڈوں کے پیچھے سے کر چلنے لگا۔ میں تھک بھی گیا تھا اور مجھے پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔

لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں دریا کی جستجو میں تھا۔ اچانک بھیانک دھماکہ ہوا ں زمین پر گر پڑا۔ مجھے یوں لگا۔ جیسے میرا پیر کسی بارودی سُرنگ پر آگیا ہے اور میرے م کے ٹکڑے ہوا میں اڑ گئے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ میں صحیح وسالم زمین پر پڑا تھا۔ ں کسی جگہ ہوا تھا۔ اب گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے لیٹے لیٹے سرکنڈوں کے ھے سے سر اُٹھا کر دیکھا۔ دُور چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں میں ایک جگہ سے دھواں اور گرد ہی تھی۔ یہاں کوئی بارودی سرنگ پھٹی تھی۔ ظاہر ہے اس پر کسی کا پاؤں آگیا ہوگا۔ یہ ائے کسی سمگلر کے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ بارڈر فورس کے سپاہی کبھی اس علاقے نہیں جاتے جہاں بارودی سرنگیں دبائی گئی ہوں۔ اگر جانا بھی پڑے تو انہیں معلوم ا کہ محفوظ راستہ کون سا ہے۔

فائرنگ کی آواز میرے اور قریب آرہی تھی۔ میں نے سرکنڈوں میں چھلانگ لگادی ر دم سادھے لاش کی طرح لیٹ گیا۔ گھوڑے دوڑتے ہوئے میرے قریب سے گذر سی نے اونچی آواز میں پنجابی زبان میں کہا کہ اس کے ساتھی کو پکڑلو۔ وہ بھاگنے پائے اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک سمگلر مر گیا تھا اور اس کا ساتھی بھاگ نکلا تھا۔

میں دیر تک سرکنڈوں میں اپنے آپ کو چھپائے پڑا رہا۔ سورج اب میرے سر کے اُوپر آ گیا تھا۔ جب کافی دیر ہو گئی اور فائرنگ کی آواز بھی رک گئی تو میں خدا کا نام لے کر سرکنڈوں میں سے باہر نکال کر دائیں بائیں دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ بنجر علاقہ بھی نہیں تھا۔ بنجر علاقہ دور تک ویران تھا اور چھوٹی جھاڑیوں سے پٹا پڑا تھا۔ میں نے بڑی ہوشیاری سے چھُپ چھُپ کر ایک طرف چلنا شروع کر دیا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں گھبرا گیا تھا اور مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں۔ اب میں اس قدر پریشان تھا کہ اپنی زندگی سے نا امید ہو گیا تھا۔ اور اس بات کے لئے بھی تیار تھا کہ دشمن کے سپاہی مجھے گرفتار کر لیں۔

اچانک مجھے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا۔ مجھ سے کوئی دس قدم کے فاصلے پر ایک خستہ حال دیہاتی کھڑا میری طرف حیرت کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ ایک پل کے لئے ہم دونوں بُت بن کر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے ایک بات سے ہم دونوں کو تسلی ہوئی تھی کہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی سکھ نہیں تھا اور نہ ہی بارڈر پولیس کا آدمی تھا۔ میں نے اشارے سے اس دیہاتی کو اپنے قریب بلایا۔ وہ جھکتا ہوا میرے پاس آ گیا اور اس نے اشارے سے مجھے جھک جانے کو کہا۔ ہم دونوں ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ گئے۔ اس نے منہ میرے کان کے قریب لا کر سرگوشی میں پوچھا۔

"تم کون سا مال لے کر بارڈر کراس کر رہے تھے؟ میرا تو ساتھی مارا گیا ہے۔"

وہ مجھے سمگلر سمجھ کر رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں مال لے کر نہیں جا رہا۔ بلکہ ویسے ہی پاکستان جا رہا ہوں۔ وہ بڑا حیران ہوا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں؟ میں نے اُسے بتایا کہ میں ڈھاکہ سے فرار ہو کر یہاں تک آیا ہوں اور اب بارڈر کراس کرنا چاہتا ہوں یہ معلوم ہونے پر کہ میں مسلمان ہوں اور ڈھاکہ سے مصیبتیں سہتا یہاں تک پہنچا ہوں۔ وہ بڑا متاثر ہوا۔ وہ بھی مسلمان تھا لیکن سمگلر تھا اور سکھ سمگلروں سے مل کر اپنے ساتھی کے ہمراہ سمگلنگ کرتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں بڑے غلط راستے پر جا رہا تھا۔ اگر ایک فرلانگ اور آگے نکل جاتا تو کسی نہ کسی بارودی سُرنگ سے ٹکرا کر میرا بھی وہی حشر ہوتا جو اس کے اتھی کا ہوا ہے۔ پھر اس نے میرے کان میں کہا۔

"میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ میں بھی بارڈر کراس کر رہا ہوں۔ خبردار! ذرا بھی اِدھر اُدھر نہ ہونا۔ میرا ساتھی نیا نیا سمگلر بنا تھا۔ یہ اس کا پہلا پھیرا تھا۔ میرے منع کرنے کے باوجود وہ خطرناک علاقے میں نکل گیا۔"

میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

"کیا ہم ابھی تک بھارت کے علاقے میں ہیں۔"

"ہاں! یہ سارا علاقہ بھارت کا علاقہ ہے۔ اس کے آگے بارودی سُرنگیں بچھی ہیں۔ پیچھے بھارتی فوجوں کے مورچے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ تم فوجوں کے مورچوں سے بچ کر یہاں تک کیسے آ گئے۔ بہرحال تم خوش قسمت ہو۔ اب میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔"

وہ زمین پر جھاڑیوں میں رینگنے لگا۔ میں بھی رینگتے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑا۔ کوئی بن ایک فرلانگ جھاڑیوں میں رینگنے کے بعد اس نے ہاتھ سے مجھے رُک جانے کا اشارہ یا۔ پھر وہ ایک درخت کے پیچھے ہو گیا۔ میں نے بھی درخت کی آڑ لے لی۔ تھوڑی دیر بعد بھارتی پولیس کا ایک دستہ ہمارے سامنے سے گھوڑوں پر سوار تیزی سے گزر گیا۔ ب دستہ دور چلا گیا تو میرے ساتھی نے آہستہ سے کہا۔

"ضرور یہ لوگ تمہاری تلاش میں ہیں۔ وگرنہ یہاں کبھی بھارتی پولیس کا دستہ نہیں دیکھا گیا۔ ہمیں یہاں کسی محفوظ جگہ چھپ کر رات ہونے کا انتظار کرنا ہو گا۔ ہم دن کی روشنی میں اب بارڈر کراس نہیں کر سکتے۔ یہاں بارڈر فورس کے علاوہ پولیس کے دستے بھی گشت کر رہے ہیں۔"

ہم ایک جگہ گھنی جھاڑیوں میں جا کر چھپ گئے۔ بھوک اور پیاس سے میرا بُرا ال ہو رہا تھا۔ میرے ساتھی نے جیب میں سے خشک روٹی کا ٹکڑا نکال کر مجھے دے دیا سے میں نے کھا لیا۔ روٹی کھانے کے بعد پیاس کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ لیکن وہاں پانی ہیں نہیں تھا۔ اس نے کہا:

"تمہیں پانی کے لئے اندھیرا ہونے تک انتظار کرنا پڑے گا یہاں سے دریا دو میل کے فاصلے پر ہے۔ ہم اندھیرا ہوتے ہی دریا کی طرف چل پڑیں گے۔ دریا سوکھا ہوا ہے۔ پھر بھی کہیں کہیں پانی جمع ہے۔ تم اس سے اپنی پیاس بجھا سکتے ہو۔"

خدا خدا کر کے دوپہر ڈھلی۔ شام ہوئی اور پھر چاروں طرف رات کے سائے پھیل گئے۔ جھاڑیوں میں جھینگر بولنے لگے۔ میرے ساتھی نے آہستہ سے کہا

"چلو! اب کوچ کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ میرے پیچھے پیچھے جھک کر چلتے ہوئے چلے آؤ۔ خبردار کمر ذرا سی دیر کے لئے بھی سیدھی نہ کرنا۔ نہیں تو کسی نہ کسی طرف سے گولی آ کر تمہیں ٹھنڈا کر دے گی۔ میں کئی بار یہاں سے بارڈر کراس کر چکا ہوں۔"

میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا اور اس کے پیچھے پیچھے جھکا جھکا چل پڑا۔ کوئی میل بھر چلنے کے بعد میں تھک گیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں تھک گیا ہوں اور اب مجھ سے نہیں چلا جاتا وہ رُک گیا۔ اور زمین پر بیٹھ گیا۔ میں بھی اس کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ کمر سیدھی کی تو یوں لگا جیسے وہ اکڑ گئی ہو۔ کوئی آدھ گھنٹہ آرام کرنے کے بعد ہم پھر آگے چل پڑے۔ میں نے چلتے چلتے اُس سے پوچھا۔

"ابھی ہمیں کتنی دور اور اسی طرح چلنا ہو گا؟"

اس نے کہا۔ "بس دریا تھوڑی دور رہ گیا ہے۔"

آخر خدا نے میری بھی سُن لی۔ دریا کا کنارہ آ گیا۔ یہاں دریا کا پاٹ کافی چوڑا تھا۔ پانی کہیں بھی نہیں تھا۔ ستاروں کی دھیمی دھیمی روشنی میں دریا کی ریت دُور تک نظر آ رہی تھی بیچ میں ایک جگہ پانی دکھائی دے رہا تھا۔ پیاس کے مارے میرے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے میرے ساتھی نے کہا۔

"خدا کے لئے بے صبرے مت ہو جانا۔ صبر سے کام لینا۔ اب لب بام دو ہاتھ رہ گیا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ منزل پر پہنچتے پہنچتے تم دشمن کی گولی کا نشانہ ہو جاؤ۔"

وہ مجھے ساتھ لے کر دریا کی ریت پر اتر گیا۔ دریا کی ریت کہیں سے خشک اور

کہیں سے گیلی تھی۔ کچھ دور تک ہم دریا کے کنارے کنارے نیچے کی طرف جھاڑیوں میں ہو کر چلتے رہے۔ کافی دور اوپر جا کر اس نے آہستہ سے کہا۔۔

"اب ہوشیار ہو جاؤ۔ یہ آخری مرحلہ ہے۔ یہاں سامنے دشمن کی فوجوں کے مورچے ہیں۔ اب ہمیں زمین پر رینگ کر دریا پار کرنا ہو گا۔ یہاں بھی بارودی سرنگیں بچھی ہیں۔ لیکن میں تمہیں اندازے سے اس راستے سے لے جاؤں گا جو بارودی سُرنگوں سے خالی ہے۔ بس تم خاموشی سے میرے پیچھے پیچھے چلے آنا۔"

میں نے سرگوشی میں پوچھا کہ آیا کوئی راستہ ایسا نہیں ہے جہاں بارودی سرنگیں نہ بچھی ہوں۔ اصل میں مجھے اس شخص کی قیادت پر بھروسہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے ابھی ابھی وہ اپنے ایک ساتھی کو موت کے گھاٹ اتروا چکا تھا۔ اُس نے کہا

"ایک راستہ ہے جو جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ مورچوں کے نیچے سے ہو کر جاتا ہے۔ لیکن وہ اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ تمہیں آنا ہے تو میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ میں جا رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے دریا کے پاٹ میں ریت پر رینگنا شروع کر دیا۔ جانے وہ کون سی طاقت تھی جو مجھے آگے جانے سے روک رہی تھی۔ میں نہ گیا۔ وہیں دریا کنارے جھاڑیوں میں لیٹا رہا۔ میرے سامنے وہ سمگلر دیہاتی دریا کی ریت پر اتر گیا۔ کچھ دور تک میں اندھیرے میں اسے کیچوے کی طرح رینگتا دیکھتا رہا۔ پھر وہ اندھیرے میں گم ہو گیا۔ اب میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ کیا مجھے دائیں جانب دشمن کے اُونچے مورچوں کے نیچے اُگی ہوئی جھاڑیوں میں سے ہو کر دریا پار کرنا چاہیئے؟ یا مجھے بھی خدا کا نام لے کر دریا میں اتر جانا چاہیئے۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا۔ کہ ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ زمین ہل گئی۔ میں زمین کے ساتھ چمٹ گیا۔ بارودی سُرنگ پھٹ گئی تھی اور وہ سمگلر بھک سے اڑ گیا تھا۔ اس وقت خوف سے میرے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے میں خود بھک سے اڑ گیا ہوں۔ دھماکے کے ساتھ ہی مورچوں میں سے دھڑا دھڑ فائر آنے لگا۔ اس فائر کا یہ فائدہ ہوا کہ میں نے اُن سارے

مورچوں کو دیکھ لیا جو دریا کے پاٹ میں ریت کے اُونچے ٹیلوں کے ساتھ ساتھ چلے گئے تھے۔کیونکہ آگ کے شرارے ایک ساتھ قطار کی شکل میں بلند ہو رہے تھے۔

قریب ہی ریت کا ایک گڑھا سا بن گیا تھا۔میں نے اس میں چھلانگ لگا دی۔کیونکہ ایک بار پھر میری طرف گھوڑے دوڑتے چلے آ رہے تھے۔بھارت کی بارڈر فورس کے سپاہی گھوڑے دوڑاتے گذر گئے۔وہ زور زور سے باتیں کرتے ہوئے ایک دوسرے کو خبردار کر رہے تھے۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ بارڈر پر سمگلروں کی بارڈر پولیس سے آنکھ مچولی جاری رہتی ہے۔سمگلر مر بھی جاتے ہیں اور نکل بھی جاتے ہیں۔میں چونکہ گڑھے میں چھپا ہوا تھا اور پھر رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا اس لئے مجھ پر کسی کی نظر نہ پڑی۔بارڈر پولیس اس لئے بھی مطمئن تھی کہ مفرور سمگلر بارڈر کراس کرتا ہوا مارا جا چکا تھا۔ان کے خیال میں ہی ایک سمگلر تھا جو باقی بچا تھا یہ لوگ گھوڑوں پر سوار واپس آئے اور میرے قریب سے گذر کر آگے نکل گئے۔

ایک بار پھر وہاں گہری خاموشی چھا گئی۔دشمن کی فائرنگ بھی رک گئی۔اس گڑھے میں اتفاق سے تھوڑا سا پانی جمع تھا۔میں نے بڑی بے صبری سے پانی پیا۔ٹھنڈے پانی نے میرے حواس کسی حد تک یکجا کر دیئے۔پانی صاف نہیں تھا۔لیکن ریت نے اُسے کافی حد تک صاف کر دیا تھا۔میں گڑھے میں لیٹا رہا اور سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ایک بات تو یقینی تھی کہ اگر مجھے بارڈر کراس کرنا ہے تو میں دریا میں اترنے کا خطرہ ہرگز ہرگز مول نہیں لے سکتا۔مجھے بھارتی فوج کے اونچے مورچوں کے نیچے سے ہو کر نکلنا ہو گا۔یہ بھی بڑی خطرناک بات تھی۔لیکن اگر میں زمین پر رینگ کر جھاڑیوں کے گھاس میں سے ہو کر نکلنے کی کوشش کروں گا تو کامیاب ہو سکتا تھا۔کم از کم ایک بات طے تھی کہ وہاں بارودی سرنگیں نہیں بچھی تھیں۔میرے پاس صرف آج کی رات باقی تھی۔

○

اور رات بڑی تیزی سے گذرتی چلی جا رہی تھی۔

آسمان پر ایک بار پھر ستاروں نے جھلملانا شروع کر دیا تھا۔شاید یہ میرا وہم تھا کہ مشرق کی طرف آسمان پر مجھے خواہ مخواہ صبح کی نیلی روشنی جھلکتی محسوس ہونے لگی تھی۔جیسے ابھی

کوئی دم میں صبح ہونے والی ہو۔پھر اچانک ساری فضا روشن ہو گئی۔جیسے دن چڑھ آیا ہو میں نے اپنا منہ چھپا لیا۔بھارتی فوج نے یہ روشنی کا راکٹ چھوڑا تھا۔تیز روشنی کے بعد وہاں ایک بار پھر گھپ اندھیرا چھا گیا۔میں اسی طرح بے حس و حرکت ریت کے گڑھے میں لیٹا رہا۔مجھ میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ میں اٹھ کر بھارتی مورچوں کے نیچے سے رینگ کر گذرتا۔میں لیٹے لیٹے خدا کو یاد کر کے دل ہی دل میں دعا مانگنے لگا کہ اس مصیبت سے نکل جاؤں اور اپنے پیارے وطن پاکستان کی زمین پر پہنچ جاؤں۔ان دو راتوں میں، میں نے بڑی بھیانک ذہنی اذیت اٹھائی تھی۔شاید میرے سر کے کچھ بال بھی سفید ہو گئے تھے۔ایک بار پھر چاروں طرف گہرا سناٹا طاری ہو گیا۔کسی طرف سے جھینگروں کے بولنے کی بھی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

وقت بڑی تیزی سے گذر رہا تھا۔یہ وقت میرے لئے بے حد قیمتی تھا۔اب میں اس مقام پر آ گیا تھا کہ واپس نہیں جا سکتا تھا۔آگے بھی موت تھی اور پیچھے بھی موت تھی۔آگے صرف اتنی امید تھی کہ شاید میں بھاگ کر کسی نہ کسی طرح بارڈر کراس کر کے پاکستان پہنچ جاؤں۔پیچھے تو میرے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔میں نے دل میں ایک دم سے فیصلہ کیا کہ مجھے اب اللہ کا نام لے کر اپنی منزل کی طرف چل پڑنا چاہیئے۔جو ہو گا دیکھا جائے گا۔رات آدھی سے زیادہ گذر گئی تھی۔اب تو سچ مچ مشرق کی طرف ہلکی ہلکی روشنی پھیلنے لگی تھی۔یہ بہت بڑا خطرے کا نشان تھا۔اگر دن چڑھ آیا تو میں ضرور پکڑا جاؤں گا اور پھر باقی ساری عمر بھارتی عقوبت خانوں میں زنجیروں میں جکڑا سِسک سِسک کر دم توڑوں گا۔اس سے بہتر ہے کہ یہاں سے نکل جانے کی کوشش کروں۔

میں نے آہستہ سے رینگنا شروع کر دیا۔میں گڑھے سے باہر نکل آیا۔اپنی سمت کا تعین میں کر چکا ہوں۔میں آگے بڑھتا چلا گیا۔کنارے کی ریت پر سے کیکڑے کی طرح میں دریا میں اُتر گیا۔خشک ریت پر آتے ہی میں نے اس سمت کنارے کے ساتھ ساتھ رینگنا شروع کیا جدھر بھارتی فوج کے مورچے تھے۔یہ مورچے اُونچے ٹیلے پر ساتھ ساتھ نیم دائرے کی شکل میں چلے گئے تھے۔اُس کے نیچے سرکنڈوں کی جھاڑیاں اُگی تھیں۔میں نے ان جھاڑیوں کی طرف

بڑھنا شروع کر دیا۔ کوئی آدھے گھنٹے میں میں ان مورچوں کے بالکل نیچے پہنچ گیا۔ میں بالکل چوہے کی چال چل رہا تھا۔ مجھے مورچوں میں بیٹھے بھارتی فوجیوں کی باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں ایک پل کے لئے رک گیا۔ اس کے بعد پھر آگے رینگنے لگا۔ آہستہ آہستہ رینگتے رینگتے میں پھر سات مورچوں کے نیچے سے گذر گیا۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ لیکن چونکہ میں خطرے کے بیچ میں پہنچ چکا تھا اس لئے اب پچھتانے یا واپس مڑنے کا سوال ہی نہیں تھا

آخر میں نے وہ نیم دائرہ عبور کر لیا جس پر بھارتی فوج کے مورچے تھے۔ مجھے تاروں کی مدھم روشنی میں دریا کا دوسرا کنارہ نظر آنے لگا۔ یہاں پانی کھڑا تھا۔ میں خدا کا نام لے کر پانی میں اتر گیا اور بیٹھ کر چلنے لگا۔ پانی بے حد ٹھنڈا تھا۔ سردی سے میرے دانت بجنے لگے۔ میں کنارے پر پہنچ گیا۔ یہاں جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ میں جھاڑیوں کا سہارا لے کر اوپر کنارے پہ آگیا۔ کنارے پر آتے ہی میں زمین پر بیٹھ گیا کیونکہ ایک دم سے فضا پھر روشن ہو گئی تھی۔ شائد بھارتی فوجیوں کو شک پڑ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دن چڑھ آیا اور مورچوں میں سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں نے گولیوں کی سرخ لکیریں اپنے اوپر سے گذرتی دیکھیں۔ موت میرے سر کے صرف ایک فٹ اوپر سے گذر رہی تھی۔ میں وہیں زمین پر لیٹا رہا۔ فائرنگ ذرا تھمی تو میں نے اٹھ کر بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا۔ میں ایک گڑھے میں گر پڑا۔ روشنی کا گولہ ایک بار پھر چڑھا۔ سارا علاقہ روشن ہو گیا۔ فائرنگ پھر سے شروع ہو گئی۔ میں اوندھے منہ زمین پر گر پڑا اور تیزی سے آگے کی طرف رینگنے لگا۔ فائرنگ ذرا رکی تو پھر اُٹھ کر بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا۔

سامنے ایک خشک نالہ آگیا۔ میں نے اس میں چھلانگ لگا دی۔ دوسرے کنارے پر چڑھ کر تیز تیز دوڑنے لگا۔ دوڑتا چلا گیا۔ دوڑتا چلا گیا۔ جیسے سارا بھارت، بھارت کے سارے لوگ میرے پیچھے دوڑ رہے ہوں۔ دوڑتے دوڑتے میں جب گرا تو کسی نے للکار کر مجھے ہینڈز اپ کرا لیا۔ اب مجھ پر غشی طاری ہو رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ دشمن آخر میرے سر پر پہنچ گیا۔ آخر اس نے مجھے گرفتار کر ہی لیا۔ چلو۔ اگر قسمت میں یہی لکھا تھا تو پھر کیا ہو سکتا ہے۔ میں اس قدر تھکن اور اذیت سے چور ہو گیا تھا کہ میں نے دشمن

کے ہاتھوں گرفتار ہو جانے پر بھی خدا کا شکر ادا کیا کہ اس بھاگ دوڑ اور مشکل کی پریشانی سے نجات ملی۔

پھر کسی نے مجھ پر جھک کر پوچھا۔ "کون ہو تم؟ اٹھو! ہمارے ساتھ چلو۔"

میں اٹھ نہیں سکتا تھا۔ میں بول بھی نہیں سکتا تھا۔ میرا جسم چور چور تھا۔ نہ اٹھنے کی ہمت تھی۔ نہ بولنے کی طاقت تھی۔ مجھے دھندلے دھندلے کچھ چہرے نظر آئے۔ یہ فوجی تھے۔ دو آدمیوں نے مجھے اٹھا لیا اور ڈولی ڈنڈا کر کے ایک طرف کو لے چلے۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

جب ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ میں پاک فوج کی قید میں ہوں۔ میں اسی وقت سجدے میں گر پڑا۔ اور میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ دو فوجی جوان میرے پاس آگئے میں نے انہیں اپنی ساری کہانی سنائی۔ انہوں نے مجھے بارڈر پولیس کے حوالے کر دیا۔ وہاں جب میں نے اپنے پاکستانی ہونے اور ڈھاکہ میں بزنس کرنے کا بین ثبوت بہم پہنچا دیا تو مجھے رہا کر دیا گیا۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ بیوی بچوں سے میری پہلی ملاقات کا منظر کیسا پُر مسرت اور الم انگیز تھا۔ ہم خوش بھی تھے اور آنکھوں سے آنسو بھی جاری تھے۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں ڈھاکے سے چل کر یہاں تک آیا ہوں۔ لیکن یہ ایک بڑی ہی دردناک حقیقت تھی۔ آج اس بات کو چھ برس گذر گئے ہیں۔ لیکن ان دنوں کا آج بھی خیال آتا ہے تو میں خود بھی حیران ہو جاتا ہوں کہ میں کس قدر خطرات کا سامنا کرتا ہوا اپنے پیارے وطن پاکستان واپس پہنچا۔ خدا کا شکر ہے کہ آج میں اپنے وطن میں بیوی بچوں کے ساتھ پُر سکون زندگی بسر کر رہا ہوں۔

چاند جنگل اور لڑکی

○ اندھیری رات، بارش اور ویران محل کے کھنڈر میں سے ایک دردناک آواز بلند ہوئی۔ جیسے کوئی بھٹکی ہوئی رُوح بین کر رہی ہو۔

○ بحری کپتان کی بھٹکتی ہوئی رُوح اور ایک حسین ترین امریکی لڑکی کی لازوال داستانِ محبّت۔

اے حمید

اس کتاب کی کہانی

آج سے پچیس برس پہلے کی بات ہے۔ میں ملک ملک، جنگل جنگل، دریا دریا گھومتا پھرتا دریائے ایراوتی کے کنارے ایک قدیم برمی قصبے کے قہوہ خانے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ صبح سے برسات کی جھڑی لگی تھی۔ یہ جنوب مشرقی ایشیا کی بارش تھی جو کئی کئی روز تک جاری رہتی ہے۔ میں جس قہوہ خانے میں بیٹھا تلخ اور تیز چائے پی رہا تھا وہ بانس کا بنا ہوا تھا اور اس کے دروازے کے بانس پر کیسری پھولوں والی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ میرے پاس میرا برمی دوست بیٹھا میرے ساتھ چائے پی رہا تھا۔ یہ شام کا وقت تھا، باہر اندھیرا ہو رہا تھا۔ دریا کی طرف سے مرطوب ہوا کے جھونکے آ رہے تھے ان جھونکوں میں دریا کے کنارے اُگے گھاس کی بُو تھی۔ میرے برمی دوست نے مجھے بتایا کہ یہاں سے تھوڑی دور جنگل میں کئی ہزار سال پُرانے راجہ کا محل ہے۔ جو اب کھنڈر بن چکا ہے۔ اس محل میں ایک مندر ہے، وہ بھی کھنڈر بن چکا ہے۔ کہتے ہیں کہ سنگ دل راجہ نے کسی بات پر ناراض ہو کر اپنی سب سے بڑھ کر خوب صورت اور نوجوان رانی کو اس مندر میں قتل کروا کر آگ میں پھنکوا دیا تھا۔ میں نے اپنے دوست سے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟ اس قسم کے قتل تو شاہی محلات میں ہوتے ہی آئے ہیں۔" اس نے سگریٹ سلگا کر کہا۔ "کہتے ہیں جس روز رات اندھیری ہو اور بارش بھی ہو رہی ہو تو اس مندر سے کسی لڑکی کے رونے، سسکیاں بھرنے اور کسی وقت بین کرنے کی دردانگیز آوازیں آتی ہیں۔"

میں اپنے بحری دوست کا منہ تکتا رہ گیا۔ کیا وہ سچ کہہ رہا تھا؟ مجھے یقین نہیں آ تھا۔ نوجوانی کا زمانہ تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ میں یہ مندر دیکھنا چاہتا ہوں، کیونکہ اتفاق سے بارش بھی ہو رہی ہے اور رات بھی اندھیری ہے۔ میرے اس خواہش پر وہ ڈر کر سمٹ گیا۔ اس نے کہا کہ وہ دریائے ایراوتی میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لے گا۔ لیکن پرانے آسیب زدہ مندر میں نہیں جائے گا۔ میں نے اسے اسی قہوہ خانے میں چھوڑا اور اس کی مخالفت کے باوجود اس آسیبی مندر کی طرف چل پڑا۔ قصبے سے ایک بس مجھے مل گئی جس نے مجھے راستے میں سڑک پر ایک جگہ اتار دیا۔ یہاں سے اس محل کے کھنڈر دو فرلانگ کے فاصلے پر تھے۔ بارش ہو رہی تھی۔ رات اندھیری تھی۔ کسی وقت بجلی بھی چمک جاتی تھی۔ آسمان بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے برساتی اوڑھ رکھی تھی۔ دل میں جوش تھا کہ مندر میں جا کر رانی کی بھٹکی ہوئی روح کی رونے کی آواز تو سنیں۔ آخر میں اس ویران کھنڈر میں پہنچ گیا۔ اس کھنڈر کو بارش والی رات کے آسیبی اندھیرے میں دیکھ کر ایک بار تو بھی کانپ اٹھا۔ دل نے کہا کہ اگر جان عزیز ہے تو برخوردار سیدھے سبھاؤ یہیں سے واپس چلے چلو، مگر روح کے بین سننے کا شوق بھی سر پر سوار تھا۔ میں بے دھڑک کھنڈر میں داخل ہو گیا اور چپکے سے ایک شکستہ محراب کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں اپنے آپ کو بالکل امریکی ایکٹر ہمفری بوگارٹ سمجھ رہا تھا جو کسی خفیہ مہم پر گھر سے نکلا ہو۔ میں نے قمیص کی جیب سے گیلا سگریٹ نکال کر اسی امریکی ایکٹر کی طرح سلگایا اور مندر کے ٹوٹے ہوئے دروازے کی طرف دیکھنے لگا جو میرے بالکل سامنے تھا۔ سچی بات یہ تھی کہ میں وہاں تک آ تو گیا تھا، لیکن اب مندر میں جاتے ہوئے میرا دل بھی گھبرا رہا تھا۔ بجلی چمکی، بادل گرجا اور بارش تیز ہونے لگی۔

اب میں کچھ ڈر گیا۔ دل نے کہا کہ بیٹا ابھی یہاں سے واپس ہو چلو، نہیں تو رانی کی بھٹکی ہوئی روح تو نہ آئے لیکن یہاں کہیں سے کوئی چڑیل نکل کر تمہیں ضرور ہڑپ کر لے گی۔ میں ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ مندر کی طرف سے مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھے میرا نام لے کر پکارا ہو۔ بچپن میں سُن رکھا تھا کہ چڑیلیں عام طور پر جان جاتی ہیں اور

جس انسان کو انہوں نے کھانا ہوتا ہے۔ اس کا پورا نام لے کر پیچھے سے آواز دیتی ہیں ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو۔ لیکن مجھے یوں لگا تھا جیسے میں نے اپنا پورا نام سنا ہو۔ اس کے ساتھ ہی اچانک کسی عورت کے رونے کی آواز آنے لگی۔ یہ آواز بارش کی آواز کے ساتھ مل گئی۔ میرے پیر پتھر بن گئے مجھ سے ہلا نہ جاتا تھا۔ اب بین کی آوازوں کے ساتھ ساتھ سسکیاں بھرنے کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں وہاں سے نہ بھاگا تو ایک پل کے اندر اندر دھڑام سے گروں گا اور مر جاؤں گا۔ میں نے پورا زور لگا کر جسم کو حرکت دی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ مجھے دُور تک پیچھے اس قسم کی آوازیں آتی رہیں جیسے کوئی عورت بار بار کہہ رہی ہو، "واپس آجاؤ میں اکیلی ہوں، واپس آجاؤ میں اکیلی ہوں۔"

پھر وہاں سے واپس کس طرح پہنچا یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ اس واقعہ کے چھ برس بعد میں ایک لائبریری میں آئرلینڈ کی لوک کہانیاں پڑھ رہا تھا کہ ایک کہانی پڑھتے پڑھتے رُک گیا۔ اس میں ایک ایسے بحری کپتان کی بھٹکی ہوئی روح کے حالات لکھے تھے جو سمندر کے کنارے ایک پرانے کھنڈر میں رہتی تھی۔ ایک غیر ملکی عورت وہاں جا کر آباد ہو گئی۔ روح نے اسے تنگ کرنا شروع کر دیا لیکن عورت بھی ہٹ کی پکی تھی۔ وہ پرانا محل چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ کپتان کی روح کو اس عورت سے پیار ہو گیا، لیکن یہ پیار زیادہ تک نہ چل سکا کیونکہ عورت اس روح سے شادی نہ کر سکتی تھی۔ عورت ایک مرد کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ اس نے اس مرد سے شادی کر لی۔ شادی کو چالیس برس گزر گئے اس کا خاوند مر کھپ گیا وہ بوڑھی ہو گئی۔ آخر ایک روز وہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ پھر کپتان کی روح نمودار ہوئی اور اس نے دونوں بازو پھیلا کر بوڑھی عورت کی جوان اور خوب صورت روح کو اپنے ساتھ لگا لیا اور اسے لے کر آسمان کی وسعتوں میں پرواز کر گئی۔ یہ کہانی مجھے بے حد اچھی لگی۔ اس کے بعد میں نے ایک ناول "گھوسٹ اینڈ مسز مینور۔" پڑھا۔ یہ ناول بھی اسی آئرش لوک کہانی سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا۔ پھر اس کی

فلم بھی دیکھی۔ حال ہی میں اسی لوک کہانی سے متاثر ہو کر امریکہ میں ایک ٹی وی سیریز بھی فلمائی گئی جسے لاہور ٹیلی ویژن پر "گھوسٹ اینڈ مسز مینور" کے نام سے دکھایا بھی جاتا رہا ہے۔ میں نے اس آئرش لوک کہانی کو سامنے رکھ کر اپنی زبان میں پوری داستان بیان کی ہے جس میں سارے واقعات اس کپتان کی روح کے ساتھ ساتھ کاغذ پر اُبھرتے چلے آتے ہیں۔ اُمید ہے قارئین اسے ضرور پسند کریں گے کیونکہ اس قسم کی آسیبی کہانیاں ہمارے وطن کی لوک داستانوں میں بھی ہمیں اکثر ملتی ہیں۔

(اے حمید)

گرین ہاؤس ایک عرصے سے ویران پڑا تھا۔

گرین ہاؤس ایک دو منزلہ مکان تھا جس کی ڈھلانی چھتوں کی سرخ سلیٹیں کئی جگہوں سے اکھڑ
ہلی تھیں۔ دوسری اور پہلی منزل کی لمبوتری کھڑکیوں پر اندر کی جانب جو بھاری پردے گرے تھے، ان
ا رنگ اتر گیا تھا۔ پہلی منزل کی کھڑکیوں کو جنگلی گلاب کی جھاڑیوں نے اس طرح سے ڈھانپ رکھا تھا
، باہر سے اندر کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ عمارت کا بڑا دروازہ لوہے کا تھا جس پر بھاری تالا پڑا تھا۔ پتھر
ں دہلیز جنگلی گھاس میں چھپ گئی تھی اور تالا زنگ آلود ہو چکا تھا۔ اس دو منزلہ ویران کوٹھی کے آتشدان
یک سو برس سے ٹھنڈے پڑے تھے۔ چھت پر اوپر کو اٹھے ہوئے دو کش خاموش تھے اور ان میں سے
ب کبھی دھواں اُٹھتا کسی نے نہ دیکھا تھا۔ یہ دو منزلہ کوٹھی چیڑھ کے گنجان درختوں میں گھری ہوئی تھی
ایداس لئے اس کا نام گرین ہاؤس پڑ گیا تھا، کیونکہ درختوں کی ٹھنڈی گھنی چھاؤں میں یہاں ہر وقت
ندھیرا چھایا رہتا تھا۔ کوٹھی کے اردگرد چار دیواری کھچی تھی۔ یہ اُونچی دیوار پُرانے سیاہ پتھر کی بنی تھی۔
ں پر جگہ جگہ سے گھاس باہر جھانک رہی تھی۔

جنوبی انگلستان کے ساحلی علاقے میں دو منزلہ کوٹھی سمندر کے کنارے بھورے رنگ کی چٹانوں
کے ساتھ گنجان درختوں میں ایک سو سال سے خاموش کھڑی تھی۔ سامنے ایک چھوٹی سی سڑک گذرتی
تھی جو گاؤں کو بڑے قصبے سے ملاتی تھی۔ گاؤں کے لوگ اس دو منزلہ کوٹھی گرین ہاؤس کی طرف آتے ہوئے
گھبراتے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ گرین ہاؤس میں کسی بحری جہاز کے کپتان کا بھوت رہتا تھا اور وہ اس
شخص کو ہلاک کر دیتا ہے جو گرین ہاؤس کے قریب جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس بھوت محل سے

بارے میں گاؤں کے لوگوں میں ایک سو سال سے طرح طرح کی دحشت ناک کہانیاں مشہور چلی آرہی تھیں۔ کہتے ہیں پچاس برس پہلے ایک بہادر نوجوان گرین ہاؤس میں رات کے وقت داخل ہو گیا شاید وہ اس نیّت سے گیا تھا کہ کوٹھی کے اندر سے قیمتی سامان چوری کر کے لے جائے۔ اس نے گرین ہاؤس کی عقبی دیوار سے اندر باغ میں چھلانگ لگائی اور خود رَو جھاڑیوں کو ہٹاتا کوٹھی کی ایک کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔

کھڑکی کھول کر وہ اندر ڈرائینگ روم میں آگیا۔ یہاں وکٹورین عہد کا بھاری فرنیچر سبز رنگ کی بڑی چادروں سے ڈھکا پڑا تھا۔ سامنے کارنس پر پرانی طرز کی ایک بحری جہاز کی گھڑی پڑی تھی جس کا خول سونے کا تھا۔ کارنس کے اوپر دیوار کے ساتھ بحری جہاز کے کپتان کی تصویر لگی تھی۔ دو منزلہ کوٹھی گرین ہاؤس کبھی کپتان کی ملکیت تھی۔ وہ اکیلا اس کوٹھی میں رہا کرتا تھا۔ اس کی نہ کوئی بیوی تھی اور نہ بچے تھے۔ وہ مہینے میں بیس دن سمندروں میں رہتا۔ ہفتے ڈیڑھ ہفتے کے لئے اپنے سمندری جہاز لے کر آتا اور اس کوٹھی میں قیام کرتا۔ گاؤں میں وہ کسی سے نہ ملتا۔ کسی کو اس کی پراسرار کوٹھی میں آنے کی اجازت نہ تھی۔ کسی کو آج تک معلوم نہ ہو سکا تھا کہ وہ اندر کیا کرتا تھا۔ گاؤں کے لوگ دور سے دیکھتے کہ گرین ہاؤس کی کھڑکیاں اور دروازے بند ہیں۔ اندر سے کسی کی آواز تک نہیں آرہی۔ رات کے وقت کوٹھی کی دوسری منزل میں ایک جانب ہلکی سی روشنی ہو جاتی۔ یہ روشنی رات کے بارہ بجے تک رہتی ہے۔ پھر روشنی بجھ جاتی ہے اور گرین ہاؤس پر بڑا عجیب و غریب اندھیرا چھا جاتا۔ کوئی ایک سو برس ہوا کہ یہ سمندری کپتان اپنا جہاز لے کر سمندر میں سفر کر رہا تھا کہ ایک زبردست طوفان میں پھنس کر اس کا جہاز ڈوب گیا اور کپتان بھی ساتھ ہی غرق ہو گیا۔ اس کے بعد گرین ہاؤس پر ہمیشہ کے لئے تالا پڑ گیا، لیکن ایک عجیب بات ہونے لگی کبھی کبھی آدھی رات کی تاریکی اور خاموشی میں اس پراسرار کوٹھی میں سے ایسی آوازیں آتیں جیسے کسی سمندری جہاز کا کپتان چیخ چیخ کر طوفان میں گھرے ہوئے جہاز کے عملے کو ہدایات دے رہا ہو۔ پہلے پہل تو گاؤں کے لوگوں نے اسے اپنا وہم سمجھا، لیکن جب گاؤں کے بڑے بوڑھوں اور بچوں سب نے یہ آوازیں سُنیں تو وہ ڈر گئے اور انہوں نے اس بھوت محل کی طرف آنا چھوڑ دیا۔ تب سے لے کر آج تک یہ دو منزلہ کوٹھی گرین ہاؤس بے آباد اور ویران پڑی تھی۔ اس کے بارے میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ کوٹھی میں سمندری کپتان کی روح رہتی ہے۔

گاؤں کے لوگوں کو معلوم تھا کہ کوٹھی میں بڑا قیمتی سامان پڑا ہے۔ لیکن کسی کو اندر داخل ہونے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ مگر جیسا کہ ہم بیان کر رہے تھے، آج سے پچاس برس پہلے گاؤں کے ایک نوجوان نے ہمت سے کام لے کر گرین ہاؤس کے اندر چھلانگ لگا دی۔ وہ ڈرائینگ روم میں کارنس کے سامنے کھڑا تھا اور کوٹھی کے پُرانے مالک سمندری کپتان کی دیوار پر لگی ہوئی تصویر دیکھ رہا تھا۔ ویسے تو وہ نوجوان بڑا بہادر تھا پھر بھی بھوت محل کی پراسرار خاموشی اور آسیبی فضا نے اس پر اثر کرنا شروع کر دیا۔ لیکن گھڑی کا سونے کا خول دیکھ کر اس کی طبیعت للچا گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر سونے کے خول والی گھڑی کو اٹھانا چاہا۔ جونہی اس کا ہاتھ گھڑی سے لگا، اسے آسمانی بجلی کا کڑاکا اور بادلوں کی ہیبت ناک گرج سنائی دی اور ساتھ ہی اس نے دیکھا کہ کپتان کی تصویر غائب ہو گئی ہے اور اس کی جگہ سمندری طوفان کی بڑی بڑی لہریں تصویر کے فریم سے ٹکرا رہی ہیں۔

نوجوان غش کھا کر گرتے گرتے بچا۔ وہ چیخ مار کر الٹے پاؤں بھاگا۔ کھڑکی میں سے باہر باغ میں کودا۔ جنگلی جھاڑیوں میں گرتا پڑتا بھوت محل کی پتھریلی دیوار کے پاس پہنچا اور بڑی مشکل سے دیوار پھاند کر نو دو گیارہ ہو گیا۔ گاؤں پہنچ کر وہ ایسا بیمار پڑا کہ اس کی زبان بند ہو گئی اور بخار سے اس کا جسم پھڑکنے لگا۔ وہ کسی کو کچھ نہ بتا سکا کہ گرین ہاؤس کے اندر اس کے ساتھ کیا گزری اور اسی بخار اور زبان بندی میں چھ سات روز کے بعد مر گیا۔ اس اندوہناک حادثے کے بعد کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ گرین ہاؤس کی طرف رخ کرتا۔ قصبے کی بلدیہ نے اس دو منزلہ آسیبی کوٹھی کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا، کیونکہ مرے ہوئے کپتان کی کوئی اولاد یا رشتے دار موجود نہ تھا جو اس کوٹھی کی ملکیت کا دعویٰ کر سکتا۔ ویسے بھی ایسی پراسرار آسیب زدہ کوٹھی کی ملکیت کا دعویٰ کون کرتا جس کے اندر ایک سو برس کے مرے ہوئے سمندری کپتان کی روح رہتی آرہی ہو۔

اس آسیب زدہ دو منزلہ کوٹھی گرین ہاؤس کے بھوت کے بارے میں دہشت ناک کہانیاں سینہ بہ سینہ چلی آرہی تھیں۔ یہاں تک کہ اس کوٹھی کے آس پاس بچہ تک نہ پھٹکتا تھا۔ رات کو تو اس بھوت محل پر ایک ڈراؤنی خاموشی چھا جاتی۔ کہتے ہیں کسی روز ایسا ہوتا کہ آدھی رات کے وقت دوسری منزل کی ایک کھڑکی میں اچانک روشنی ہو جاتی یہ روشنی ایسی ہوتی جیسی کسی پُرانے زمانے

کی بڑی موم بتی کی ہوتی ہے۔ پھر یہ روشنی اُوپر والی منزل کی کھڑکی سے اتر کر نچلی منزل کی کھڑکی پر آجاتی۔ یوں لگتا جیسے کوئی بھٹکی ہوئی روح ہاتھ میں موم بتی پکڑ کر آدھی رات کے سناٹے میں کوٹھی کے چکر لگا رہی ہو۔ کئی بوڑھوں نے یہ روشنی اپنی آنکھوں سے دیکھی اور پھر اپنے مکانوں کی کھڑکیاں بند کر کے لحافوں میں دبک کر سو گئے تھے۔ خراب موسموں میں جب شمال کی جانب سے انتہائی برفیلی، تیز اور تند ہوائیں چلتیں اور سمندر کی بڑی بڑی لہریں ایک ہیبت ناک شور کے ساتھ ساحل کی بھوری چٹانوں سے ٹکراتیں تو اس دو منزلہ عمارت کی اوپر والی منزل سے کسی کے چیخ چیخ کر کسی کو پکارنے کی آوازیں سنائی دیتیں ان آوازوں کا شور طوفان کے شور میں دب جاتا۔ پھر صبح کو دیکھتے کہ گرین ہاؤس کی پُراسرار عمارت اسی طرح بارش میں بھیگی کھڑی ہے اور رات کی طوفانی ہواؤں نے کھڑکیوں پر چڑھی ہوئی جنگلی بیلوں کو ایک طرف کو جھکا دیا ہے۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا چلا گیا۔ گرین ہاؤس پر آسیب زدگی اور پُراسراریت کے سائے مزید گہرے ہوتے گئے۔ دہشت اور وحشت کے پردے دبیز سے دبیز تر ہوتے گئے۔ گاؤں کی ایک نسل اپنے سینے کے راز دوسری نسل کے سینے میں منتقل کر کے گذر گئی۔ دوسری نسل نے یہ راز تیسری نسل کو دے دیئے۔ پھر اس پُراسرار محل کو ایک راز بھرے بادل نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ کسی کی اتنی ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس کی طرف جائے، ایک رات کا ذکر ہے کہ آسمان پر گھنے بادل چھائے ہوئے تھے۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ سخت سردی سے سارے گاؤں پہ کہرے کی چادر چھائی ہوئی تھی۔ لوگ اپنے گھروں کے دروازے اندر سے بند کئے لحافوں میں دبکے سو رہے تھے۔ کسی وقت بجلی چمکتی، بادل گرجتا تو گرین ہاؤس کے گنجان درختوں میں سہمے ہوئے پرندے اپنے پروں میں بچوں کو سمیٹ لیتے۔ اندھیرا اس قدر تھا کہ بارش میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا

ٹھیک اس وقت ساحل سمندر پر بھوری چٹانوں کے پاس ایک کشتی آ کر رکی۔ کشتی میں سے دو خطرناک قسم کے مفرور قاتل اور ڈاکو اترے۔ ان کے ساتھ ایک دبلی پتلی نازک سی لڑکی بھی تھی اس لڑکی کے ہاتھ ڈاکوؤں نے پیچھے باندھ رکھے تھے۔ وہ اس لڑکی کو لے کر ساحل پر آ گئے کشتی انہوں نے بھوری چٹانوں کے پیچھے چھپا کر باندھ دی تھی۔ یہ ڈاکو اس لڑکی کو جنوبی آئرلینڈ کے ایک ساحلی شہر سے اغوا کر کے لائے تھے کہ طوفان میں گھر گئے۔ ان کا ارادہ لڑکی کو یمن کے ایک امیر تاجر کے

ہاتھ فروخت کر دینے کا تھا۔ ڈاکو طوفانی رات گاؤں کے کسی ویران مکان میں بسر کرنا چاہتے تھے تاکہ صبح موسم اچھا ہو تو وہ پھر سے کشتی میں بیٹھ کر اپنا سفر شروع کر دیں۔

ڈاکو لڑکی کو لئے چٹانوں کے پاس کھڑے تھے۔ بجلی چمکی تو انہیں قریب ہی گرین ہاؤس کی پُراسرار عمارت دکھائی دی۔ وہ بڑے خوش ہوئے کہ رات بھر سر چھپانے کو ٹھکانہ مل گیا۔ ایک ڈاکو نے کہا۔

"میرا خیال ہے، ہم اس عمارت میں رات بسر کر سکتے ہیں۔"

دوسرا بولا۔

"ہاں! یہ کوئی بے آباد عمارت لگتی ہے۔"

پہلے ڈاکو کی نگاہ دوبارہ گرین ہاؤس پر گئی تو اچانک اس نے عمارت کی دوسری منزل کی کھڑکی میں ہلکی روشنی دیکھی۔ پھر یہ روشنی نچلی منزل کی کھڑکیوں میں آ گئی۔ اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"وہاں کوئی رہتا ہے۔ کھڑکیوں پر روشنی ہو رہی ہے۔"

دوسرے ڈاکو نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"وہاں جو کوئی بھی ہوگا، اسے ہمارا خنجر چپ کرا دے گا۔"

"چلو۔ اس مکان میں چلتے ہیں۔"

وہ لڑکی کو آگے دھکیلنے لگے۔ لڑکی نے گڑگڑا کر کہا۔

"خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو۔ مجھے چھوڑ دو۔ میرے ماں باپ بہن بھائی میری جدائی کا صدمہ برداشت نہ کر سکیں گے۔"

"ڈاکو قہقہہ لگا کر کہنے لگا۔"

"اب تو انہیں تمہاری جدائی کا صدمہ برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ تم بھی اپنے گھر والوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ۔ اب تم کبھی واپس نہ جا سکو گی۔"

لڑکی بے چاری رونے لگی۔ ایک ڈاکو نے اس کے پانی میں شرابور بالوں کو پکڑ کر زور سے جھنجھوڑا اور بولا۔

"خبردار جو ٹسوے بہائے۔ ہم قاتل اور خونی مفرور ہیں۔ ہم نے کئی لوگوں کو قتل کیا ہے۔ اگر تم

نے شور مچایا تو یہ خنجر تمہارے سینے میں اُتار کر تمہاری لاش سمندری مچھلیوں کے حوالے کر دی جائے گی۔
غریب لڑکی سہم کر خاموش ہو گئی۔ ڈاکو اب گرین ہاؤس کے لوہے کے بند دروازے پر پہنچ کر رک گئے۔ انہوں نے تالا پڑا دیکھ کر ایک دوسرے سے کہا کہ اگر اس گھر میں کوئی رہتا ہے تو پھر تالا کس نے ڈال دیا۔

"یار چھوڑو یہ باتیں۔ دیوار پھاند کر اندر چلو، رات بسر کرتے ہیں۔ ہمیں کیا کوئی یہاں رہتا ہے یا نہیں۔"

سب سے پہلے انہوں نے لڑکی کو دیوار کے اُوپر چڑھا کر دوسری طرف اتارا، پھر ایک ایک کر کے وہ خود بھی دوسری طرف اتر گئے۔ بارش بڑے زور شور سے ہو رہی تھی۔ کسی کسی وقت بجلی چمکتی اور زور سے بادل گرجتے۔ گرین ہاؤس کے باغ میں جھاڑیاں اور جھاڑ جھنکاڑ اتنا گنجان اُگا ہوا تھا کہ ڈاکو بڑی مشکل سے راستہ بناتے عمارت کے عقبی حصے میں آ گئے۔ وہ بڑے دروازے سے اندر داخل ہونا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید وہاں چوکیدار پہرہ دے رہا ہو گا۔ انہیں کیا خبر تھی کہ عمارت میں سوائے کپتان کے بھوت کے اور کوئی بھی نہیں ہے۔

عمارت کے عقب میں انہوں نے ایک کھڑکی کا پٹ زور لگا کر کھول دیا اور خاموشی سے اندر چلے گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں ایک پیتل کے پایوں والا پرانا ٹوٹا پھوٹا پلنگ پڑا تھا۔ کونے میں آتشدان تھا جس کے اُوپر دیوار پر ایک پرانی بندوق لٹک رہی تھی۔ آتشدان کے دائیں بائیں دو آرام کرسیاں رکھی تھیں جن پر گرد کی تہہ جمی تھی۔ ڈاکو نے جیب سے موم بتی نکال کر روشن کی اور کارنس پر لگا دی۔ آتشدان کے پاس ہی لکڑیوں کا ایک ڈھیر تھا۔ انہوں نے آگ جلائی اور اپنے کپڑے سکھانے لگے۔ پھر لڑکی سے بھی کہا کہ وہ اپنے کپڑے خشک کرے۔ وہ بڑے حیران تھے کہ اس عمارت میں ابھی تک کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی تھی، حالانکہ کھڑکی کے پٹ کھلنے کی بڑی آواز پیدا ہوئی تھی۔ ایک ڈاکو نے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے، اس گھر میں کوئی نہیں رہتا۔ دیکھتے نہیں ہر جگہ گرد جمی ہوئی ہے۔"
دوسرا بولا۔ "پھر کھڑکی میں موم بتی کی روشنی کیسی ہوئی تھی؟"
پہلے نے کہا۔ "شاید وہ چوکیدار تھا جو گشت لگانے اوپر گیا اور اب اپنی کوٹھڑی میں جا کر

گیا ہے۔"
"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔"
کونے میں تپائی پر کافی کی چینک اور دو تانبے کے گلاس پڑے تھے۔ انہوں نے چینک میں کافی بنا کر خود بھی پی اور لڑکی کو بھی پلائی۔ سخت سردی میں سمندری سفر کے بعد اس کمرے میں آ کر وہ گرم ہو گئے تھے۔ انہوں نے لڑکی سے کہا کہ وہ پلنگ پر چپ چاپ لیٹ کر سو جائے۔ لڑکی بے حد ڈری ہوئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے ان کے حکم کی تعمیل نہ کی تو وہ بڑے آرام سے اسے ہلاک کر دیں گے۔ وہ چپ چاپ پلنگ پر ایک پرانا سا کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔ دونوں ڈاکو آتشدان کے پاس زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے کافی پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ وہ یمن پہنچ کر امیر تاجر کے ہاتھ لڑکی کو فروخت کرنے اور اس کا سونا وصول کر کے وہاں سے ہانگ کانگ جانے کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔
باہر بادل گرج رہے تھے اور بارش برس رہی تھی۔ رات کا سناٹا چاروں طرف چھایا ہوا تھا۔ ایک ڈاکو نے وقت دیکھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔
"میرا خیال ہے، ہمیں بھی کچھ دیر آرام کر لینا چاہیئے۔"
"ہاں! صبح پھر سفر کرنا ہے۔"
دوسرے ڈاکو نے کہا۔ "تم سو جاؤ۔ میں جاگ کر پہرہ دوں گا۔ کوئی پتا نہیں اس گھر میں کوئی رہتا ہو۔ ہم میں سے کسی کا جاگنا بہت ضروری ہے۔"
ایک ڈاکو آتشدان کے پاس ہی پڑ کر سو گیا۔ دوسرا جاگ کر خنجر ہاتھ میں لئے پہرہ دینے لگا۔ لڑکی بستر پر چپ چاپ لیٹی ہوئی تھی۔ وہ سو نہیں رہی تھی۔ اسے اپنے ماں باپ کا خیال آ رہا تھا جو اس کی جدائی میں تڑپ رہے ہوں گے۔ لڑکی کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو ڈھلک پڑے۔ پھر اس کے ہونٹوں سے سسکی نکل گئی۔ اس پر ڈاکو اپنی جگہ سے اٹھا۔ لڑکی کے پاس آیا اور جھک کر خنجر کی تیز نوک لڑکی کی گردن پر رکھ کر بولا
"اگر پھر تمہارے رونے کی آواز آئی تو یہ خنجر تمہاری گردن میں اُتار دوں گا۔ سمجھیں؟" لڑکی نے کانپتے ہونٹوں سے کہا۔
"میں نہیں روؤں گی۔"

اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ ڈاکو واپس اپنی جگہ آتشدان کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ دوسرا ڈاکو
لے رہا تھا۔ آتشدان میں آگ مدہم پڑ گئی تھی۔ تپائی پر موم بتی روشن تھی۔ جاگنے والا ڈاکو موم
دھیمی روشنی میں پلنگ پر سوئی ہوئی لڑکی کو غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اس کے اندر کا شیطان بیدار ہو
شیطان نے اس کے بُرے خیالات کو تحریک دی اور ڈاکو اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اس کے چہرے پر بھی
خواہشات کی تاریکی سی چھا گئی۔ اس نے اُٹھ کر پھونک مار کر موم بتی بجھا دی۔ موم بتی کے بجھتے
کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ لڑکی نے پلنگ پر لیٹے لیٹے آنکھیں کھول کر دیکھا، وہاں اندھیرا ہی
تھا۔ صرف کھڑکی کے اُوپر روشندان میں سے باہر بارش والی طوفانی رات کی بے معلوم سی ہلکی
روشنی پڑ رہی تھی۔ بارش کی آواز بادلوں کی گرج کے ساتھ ساتھ اندر صاف سنائی دے رہی
لڑکی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ سمجھ گئی کہ ڈاکو کی نیت خراب ہو گئی ہے۔ اس
لیٹے ہی لیٹے خدا سے دعا مانگی کہ اے خدا! میری عزت کی حفاظت کرنا۔ ڈاکو اپنی جگہ سے اُٹھ
آہستہ آہستہ پلنگ پر آیا اور پھر جلدی سے اس نے اپنا ایک ہاتھ لڑکی کے منہ پر رکھ کر کہا۔

"خبردار! اگر تو نے آواز بلند کی تو میں خنجر سے تمہاری گردن اتار دوں گا۔ چپکے سے لیٹی رہ
لڑکی کا خون خشک ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ وہ ایک بے بس اور مجبور لڑ
اور اپنے شریف ماں باپ کے گھر سے دور دو خونی ڈاکوؤں کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھی۔ ڈاکو
پر جھک گیا۔ وہ اپنے ایک ہاتھ کو لڑکی کے گریبان میں ڈال چکا تھا کہ اچانک موم بتی روشن ہو گ
اُچک کر پیچھے ہٹ گیا۔

"بدبخت تو نے موم بتی کیوں روشن کر دی؟"

اس کا خیال تھا کہ یہ موم بتی اس کے ساتھی ڈاکو نے جلائی ہے۔ لیکن اس نے دیکھا کہ اس کا
آتشدان کے پاس بے خبر سویا خراٹے لے رہا ہے۔ پھر یہ موم بتی کس نے روشن کی؟ ڈاکو ششدر سا
رہ گیا۔ وہ پلنگ پر بیٹھا بڑے غور سے کمرے میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کمرے میں اور کوئی بھی نہ
تھا۔ پھر یہ موم بتی خود بخود کیسے جل اٹھی۔ ضرور اُسے کسی نے جلایا ہے، لیکن جس نے اسے جلایا ہے
کہاں ہے؟ ڈاکو نے سوچا شاید اس نے موم بتی بجھائی نہیں تھی۔ مگر اس نے تو خود پھونک مار کر
بجھایا تھا۔

اب ڈاکو کچھ پریشان ہو گیا۔ اس نے خنجر ہاتھ میں لیا اور کمرے میں کھڑے ہو کر بولا۔ "کون ہے؟"
کمرے میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف اس کے سوئے ہوئے ساتھی ڈاکو کے خراٹے گونج
رہے تھے۔ اس نے سوچا شاید یہ اس کا وہم ہے۔ وہاں اور کون ہو سکتا ہے؟ بھلا کون اندر آ کر
موم بتی جلا سکتا ہے۔ وہ ہنس پڑا۔ اس نے موم بتی کو پھونک مار کر بجھا دیا اور لڑکی کے پاس آکر بولا۔

"تمہیں مجھ سے کوئی نہیں بچا سکتا۔"

لڑکی خوف سے کانپ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر سسکیاں
بھرتے ہوئے کہا۔

"رحم کرو۔ رحم کرو۔ میں بے گناہ ہوں۔"

"بکواس بند کرو"، ڈاکو نے کہا۔

وہ لڑکی پر جھک گیا اور اس پر دوسری بار حملہ کرنے والا تھا کہ دفعتاً ایک بار پھر موم بتی خود بخود
جل اٹھی اور کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ اب تو ڈاکو کو پسینہ آ گیا۔ وہ پلنگ سے اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے
پاؤں کو ٹھوکر مار کر اپنے ساتھی کو جگا دیا وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور اُسے موٹی سی گالی دے کر بولا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

پہلے ڈاکو نے کہا۔

"کسی نے دو بار اس موم بتی کو جلایا ہے۔"

"کیا بک بک کر رہے ہو؟" دوسرے ڈاکو نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا

پہلے ڈاکو نے سرگوشیوں میں اسے سارا واقعہ سنا دیا۔ دوسرا ڈاکو بھی حیرانی سے آنکھیں پھاڑ
پھاڑ کر موم بتی کو تکنے لگا۔

"ارے نہیں بدبخت! یہ تیرا وہم ہے۔"

"وہم نہیں ہے۔ یہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہوا ہے۔ ایک بار موم بتی بجھی۔ پھر
جل اٹھی۔ دوسری بار میں نے اسے بجھایا تو پھر یہ روشن ہو گئی۔"

"تو کیا اس کمرے میں کوئی بھوت رہتا ہے۔

"خدا جانے...... لیکن ہمیں اس کمرے سے چلے جانا چاہیئے۔

"اس طوفانی رات میں ہم کہاں جائیں گے۔ تھوڑی رات رہ گئی ہے، آرام سے تم بھی سو جاؤ۔ یہ لڑکی ابھی تک کیوں جاگ رہی ہے؟ اسے بھی سلا دو۔"

انہوں نے لڑکی کو ڈانٹا کہ وہ سو جائے اور خود بھی سونے کی کوشش کرنے لگے۔ پہلے ڈاکو نے موم بتی بجھانی چاہی تو دوسرے نے کہا کہ موم بتی روشن رہنے دو۔ موم بتی جلتی رہی۔ لڑکی پلنگ پر خاموش گم صم سی ہوئی لیٹی رہی اور ڈاکو آتشدان کے پاس بیٹھے سونے کی کوشش کرتے رہے۔ دوسرا ڈاکو ایک بار پھر خراٹے بھرنے لگا۔ لیکن پہلے ڈاکو کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے دوبارہ موم بتی کو جلتے دیکھا تھا۔ باہر بارش اسی طرح ہو رہی تھی۔ بادل اب گرجنا بند ہو گئے تھے۔ دور سمندر کی طرف کسی وقت ہلکی سی بجلی چمک جاتی تھی۔ اتنے میں دروازہ چرچرانے کی آواز آئی۔ ڈاکو نے خنجر تان لیا اور اپنے ساتھی کو جگا دیا۔

"شی! کوئی اندر آ رہا ہے۔"

"موم بتی بجھا دو۔"

"نہیں نہیں اسے روشن رہنے دو۔ کرسیوں کے پیچھے چھپ جاؤ۔"

دونوں ڈاکو کرسیوں کے پیچھے چھپ گئے۔ موم بتی روشن رہی۔ وہ بڑے غور سے اس دروازے کی طرف دیکھنے لگے جو اندر کسی کمرے کی طرف کھلتا تھا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ کئی سالوں سے بند پڑا ہے۔ لڑکی بھی سانس روکے پلنگ پر لیٹی تھی اور ذرا سا سر اٹھا کر آنکھیں پھاڑے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دروازہ زور سے چرچرایا، اور بھی کھل گیا۔ دروازہ کچھ دیر کھلا رہا۔ پھر اپنے آپ بند ہو گیا اندر کوئی بھی نہیں آ رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ کسی نے دروازہ کھول کر جھانک کر اندر دیکھا اور دروازہ بند کر کے چلا گیا ہے۔ ڈاکو کرسیوں کے پیچھے سے نکل آئے۔ انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"شاید چوکیدار تھا۔ چلا گیا۔"

"لیکن میں نے تو کسی کی شکل نہیں دیکھی۔"

"ہو سکتا ہے ہمیں شکل دکھائی نہ دی ہو۔ لیکن میرا خیال ہے، ہمیں اب یہاں سے نکل بھاگنا چاہیے۔ طوفان بھی تھم گیا ہے اور رات بھی گذر چکی ہے۔"

انہوں نے لڑکی کو اٹھایا۔ اس کے ہاتھ پیچھے پیر باندھے اور اٹھ کر چلنے ہی والے تھے کہ ایک ڈاکو

کے سر پر لوہے کی کوئی بھاری سی چیز کی ضرب پڑی اور وہ ہائے کہہ کر فرش پر ہو گیا۔ دوسرے ڈاکو نے خنجر نکال کر ہوا میں لہرایا۔

"کون ہے؟"

لیکن کمرے میں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ پھر ڈاکو گر کر کیسے بے ہوش ہوا؟ دوسرے کہ شاید وہ صدمے سے گر کر بے ہوش ہو گیا ہے۔ وہ جھک کر پہلے ڈاکو کو ہوش میں لانے کی ترکیبیں کرنے لگا۔ اتنے میں وہی لوہے کی بھاری شے اس کے سر پر بھی پڑی اور وہ بھی اپنے ساتھی کے اوپر گر کر بیہوش ہو گیا۔ لڑکی خوف سے کانپنے لگی کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اسے خیال آیا کہ خدا نے اس کی دعا سن لی ہے اور یہ ڈاکو اپنے آپ بے ہوش ہو گئے ہیں۔ وہ اپنی پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر ہاتھ اتنی مضبوطی سے پیچھے باندھے گئے تھے کہ وہ کھول نہیں سکتی تھی۔ اچانک اس کے بدن میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ کوئی اس کے پیچھے کھڑا اس کے ہاتھوں کی رسی کھول رہا تھا۔

لڑکی نے ڈرتے ڈرتے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ پیچھے کوئی بھی نہ تھا، لیکن دو انسانی ہاتھ اس کے ہاتھوں کی رسی کھول رہے تھے۔ اب لڑکی کے بے ہوش ہونے کی باری تھی اور وہ بھی بے ہوش ہو گئی۔ مگر وہ گری نہیں۔ کسی نے اسے اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور رسی کھول کر اس کے ہاتھ آزاد کر کے اسے پلنگ پر آرام سے لٹا کر اوپر کمبل ڈال دیا۔ پھر کمرے کی کھڑکی کھلی۔ کسی نے دونوں ڈاکوؤں کو اٹھایا اور کھڑکی سے باہر پھینک کر نکل گیا۔

لڑکی کو ہوش آیا تو روشن دان میں سے صبح کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ آتشدان میں آگ بجھ گئی تھی کمرہ گرم تھا۔ اس کے سرہانے تپائی پر گرم گرم دودھ کا گلاس رکھا تھا۔ لڑکی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ رات کے واقعات اسے خواب کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ اس نے گرم دودھ کا گلاس پیا اور کھڑکی میں سے کود کر باہر آ گئی۔ بھوری چٹانوں کے درمیان رات کی بارش سے گیلی ریت پر دونوں ڈاکوؤں کی لاشیں پڑی تھیں۔ دونوں کے سر ان کے تن سے جدا تھے اور ذرا پرے اوندھے پڑے تھے۔ لڑکی کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ ڈر کر گاؤں کی طرف اٹھ دوڑی۔ بڑی مشکل سے گرین ہاؤس کی دیوار پھاند کر وہ گاؤں پہنچی۔ اس نے گاؤں کے لوگوں کو ساری کہانی بیان کی۔ پولیس آ گئی۔ پولیس کے دو سپاہی ڈرتے ڈرتے گرین ہاؤس کی دیوار پھاند کر اندر گئے اور دونوں ڈاکوؤں کی لاشیں لے کر واپس آ گئے۔

ن ہوا باز پیراشوٹ
ٹے تیرتا ہوا سمندر سے
رہا۔ جب اسے یقین
کو ریت کا گڑھا
آسمان

" اس طوفانی رات
سے ڈاکوؤں کی لاشیں برآمد ہونے کا واقعہ ارد گرد کے دیہات میں پھیل گیا۔ لوگو
لڑکی ابھی تک کیوں جاگ
ہو گئی۔ انہیں گرین ہاؤس کی پراسرار عمارت سے زیادہ خوف محسوس ہونے لگا
انہوں نے لڑکی کو ڈ
ساتھ ان کے دلوں میں گرین ہاؤس کے بھوت کی عزت بڑھ گئی کیونکہ اس
بجھانی چاہی تو دو
مسکین لڑکی کی عزت بچاتے ہوئے ڈاکوؤں کو ہلاک کیا تھا۔ اس کے باوجود کسی میں کبھ
گم صم بیٹھ
ی ہمت نہ ہوئی تھی کہ وہ دو منزلہ بھوت محل کے قریب سے بھی ہو کر گذرے۔ دسمبر کی یخ راتو
کو جب برف باری ہوتی تو گرین ہاؤس کی ڈھلانی چھت برف سے لد جاتی مدات کو ہڈیوں میں دھنس ج
والی برف آلود ہوائیں چیختی ہوئی گرین ہاؤس کی بند کھڑکیوں سے ٹکرا کر گذرتیں اور چاروں طرف ایک ڈ
سماں چھا جاتا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے بھٹکی ہوئی بے چین روحیں عمارت کی سرد دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر
کر رہی ہوں۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ گرین ہاؤس کی پراسرار دو منزلہ عمارت پر اسرار کے پردے بڑے ر
طوفانی راتوں کے بحری کپتان کے بھوت کی اسی طرح آوازیں سنائی دیتیں۔ کبھی کبھی اندھیری راتوں کے سنا
میں عمارت کی دوسری منزل کی کھڑکی میں موم بتی کی روشنی ہوتی اور پھر یہ روشنی پہلی منزل کی کھڑکیو
میں آکر بجھ جاتی۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ جرمن جہازوں نے انگلستان کے شہروں پر اندھا دھ
بمباری شروع کر دی۔ دشمن کے جہاز آتے اور گرین ہاؤس کی پراسرار عمارت کے اُوپر سے ہو کر لندن
طرف چلے جاتے۔ ایک دفعہ برطانیہ کا ایک جنگی جہاز گرین ہاؤس کے سمندر کے قریب سے گذرا۔ جاسوسو
مخبری کر دی۔ فوراً ہی جرمن ہوائی جہاز پہنچ گئے اور انہوں نے جہاز پر بم باری شروع کر دی۔ ایک
گرین ہاؤس کے باغ میں گرا۔ جس کی وجہ سے گرین ہاؤس کی دیوار ایک طرف سے گر پڑی اور جنوب ک
کھلنے والی کھڑکی ٹوٹ گئی۔ کسی نے ٹوٹی ہوئی دیوار اور کھڑکی کی مرمت نہ کی۔ راتوں کو ہر وقت بلیک
آؤٹ ہوتا۔ لوگوں نے ایک حیرت انگیز تبدیلی یہ محسوس کی کہ اب راتوں کو گرین ہاؤس کی پراسرار عمار
میں موم بتی کی روشنی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ شائد یہ برطانوی بحری کپتان کی روح کو بھی اپنے وطن
دفاع کا اتنا خیال تھا کہ وہ بلیک آؤٹ میں روشنی کر کے دشمن کے جہازوں کی توجہ اپنی طرف نہیں ک
چاہتا تھا۔ جنگ زوروں پر تھی کہ جرمن فضائیہ کا ایک طیارہ زخمی ہونے کے بعد اس طرف آ گیا۔ ج
کی دم پر گولہ لگا تھا اور وہ دھوئیں کی لکیر چھوڑتا سمندر کی طرف گر رہا تھا۔ بس اب وہ پھٹنے ہی
تھا کہ اس کے ہوا باز نے جہاز میں سے پیرا شوٹ کے ذریعے باہر چھلانگ لگا دی۔ اس کے باہر چھلا

انے کے فوراً بعد جہاز میں آگ لگ گئی اور وہ پھٹ کر رات کی فضا میں بکھر گیا۔ جرمن ہوا باز پیرا شوٹ
ذریعے سمندر میں جا گرا۔ رات کا وقت تھا۔ ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ جرمن پائلٹ تیرتا ہوا سمندر سے
ہر خشکی پر آ گیا۔ وہ دیر تک ریت پر ایک چٹان کے پیچھے دبکا حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ جب اسے یقین
گیا کہ کسی نے اسے گرتے نہیں دیکھا تو اس نے اپنے کاغذات کو آگ لگائی۔ پیرا شوٹ کو ریت کا گڑھا
ود کر اندر دبایا۔ پستول ہاتھ میں لی اور پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا ساحل کی طرف چل پڑا۔ آسمان
بادلوں کی اوٹ میں سے چاند نکل آیا۔ گاؤں میں سمندر کے کنارے کنارے اس کی روشنی پھیل گئی۔
من ہوا باز نے دیکھا کہ اس سے تھوڑی ہی دور، گنجان درختوں میں ایک عمارت کھڑی ہے۔

یہ گرین ہاؤس کی پراسرار عمارت تھی۔ جرمن ہوا باز نے سوچا کہ اس عمارت کے کسی کونے میں چھپ
رات بسر کرنی چاہیئے اور صبح کو یہاں سے انگریز مزدور کا بھیس بدل کر فرار ہونے کی کوشش کرنی
ہیئے۔ اس لئے ضروری تھا کہ وہ کسی انگریز مزدور کو پکڑ کر بے ہوش کرے اور پھر اس کے کپڑے
ن کر وہاں سے نکل جائے۔ وہ گرین ہاؤس کی بمباری سے گری پڑی دیوار کے ملبے پر سے گذر کر اندر
ران باغ میں آ گیا۔ عمارت پر گہری خاموشی اور تاریکی چھائی ہوئی تھی، جرمن ہوا باز بڑی ہوشیاری سے
اڑیوں کے ساتھ ساتھ چلتا عمارت کے پیچھے اسی کمرے کے باہر آ گیا جہاں اس سے پہلے ڈاکو اغوا شدہ
کی کو پکڑ کر لائے تھے۔ اس کمرے کی ایک کھڑکی کا پٹ بمباری کی وجہ سے ٹوٹ کر نیچے گرا ہوا تھا
وا باز چھلانگ لگا کر کمرے کے اندر چلا گیا۔ کمرے میں وہی پرانا پلنگ بچھا تھا۔ آتشدان میں جلی ہوئی
ڑیوں کی راکھ پڑی تھی۔ دو آرام کرسیاں تھیں، کونے میں تپائی پر بجھی ہوئی موم بتی پڑی تھی اور آرام
رسیوں کے پاس ہی کافی کی چینک اور تین ڈونگے الٹے پڑے تھے۔ ہوا باز نے چینک اور ڈونگے اٹھا
ر ایک طرف کئے۔ موم بتی روشن کر کے آتشدان کے پاس رکھی اور جیب سے انگلستان کے دیہات
ا نقشہ اور کمپاس نکال کر دیکھنے لگا کہ وہ کس جگہ پر طیارے سے گرا ہے۔

وہ بہت جلد سمجھ گیا کہ یہ جگہ لندن سے پچاس میل مغرب میں سمندر کے کنارے پر ہے اگر اسے کسی
نگریز مزدور یا کسان کے کپڑے مل جائیں تو وہ بڑی آسانی سے لندن پہنچ سکتا ہے۔ لندن میں جنگ کی
فراتفری مچی ہوئی تھی۔ وہاں سے وہ فرار ہونے کی کوشش بھی کر سکتا تھا اور اگر چاہے تو جنگ کے ختم
ہونے تک گم بھی رہ سکتا تھا۔ سوال یہ تھا کہ بھیس بدلنے کے لئے کپڑے کہاں حاصل کئے جائیں؟ اس

کے لئے ضروری تھا کہ رات بسر ہو جائے پھر صبح وہ سڑک پر جا کر کسی مزدور کو اغوا کر کے اس کمرے میں لائے اور پھر اسے بے ہوش کر کے یا رسیوں سے باندھ کر اس کے کپڑے اُتروا کر خود پہنے اور وہاں سے فرار ہو جائے۔ رات گذر گئی۔ دن کی روشنی نکل آئی۔ جرمن ہوا باز نے جرمن فضائیہ کی وردی پہنی ہوئی تھی جو دور ہی سے پہچانی جا سکتی تھی۔ اس نے جیکٹ اتار کر پھینک دی۔ وہ صرف نیلا سویٹر اور نیلی پتلون میں ہی گرین ہاؤس سے باہر آ کر چٹانوں میں ایک ایسی جگہ چھپ کر بیٹھ گیا جہاں قریب ہی سے ایک کچا راستہ کھیتوں میں جاتا تھا۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد اسے ایک مزدور جاتا نظر آیا۔

جرمن ہوا باز نے پستول ہاتھ میں لیا اور ایک دم سے چٹانوں میں سے نکل کر مزدور کے آگے آ گیا اس نے مزدور کے سینے پر پستول رکھ کر اسے اپنے ساتھ گرین ہاؤس چلنے کو کہا۔ مزدور ہکا بکا رہ گیا۔ جب اس نے سنا کہ پستول والا آدمی اسے گرین ہاؤس کی طرف لے جا رہا ہے۔ تو وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ وہ یہی سمجھا کہ یہ پستول والا نوجوان گرین ہاؤس کا بھوت ہے جو انسانی شکل میں آ کر اسے اغوا کرے گا اور پھر گرین ہاؤس کے اندر لے جا کر اسے ہڑپ کر جائے گا، اس نے باپ دادا کے وقتوں سے اس پراسرار عمارت کے بارے میں جو کہانیاں سن رکھی تھیں۔ اب وہ اس کی آنکھوں کے سامنے زندہ ہو کر آ گئی تھیں۔ اس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہا:

"گرین ہاؤس کے بھوت! مجھے معاف کر دے۔"

جرمن ہوا باز چکر کھا گیا کہ یہ انگریز مزدور اسے بھوت کس طرح سے سمجھ رہا ہے۔ اس کے پاس حیران ہونے کے لئے وقت نہیں تھا۔ اس نے پستول کی نالی مزدور کے سینے پر دباتے ہوئے کہا۔

"جلدی میرے ساتھ چلو اُلو کے پٹھے۔"

انگریز مزدور تھر تھر کانپتے ہوئے آگے آگے چل پڑا۔ گرین ہاؤس کے کمرے میں آ کر ہوا باز نے پیچھے سے مزدور کے سر پر پستول کا دستہ اتنی زور سے مارا کہ وہ بے چارہ مزدور چکر کھا کر زمین پر گر پڑا۔ ہوا باز نے جلدی جلدی اس کے کپڑے اتار کر خود پہنے۔ نقشہ پھاڑ کر آتشدان میں جلا دیا۔ پستول قمیص کے اندر چھپائی اور مزدور کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اسے پلنگ کے ساتھ باندھ دیا۔ اب وہ باہر نکلنے کے لئے آزاد تھا۔ وقت ضائع کئے بغیر وہ کھڑکی کی طرف لپکا جس کا ایک پٹ ٹوٹ

چکا تھا۔ جونہی وہ کھڑکی کے پاس آیا ایک بڑے زور کا گھونسا اس کے منہ پر لگا اور وہ پلٹ کر پیچھے پلنگ پر گر پڑا۔ ہوا باز بوکھلا کر اُٹھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اسے گھونسا مارنے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ دوسرا گھونسا اس کے سر میں لگا۔ وہ گر پڑا۔ اب اس کے ذہن میں انگریز مزدور کا جملہ گونج اٹھا:

"گرین ہاؤس کے بھوت! مجھے معاف کر دے۔"

تو کیا اس عمارت میں کوئی بھوت رہتا ہے؟ جرمن ہوا باز ایک جدید سائنسی دور کا پڑھا لکھا نوجوان تھا جس کی تربیت جرمن فضائیہ کے بڑے سخت اور سائنٹیفک ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ جنوں بھوتوں پر اعتبار کر ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن ایک یقین نہ آنے والی بات اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہی تھی یعنی کسی نے اس کو دو زبردست گھونسے مارے تھے اور مارنے والا اسے کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اپنے گلے اور سر کو سہلاتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اور اُٹھتے ہی اس نے قمیص کے اندر سے پستول نکال کر کہا:

"کون ہو تم؟ سامنے آؤ۔ نہیں تو گولی چلا دوں گا۔"

اس کی بات کا کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسے سنائی یوں دیا۔ جیسے کوئی بھاری بھرکم قدم اٹھاتا اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہوا باز نے جدھر سے قدموں کی چاپ آ رہی تھی ادھر کو پستول کا رخ کر کے گولی چلا دی۔ دھائیں کی آواز کے ساتھ گولی پستول میں سے نکل کر سامنے کی دیوار پر لگی۔ تانبے کی ایک پرانی تھالی سے ٹکرائی اور تھالی ایک شور کے ساتھ اپنی جگہ سے اچھل کر فرش پر گر پڑی۔ اس شور کی آواز سے انگریز مزدور کو ہوش آ گیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر ہوا باز کو پستول تانے دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا دیکھا تو کچھ نہ سمجھ سکا کہ ماجرا کیا ہے۔ بھاری بھرکم قدموں کی چاپ اب بھی ہوا باز کی طرف آ رہی تھی۔ اس نے دوسری بار پھر گولی چلا دی۔ اس بار گولی کھڑکی کے پٹ کو چیر کر باہر نکل گئی۔ ہوا باز نے چیخ کر کہا:

"کون ہو تم؟ میں گولی مار دوں گا۔"

لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ اندر سے ڈول گیا تھا۔ اس کے ماتھے پر خوف سے پسینہ آ گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کا سامنا ایک بھٹکی ہوئی روح ہے۔ ایک ایسے بھوت سے ہے جو اس عمارت میں

رہتا ہے۔ وہ غلط جگہ پر آ گیا تھا۔ اب وہ باہر بھاگنے کی فکر میں تھا۔ ہوا باز نے کھلی کھڑکی کو سامنے رکھ کر سوچا کہ اسے اس کھڑکی میں سے باہر کود جانا چاہیئے۔ وہ کھڑکی کی طرف ایک دم سے بھاگا۔ کسی نے اس کی ٹانگوں کے آگے اپنی ٹانگ کر دی۔ ہوا باز منہ کے بل دھڑام سے زمین پر گرا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور گر پڑا۔ دوسرے لمحے ہوا باز نے اپنی زندگی کا پہلا حیرت ناک منظر دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ پستول اپنے آپ فرش پر سے اٹھ کر فضا میں ٹھہر گیا۔ پستول کی نالی کا رخ ہوا باز کے سینے کی طرف تھا اسے کسی کی آواز سنائی نہ دی۔ پستول اس کی طرف آگے بڑھنے لگا۔ مزدور لیٹا لیٹا تھر تھر لرز رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ گرین ہاؤس کا بھوت آ گیا ہے۔ اب اس کی خیر نہیں۔ پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بھاری مضبوط ہاتھ اس کے منہ سے کپڑا باہر نکال رہے ہیں اور اس کے جسم سے بندھی ہوئی رسیاں کھول رہے ہیں۔ اب وہ آزاد تھا۔

دوسرے ہی لمحے جرمن ہوا باز کے دونوں ہاتھ کسی نے پکڑ کر پیچھے سے باندھنے شروع کر دیئے ہوا باز نے اپنے آپ کو چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کی، لیکن باندھنے والے کے ہاتھوں کی گرفت اس قدر مضبوط تھی کہ وہ اپنے آپ کو چھڑا نہ سکا اور بے بس ہو گیا۔ بھوت نے اسے باندھ کر اس طرح سے کس دیا کہ وہ بازو ذرا سا بھی ہلا نہیں سکتا تھا۔ پھر انگریز مزدور کے کان میں جیسے سرگوشی سنائی دی:

"یہ ایک جرمن ہوا باز ہے۔ اسے لے جاؤ اور پولیس کے حوالے کر دو۔"

"اور خبردار! دوبارہ اس گھر کا رخ کیا تو کھوپڑی اڑا دوں گا۔"

مزدور تھر تھر کانپ رہا تھا اس نے پھر بھی ہمت کر کے پستول کی نالی جرمن ہوا باز کی گردن پر رکھ دی اور اسے لے کر گرین ہاؤس سے باہر آ گیا۔ باہر سڑک پر آتے ہی اس نے شور مچا دیا کہ میں نے ہوا باز پکڑا ہے۔ دشمن کا ہوا باز پکڑا ہے۔ گاؤں کے لوگ اکٹھے ہو گئے، اس کے ساتھ ہی انگریز مزدور کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر گر پڑا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ لوگوں نے دشمن کے ہوا باز کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

جنگ ختم ہو گئی۔ بمباری سے تباہ شدہ انگلستان کے ڈھانچے میں سے ایک نیا ملک جنم لینے لگا۔ زوال شدہ معیشت پھر سے بحال ہونے لگی جیٹ ہوائی جہازوں کا دور شروع ہو گیا۔ روس اور امریکہ نے چاند کی طرف سیارے بھیجنے شروع کر دیئے۔ گرین ہاؤس کا گاؤں بھی ترقی کرتا چلا گیا۔

ریں پختہ ہو گئیں۔ گاؤں میں سیاحوں کے لئے ایک شاندار ہوٹل تعمیر ہو گیا۔ لگژری بسیں گاؤں کے میں آ کر ٹھہرنے لگیں۔ لیکن گرین ہاؤس کی پراسرار دو منزلہ عمارت پر وحشت کے بادل چھائے رہے۔ ں کی کھڑکیوں پر دبیز خاموشی طاری رہی۔ اس کی دیواروں پر جنگلی جھاڑیاں چڑھتی چلی گئیں۔ اس ٹوٹی ہوئی دیوار کی کسی نے مرمت نہ کی۔ کسی کو حوصلہ نہ ہوتا تھا کہ وہ گرین ہاؤس کے قریب سے رے۔ دن میں پھر بھی کوئی اکا دکا مزدور یا کسان دور سے گذر جاتا تھا۔ لیکن رات کو وہاں ڈراؤنی وشی کا راج ہوتا۔ آدھی رات کو پھر کسی کسی دن دوسری منزل کی کھڑکی میں اسی طرح سے موم بتی کی ننی ہوتی۔ پھر یہ روشنی دوسری منزل سے اتر کر پہلی منزل میں آ کر بجھ جاتی۔ طوفانی راتوں کو اب بھی ں کے لوگ گرین ہاؤس کی طرف سے آتی ایسی آوازیں سنتے جیسے کوئی بحری کپتان، طوفان میں گھرے ے جہاز کے ملاحوں کو چیخ چیخ کر ہدایات دے رہا ہو۔

ان حالات میں لوشیا نامی مالدار امریکی بیوہ اس گاؤں میں آئی۔

لوشیا کیلیفورنیا کی ریاست کے ایک قصبے میں پیدا ہوئی۔ اس کے ماں باپ بڑے غریب تھے اور ا مشکل سے اپنا وقت پورا کر رہے تھے۔ لوشیا کا باپ ایک امیر امریکی زمیندار کے کھیتوں میں کام کرتا تھا۔ لوشیا اپنے ماں باپ کی واحد اولاد تھی۔ اس غریبی میں بھی لوشیا کے ماں باپ نے اپنی بچی کو ے لاڈ پیار سے پالا اور اسے گھر پر ہی اچھی تعلیم دی۔ لوشیا بچپن ہی سے بڑی ذہین تھی۔ قدرت نے اسے تو ں ایسی معصومیت اور حوروں ایسا بھولا بھالا نیک چہرہ دیا تھا۔ لوشیا اپنے ماں باپ سے بہت ر کرتی تھی۔ وہ جوان ہوئی تو ماں باپ کو اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ لوشیا کی خوب صورتی کی سارے ں میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ امیر زمیندار نے لوشیا کی شادی اپنے بیٹے سے کرنی چاہی، لیکن لوشیا انکار کر دیا۔ کیونکہ زمیندار کا لڑکا بڑا اوباش اور برے کردار کا تھا۔ زمیندار نے لوشیا کے باپ پنے کھیتوں سے نکال دیا۔ اس غریبی اور بے کاری میں لوشیا کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ غریب باپ ا حسین اور نوجوان بچی کو لے کر شہر میں آ گیا۔ یہاں اس کا ایک رشتے دار کسی کارخانے میں کام کرتا رشتے دار نے کارخانے میں لوشیا اور اس کے باپ دونوں کو کام دلا دیا۔ یہ جرابیں اور بنیانیں نے کا بہت بڑا کارخانہ تھا۔ اس کارخانے کے مالک کا نام مسٹر سمتھ تھا۔ مسٹر سمتھ کی عمر پچاس کے باتھی مگر اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ اس کا امریکہ میں بہت بڑا کاروبار تھا۔ اس

کارخانے کے علاوہ دوسری ریاستوں میں بھی کئی کارخانے تھے۔ مسٹر سمتھ اپنے چار بھائیوں میں سر
بڑا بھائی تھا۔

ایک روز وہ اپنے کارخانے میں گھوم پھر کر مزدوروں کو کام کرتے دیکھ رہا تھا کہ اچانک
کی نظر جوان اور حسین لوشیا پر پڑ گئی۔ وہ اپنی جگہ پر ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا مسٹر سمتھ پر لوشیا کی ج
معصومیت اور خوبصورتی نے اپنا بھرپور وار کر دیا تھا۔ لوشیا کو کوئی خبر نہیں تھی کہ بے خیالی پر
نے کارخانے کے مالک کے دل میں اپنی محبت کا جادو بیدار کر دیا ہے۔ مسٹر سمتھ نے لوشیا سے کو
نہ کی۔ وہ بڑے انہماک سے اپنا کام کر رہی تھی۔ یعنی جرابوں کو ڈبوں میں بند کرتی جاتی تھی۔ سمتھ
میں آگیا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے اپنی سیکرٹری سے کہا کہ دن کی شفٹ میں کام کرنے والے مزدور
فائل لے کر اندر آئے۔ سیکرٹری فائیل لے کر اندر آگئی۔ مسٹر سمتھ نے لوشیا کے بارے میں اند
ساری معلومات حاصل کر لیں۔ پھر ایک روز اس نے لوشیا کے باپ کو ترقی دے کر فورمین بنا دیا۔
اپنے گھر چائے پر بلایا۔

لوشیا کا باپ سمتھ کی دعوت پر اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر آیا۔ لوشیا نے اگرچہ سادہ سا لباس
دکھا تھا۔ مگر وہ بلا کی جاذب نظر اور حسین لگ رہی تھی۔ چائے پر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں
کنکھیوں سے لوشیا کو دیکھتا رہا۔ وہ بڑے سلیقے سے پیالی میں چائے ڈال کر چمچ ہلا رہی تھی۔ وہ لو
سلیقہ مندی اور اچھے آداب سے بڑا متاثر ہوا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ غریبی میں بھی اسے بڑی
تربیت دی گئی ہے۔ چائے کے بعد مسٹر سمتھ لوشیا اور اس کے باپ کو اپنی گاڑی میں خود گھر چھ
گیا۔ کچھ دنوں کے بعد لوشیا کے باپ کو شفٹ انچارج بنا دیا گیا۔ لوشیا کو بھی ترقی مل گئی۔ وہ ش
غریب واڑے سے نکل کر متوسط طبقے کی ایک صاف ستھری آبادی میں آگئے۔

آخر ایک دن مسٹر سمتھ نے لوشیا کے باپ کو ایک اعلیٰ ترین ہوٹل میں کھانے پر بلایا اور ا
مدعا بیان کر دیا۔ مسٹر سمتھ نے کہا:

"میں لوشیا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے شاید آج تک اسی لئے شادی نہیں کی کہ
ایسی لڑکی کا انتظار تھا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں لوشیا کو ہمیشہ خوش رکھوں گا۔"

لوشیا کے باپ نے کہا:

"جناب! میں لوشیا سے پوچھے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔"

گھر واپس آکر اس نے لوشیا سے بات کی تو وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اسے معلوم تھا کہ مسٹر
سمتھ عمر میں اس سے بہت بڑا ہے۔ اس کی عمر انیس برس تھی جب کہ مسٹر سمتھ پچاس برس کا تھا۔ اسے
یہ بھی معلوم تھا کہ اگر اس نے شادی سے انکار کر دیا تو ہو سکتا ہے، مسٹر سمتھ ان دونوں کو نوکری سے
جواب دے دے اور وہ لوگ ایک بار پھر شہروں کے دھکے کھاتے پھریں۔ اس نے اپنے باپ سے
کہا:

"ڈیڈی! آپ کا کیا خیال ہے؟"

باپ نے کہا۔ "بیٹی! فیصلہ تم ہی نے کرنا ہے۔ تم جو فیصلہ کرو گی، مجھے منظور ہوگا۔"

بیٹی کو خبر تھی کہ اگر فیصلہ سمتھ کی مرضی کے خلاف ہوا تو اس کا انجام کیا ہوگا۔ اس نے مسٹر سمتھ سے
شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس خبر نے سارے کارخانے کے کارکنوں کو ایک بار تو حیران کر دیا۔ وہ لوشیا
کی قسمت پر رشک کرنے لگے۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ہو گئی۔ لوشیا اب کارخانے میں کام نہیں
کرتی تھی۔ بلکہ کارخانے کے مالک کی امیر بیوی بن کر اس کے عالیشان بنگلے میں آگئی تھی۔ اس کا باپ
اسی طرح کارخانے میں کام کرتا رہا۔ وہ ایک محنتی محنت کش تھا۔ اس نے ساری زندگی ہاتھ سے کام
کر کے کمائی کی تھی اور وہ ساری عمر خود کما کر کھانا چاہتا تھا۔ شادی کے بعد لوشیا نے اپنے خاوند کی
بڑی دانشمندی اور ذمہ داری کے ساتھ دیکھ بھال شروع کر دی۔ وہ ایک بڑی جی دار، بردبار اور
تحمل مزاج اور سلیقہ شعار بیوی ثابت ہوئی۔ اس نے سارے کارخانے کی دیکھ بھال میں اپنے خاوند کی مدد
کرنی شروع کر دی۔ دو برس بعد لوشیا کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اب وہ اپنے خاندان میں اکیلی رہ گئی
تھی، لیکن اس کے خاوند کی محبت نے اسے باپ کا غم بھلانے میں بڑی مدد دی۔

شادی کو پندرھواں برس جا رہا تھا کہ لوشیا کا خاوند بھی اسے چھوڑ کر ملک عدم کو سدھار گیا
لوشیا نے کالے کپڑے پہن لئے اور خاموش ہو گئی۔ اس کی کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی تھی۔ اب وہ دنیا
میں سچ مچ اکیلی رہ گئی۔ صرف ایک خادمہ مارتھا تھی جو اس کی دیکھ بھال کرتی تھی اور اس کے غم اور
خوشیوں میں اس کی دل سے شریک ہوتی تھی۔ مارتھا ایک حبشی لڑکی تھی اور تقریباً لوشیا کی ہم عمر ہی تھی
مسٹر سمتھ کے مرنے کے بعد اس کی جائیداد کی تقسیم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ساری جائیداد سمتھ کے چاروں

بھائیوں، ان کے بچوں اور دوسرے متعلقہ رشتہ داروں میں تقسیم کرنے کے بعد بھی لوشیا کو اتنی جائیداد مل گئی تھی کہ وہ ساری زندگی آرام سے گذار سکتی تھی۔ دولت بے پناہ تھی اور وہ خود اکیلی تھی۔ اس نے شہر میں کئی ایک ہسپتال اور رفاہی ادارے بنائے اور انہیں ہر سال بڑی بڑی رقمیں ملنے لگیں۔ لوشیا کا دل اب کارخانے کے جھمیلوں اور کاروبار کی الجھنوں سے اکتا چکا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ باقی زندگی کسی پرسکون جگہ پر لکھنے پڑھنے میں گذار دے۔

اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ سمندر کے کنارے کسی ایسے تنہا کاٹج میں جاکر بس جائے جہاں اسے کوئی ملنے نہ آئے۔ بس وہاں بیٹھ کر وہ ناول پڑھا کرے اور ناول لکھا کرے۔ اس کے اندر ایک ناول۔ اپنی زندگی کا ناول لکھنے کی خواہش پیدا ہوگئی تھی۔ لوشیا نے کسی ایسے ہی پرُسکون مقام کی تلاش شروع کر دی۔ وہ ہوائی جہاز میں سفر کرتی ہوئی جگہ جگہ گئی لیکن کوئی بھی مقام اس کے دل کو نہ لگا۔ اس کے دل میں کسی خیالی پراسرار رومانوی مکان کی تصویر تھی۔ ایک ایسا مکان جو سمندر کے کنارے ہو اور سو سال پرانا ہو۔ اس کے ساتھ شادی کرنے پر کئی ایک نوجوان تیار تھے۔ مگر لوشیا نے ایک پریس کانفرنس میں سب کے سامنے اعلان کر دیا کہ وہ اب ساری زندگی شادی نہیں کرے گی اور اپنی باقی زندگی کسی پرُفضا خاموش مقام پر لکھنے پڑھنے میں بسر کر دے گی۔ لوشیا اپنی خادمہ مارتھا کے ساتھ تلاش سکون میں گھومتی گھامتی انگلستان بھی آگئی۔ یہاں اس نے ان علاقوں کا دورہ شروع کر دیا جو سمندر کے کنارے واقع تھے۔ ایک روز اپنی رولز رائیس میں وہ پھرتے پھراتے گرین ہاؤس کے سامنے سے گذری تو اچانک اس کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔

جس چیز کی اسے تلاش تھی، وہ اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑی تھی۔

"مارتھا! مل گیا!"

حبشی خادمہ نے جلدی سے پوچھا۔

"کیا بیگم صاحبہ۔"

"میرے خوابوں کا گھر۔ دیکھو اوہ سامنے دیکھو!"

حبشی خادمہ نے بڑے غور سے مکان کو دیکھا۔ لوشیا گاڑی ڈرائیو کر کے گرین ہاؤس کے گیٹ کے سامنے آگئی۔ گاڑی سے اتر کر وہ مارتھا کے ساتھ گرین ہاؤس کے آہنی دروازے پر آگئی

"دیکھو مارتھا! یہ ہے میرے خوابوں کی تعبیر۔ یہ ہے وہ مکان جس کی تلاش میں، میں ساری دنیا میں ماری ماری پھر رہی تھی۔ بس اب باقی عمر اسی مکان میں بسر ہوگی۔"

مارتھا نے ایک گہرا سانس بھر کر درختوں میں گھری ہوئی گرین ہاؤس کی پرانی، ٹوٹی پھوٹی نیم شکستہ عمارت کو دیکھا اور پھر اس کے گیٹ کے زنگ لگے تالے کو انگلی سے چھو کر ناک چڑھاتے ہوئے بولی۔

"بیگم صاحبہ! یہ تو مجھے پرانے زمانے کی کوئی جیل معلوم ہوتی ہے۔ خدا کے لئے یہاں رہنے کے خیال کو دل سے نکال دیجئے اور کوئی دوسرا مکان دیکھئے۔"

لوشیا نے کہا: "نہیں مارتھا! میں رہوں گی تو اسی مکان میں، نہیں تو ساری زندگی کسی مکان میں قدم نہ رکھوں گی۔"

مارتھا خادمہ تھی۔ وہ اپنی مالکن کے آگے کیسے بول سکتی تھی۔ بیگم صاحبہ کے حکم کے آگے سر جھکا کر خاموش رہی۔ ویسے وہ لوشیا کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھی۔ اسے معلوم تھا کہ لوشیا جس بات کے بارے ایک بار فیصلہ کرے وہ اس پر اڑ جاتی ہے اور پیچھے نہیں ہٹتی۔ ہر چند کہ خادمہ مارتھا گرین ہاؤس آنکھ نہ بھائی تھی، پھر بھی وہ لوشیا کے ساتھ وہاں رہنے پر اپنے آپ کو تیار کرنے لگی تھی۔ کیونکہ اسے معلوم اب باقی عمر اسی پراسرار بے ڈھنگے مکان میں رہنا پڑے گا۔ لوشیا نے خادمہ کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھایا اور سیدھی قصبے کی کمیٹی کے دفتر میں آگئی۔

مائیکل اس کلرک کا نام تھا جو کمیٹی اور کارپوریشن کی متروکہ املاک کے بارے میں کام کرتا تھا۔ یہ ادھیڑ عمر کا گنجا سا انگریز تھا جو امریکنوں کی طرح چاق و چوبند اور پھرتیلا تھا۔ وہ تھا تو انگریز لیکن اپنا رشتہ ایک ایسے امریکی خاندان سے جوڑتا تھا جو کبھی ٹیکساس میں تیل کے کنوؤں کا مالک تھا لیکن پھر اجڑ گیا۔ اس نے جب معلوم کیا کہ ایک امریکن کروڑپتی کی بیوہ اس سے ہاتھ ملا رہی ہے تو وہ اپنی کرسی سے اچھل پڑا۔ اور جیب سے رومال نکال کر کرسی جھاڑتے ہوئے جھک کر بولا:

"تشریف رکھیں۔ بیگم صاحبہ! میری خوش قسمتی ہے کہ آج آپ میرے اس ٹوٹے پھوٹے دفتر میں تشریف لائیں۔ آپ کو یہ جان کر بڑی خوشی ہوگی کہ میں ٹیکساس کے مشہور کیمبل خاندان سے ہوں جو کبھی بادشاہوں کا خاندان تھا لیکن گردش زمانہ کے ہاتھوں منتشر ہوگیا۔ فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

لوشیا اس گنجے پھرتیلے اور چرب زبان کلرک کی باتوں سے بڑی محظوظ ہوئی۔ وہ بڑے اطمینان
سے کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنی سونے کے فریم والی ٹھنڈی عینک اتار کر بولی۔

"یہ بتائیے کہ گرین ہاؤس کس کی پراپرٹی ہے؟"

کلرک مائیکل اس وقت اپنی دراز میں سے قلم اور دوات نکال رہا تھا۔ گرین ہاؤس کا نام سنتے
ہی اس کا ہاتھ وہیں کا وہیں رہ گیا۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولا:

"گرین ہاؤس۔ وہ۔ وہ بھوت ——— میرا مطلب ہے گرین ہاؤس۔"

"ہاں ہاں۔ میرا مطلب اس تنہا کاٹج سے ہے جو یہاں سے دور سمندر کی بھوری چٹانوں کے عقب
میں چیڑھ کے گنجان درختوں میں خاموش کھڑا ہے۔"

مائیکل نے سر کھجاتے ہوئے کہا:

"وہ ——— وہ اس وقت کمیٹی کی ملکیت میں ہے۔ فرمائیے آپ کی شکایت کیا ہے؟" مائیکل
یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کروڑپتی بیوی کو ضرور وہاں سے گذرتے ہوئے کوئی حادثہ پیش آیا ہوگا۔ گرین ہاؤس
کے بھوت نے ضرور اسے بھی تنگ کیا ہوگا۔ لوشیا نے مسکراتے ہوئے کہا:

"مجھے کوئی شکایت نہیں اس دومنزلہ مکان سے۔"

گنجے مائیکل نے رک رک کر پوچھا:

"تو پھر ——— میرا مطلب ہے پھر آپ گرین ہاؤس کے بارے میں کیوں پوچھ رہی ہیں؟"

لوشیا نے کہا:

"میں اس دومنزلہ عمارت کو خریدنا چاہتی ہوں۔"

"خرید ——— خر ——— میرا مطلب ہے کیوں؟"

"میں وہاں رہنا چاہتی ہوں۔"

گنجے مائیکل نے اپنی کہنی میز پر ٹکا رکھی تھی۔ اس کی کہنی میز پر سے پھسل گئی اور وہ گرتے گرتے
بچا۔ اس کی آنکھوں کے اندر نسواری رنگ کے ڈیلوں نے گول گول گردش کی اور پھر اپنی جگہ پر
واپس آکر حسرت بھری اور حیرت بھری نگاہوں سے کروڑپتی امریکی بیوہ کو تکنے لگے۔

"محترمہ! آپ نے اس ملک میں اتنی ڈھیر ساری خوب صورت جگہوں کے ہوتے ہوئے اس

ن ہاؤس کو کس لئے پسند فرمایا؟"

لوشیا نے بڑے آرام سے سانس بھر کر کہا:

"اس لئے کہ مجھے گرین ہاؤس پسند آگیا ہے۔ میں کیلے فورنیا سے ہوائی آئی لینڈ، جاپان، ہانگ کانگ
ام، برما، آسٹریلیا اور یورپ کے خوب صورت شہر میں اپنے رہنے کے لئے کسی پرسکون اور اپنی
ند کے مکان کی تلاش میں یہاں تک پہنچی ہوں۔ کہئیے اس مکان کے دام کیا ہیں؟"

گنجے مائیکل ایک بار گھبرا کر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے میں ایک چکر لگایا۔ اپنے گنجے سر پر
پھیرا پھر دونوں ہاتھ میز پر ٹکا کر لوشیا کو غور سے دیکھا اور واپس اپنی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ لوشیا
کہا:

"معاف کیجئے، آپ کچھ پریشان دکھائی دیتے ہیں۔"

گنجے کلرک ایک بار پھر اٹھا۔ پھر بیٹھ گیا اور میز پر لوشیا کی طرف جھک کر بولا۔

"محترمہ اس دومنزلہ مکان میں ایک بھوت رہتا ہے۔"

"بھوت!" کالی مشن مارتھا کے منہ سے ایک چیخ سی نکلی اور وہ بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئی۔
تو پہلے ہی اس بے ڈھنگے پرانے مکان سے نفرت کرتی تھی۔ اب معلوم ہوا کہ اس میں کوئی بھوت
تا ہے۔ وہ تو سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی۔

"بیگم صاحبہ! خدا کے لئے اس مکان کا خیال اپنے دل سے نکال دیں۔"

"ہوش کرو مارتھا۔ تم پاگل ہوگئی ہو کیا؟"

لوشیا کی ڈانٹ پر مارتھا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ لوشیا نے گنجے کلرک مائیکل کی طرف متوجہ ہو کر
ں سے پوچھا کہ گرین ہاؤس میں کون سا بھوت رہتا ہے۔ گنجے مائیکل نے اٹھ کر کمرے میں ہاتھ
چھے رکھ کر بے چینی سے ٹہلنا شروع کر دیا۔ پھر میز پر جھک کر لوشیا کو بتایا کہ گرین ہاؤس میں کسی
ری جہاز کے کپتان کا بھوت رہتا ہے۔ جو سوا ڈیڑھ سو برس پہلے ایک سمندری طوفان میں اپنے
ہاز سمیت غرق ہو گیا تھا۔

"یہ مکان اسی نے بنوایا تھا۔ تب سے لے کر اب تک اس دومنزلہ عمارت میں کپتان کا بھوت رہتا
ہے۔ وہ تین آدمیوں کو ہلاک کر چکا ہے، طوفانی راتوں میں اس کے چیخنے چلانے کی آوازیں آتی ہیں۔

اندھیری راتوں میں اس کی آسیبی کھڑکیوں پر کوئی موم بتی جلا کر اِدھر اُدھر چکر لگاتا ہے۔ کیا آپ اب بھی اس عمارت کو خریدنا پسند کریں گی؟"

گنجے مائیکل کا خیال تھا کہ کروڑپتی امریکی بیوہ یہ سن کر بھاگ جائے گی۔ مگر جب لوشیا نے اپنی پُرعزم آواز میں مسکرا کر کہا:

"ہاں! میں یہی مکان خریدنا پسند کروں گی۔"

تو گنجہ کلرک ایک بار پھر کرسی پر سے گرتے گرتے بچا۔ اس نے آواز میں سے پائپ نکالا اور اضطراب کی حالت میں اسے تمباکو کے بغیر ہی سلگانے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر اس نے جیب میں سے تمباکو نکالا اور پائپ میں بھرنے لگا۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے یہی حالت حبشی خادمہ مارتھا کی تھی مگر وہ اپنی مالکن کے ڈر سے دبکی بیٹھی تھی۔ لوشیا نے کہا

"میں قصبے کے سب سے بڑے ہوٹل گرینڈ میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ میں خوش ہوں گی۔ اگر آپ آج رات کھانا میرے ساتھ کھائیں اور وہیں رجسٹری وغیرہ بھی ہو جائے گی۔"

کروڑپتی بیوہ کے ساتھ کھانے کی دعوت کا سن کر گنجہ کلرک خوشی سے کِھل اٹھا۔ پائپ بار بار ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا:

"بیگم صاحبہ! یہ میری انتہائی خوش قسمتی ہے کہ میں آج رات آپ کے ہاں کھانا کھاؤں گا۔ میں خود ایک نہایت اُونچے امریکی خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس قسم کی دعوتوں کو ترس گیا ہوں یہ لوگ ہمارے مزاج سے واقف نہیں ہیں۔ میں ضرور حاضر ہوں گا ـــــ لیکن ـــــ" پھر اس نے لوشیا کی طرف جھک کر کہا۔ "لیکن میں ایک بار پھر عرض کروں گا کہ آپ اس عمارت کا خیال دل سے نکال دیں۔"

لوشیا نے کہا: "مسٹر مائیکل! میں اپنے ارادے کی پکی عورت ہوں۔ میں جب کسی شے کے بارے میں فیصلہ کر لیتی ہوں تو پھر اس پر ڈٹ جاتی ہوں۔ میں آج شام کھانے پر آپ کا انتظار کروں گی رجسٹری کے کاغذات ساتھ لانا نہ بھولئے گا۔ میں گرین ہاؤس خرید کر اس کی ادائیگی فوری طور پر نقد ڈالروں میں کر دوں گی۔ خدا حافظ۔"

لوشیا خادمہ کو ساتھ لے کر چلی گئی اور گنجہ مائیکل منہ میں پائپ تھامے بت بنا اسے دیکھتا ہی

رہ گیا۔ ایک بار تو اُسے شک ہوا کہ شاید یہ کروڑپتی بیوہ پاگل ہے پھر اس نے اپنے آپ سے کہا۔ میں بھی امریکی ہوں۔ امریکی پاگل نہیں ہوتے۔

رات کے کھانے پر سودا طے ہو گیا۔

کروڑپتی بیوہ لوشیا نے گرین ہاؤس کی دو منزلہ سو سالہ پرانی عمارت خریدی اور اس کی قیمت نقد ڈالروں میں ادا کر دی۔ گنجے مائیکل نے مچھلی کا قتلہ کھاتے ہوئے لوشیا کی طرف جھک کر اپنی عینک ناک کے بانسے پر ٹھیک کرتے ہوئے کہا:

"محترمہ! کیا واقعی آپ گرین ہاؤس میں رہ لیں گی؟"

"میرا خیال ہے، مسٹر مائیکل اب ہمیں اس موضوع پر زیادہ گفتگو نہیں کرنی چاہیئے۔ مرغ کا شوربہ بھی لیجئے ناں۔"

"شکریہ شکریہ۔"

گنجہ کلرک مائیکل بڑی خاموشی سے مرغ کا شوربہ پینے لگا۔ دوسرے روز لوشیا اپنی خادمہ مارتھا کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر گرین ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئی۔ گرین ہاؤس کے پُرانے زنگ آلود تالے کی اسے ایک پرانی زنگ آلود چابی دے دی گئی تھی۔ لوشیا نے گاڑی گیٹ کے سامنے کھڑی کی۔ اور اپنے ساتھ لائے ہوئے مستری سے کہا کہ وہ چابی لگا کر تالا کھولے۔ مستری زنگ سے بھری ہوئی سیاہ رنگ کی چابی گیٹ کے تالے میں پھنسانے کی کوشش کرنے لگا۔ بڑی مشکل سے وہ تالا الگ کر کے اس نے زور زور سے دھکے لگا کر گرین ہاؤس کے گیٹ کو کھولا۔ صرف آدھا گیٹ ہی کھل سکا۔ باقی آدھا گیٹ زمین میں اگی ہوئی گھاس میں دب گیا تھا۔ لوشیا نے اسے ہدایت کی کہ آج ہی آدمیوں کو بلا کر گھاس وغیرہ کاٹ کر باغ کی ساری جگہ صاف کر دی جائے۔ وہ باغ کی اجڑی ہوئی روش پر سے گذر کر گرین ہاؤس کے لکڑی کے براؤن رنگ کے پرانے دروازے پر آئی۔ حبشی خادمہ مارتھا پیچھے پیچھے ڈری ڈری سی چلی آ رہی تھی۔ گنجہ کلرک مائیکل ڈر کے مارے نہیں آیا تھا۔ اس نے نہ آنے کا کوئی بہانہ بنا لیا تھا اور کہا تھا کہ وہ دوپہر کو رجسٹری کے کاغذات لے کر پہنچ جائے گا۔ حقیقت میں وہ چاہتا تھا کہ مکان میں داخل ہونے پر بھوت نے جو شور شرابا مچانا ہے وہ مچا لے تو جاؤں۔

گرین ہاؤس کا دروازہ کھول کر سب سے پہلے لوشیا اندر داخل ہوئی۔ اس کے بعد مارتھا اور

پھر مستری اندر آیا۔ مستری بھی گھبرا رہا تھا۔ اس نے بھی بڑے بوڑھوں سے سن رکھا تھا کہ اس عمارت میں کپتان کا بھوت رہتا ہے۔ جو تین آدمیوں کو ہلاک کر چکا ہے۔ ڈرائنگ روم گرد سے بھرا تھا۔ پرانے وکٹورین عہد کے فرنیچر پر گرد کی تہہ جمی تھی۔ کارنس پر ایک بحری جہاز کا ماڈل پڑا تھا۔ زمین پر قالین بچھا تھا جو گرد آلود تھا۔ کارنس کے اوپر ایک بحری کپتان کی تصویر تھی۔ یہ کپتان بڑا وجیہ اور باوقار شخصیت کا مالک تھا تیکھی ناک، چمکیلی نیلی آنکھیں، براؤن رنگ کی چھوٹی سی ڈاڑھی اور سر پر سمندری کپتانوں والی ٹوپی ــــ لوشیا نے بڑے شوق سے اس تصویر کو دیکھا اور مستری سے پوچھا:

"یہ کس کی تصویر ہے؟"

مستری نے کہا۔ "یہی وہ کپتان ہے میڈم جو کبھی اس گرین ہاؤس کا مالک تھا۔"

لوشیا نے مسکرا کر کہا۔ "اب سمجھی۔ تو کیا اسی کپتان کا بھوت یہاں لوگوں کو تنگ کرتا پھرتا ہے دیکھوں گی۔ جب یہ بھوت مجھے تنگ کرے گا۔"

مستری اور مارتھا سہم گئے۔ لوشیا نے انہیں حکم دیا کہ فرنیچر، قالین اور دوسری چیزوں کو صاف کیا جائے۔ وہ خود سیڑھیاں چڑھ کر اوپر بیڈ روم میں آگئی۔ اُسے بالکل ڈر نہیں لگ رہا تھا، اس لئے کہ وہ ایک دلیر اور نڈر خاتون تھی۔ ویسے بھی چونکہ اسے یہ مکان بے حد پسند آگیا تھا، اس لئے اس نے دل میں طے کر رکھا تھا کہ وہ گرین ہاؤس کے بھوت سے مقابلہ کرے گی۔ مگر اس کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے گی۔ وہ گرین ہاؤس میں باقی زندگی بسر کرنے کا عزم لے کر آئی تھی۔ بیڈ روم میں ایک بہت شاندار گدّوں والا پلنگ تھا جس کا فریم کانسی کا تھا۔ پلنگ کی چادروں پر بھی گرد کی موٹی تہہ چڑھی تھی۔ تپائی پر زرد چینی کا ایک منہ ہاتھ دھونے والا جگ اور زرد رنگ کا تسلا پڑا تھا۔ بیڈ روم کی جو کھڑکی سمندر کی طرف کھلتی تھی، وہاں میز پر ایک لمبی دوربین رکھی تھی۔ شاید سمندر میں آنے والے جہازوں کو دور سے دیکھنے کے لئے۔ لوشیا نے دوربین میں سے سمندر کی طرف دیکھا۔ سمندر میں دور آسمان کے کناروں تک ہلکی ہلکی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ آتشدان میں خدا جانے کب کی آگ جل کر راکھ ہو چکی تھی۔ کمرے میں ٹھنڈک تھی۔ کارنس پر ایک شمع دان پڑا تھا جس میں جلی ہوئی آدھی موم بتی لگی تھی۔ لوشیا نیچے آگئی۔ اس نے مستری سے کہا:

"آپ گاؤں جا کر کچھ آدمی ساتھ لائیں۔ میں ان سے اس سارے گھر کے کمروں کی صفائی کرانا چاہتی ہوں۔"

مستری نے سر کھجاتے ہوئے کہا:

"بیگم صاحبہ۔ مجھے افسوس ہے۔ گاؤں کا کوئی آدمی بھی اس پراسرار مکان میں داخل ہونے کی جرأت نہ کرے گا۔ میں خود گھبرا رہا ہوں۔ بہتر یہ ہے کہ آپ مجھے اجازت ہی دے دیں۔ میں چار بچوں کا باپ ہوں۔ ابھی مجھے کچھ دیر زندہ رہنا چاہیئے۔ خدا حافظ۔"

یہ کہہ کر مستری چلا گیا۔ مارتھا اپنی مالکن کو تکنے لگی۔

"بیگم صاحبہ۔ بڑا طوطا چشم آدمی تھا یہ۔ مگر وہ بھی سچا تھا۔ اس گھر سے سبھی ڈرتے ہیں۔"

لوشیا نے کہا۔ "تم تو نہیں گھبرا رہی ہو ناں؟"

حبشی خادمہ نے اپنے سیاہ فام چہرے پر سفید سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

"ہرگز نہیں مالکن ہرگز نہیں۔ آپ کے ساتھ مجھے ڈر نہیں لگتا۔"

اصل میں مارتھا بھی اندر سے سخت ڈر رہی تھی کہ جانے کب بھوت ان پر حملہ کر دے۔ اگرچہ ابھی تک اس نے اپنی ایک بھی نشانی نہیں دکھائی تھی۔ تاہم اس کے کسی وقت بھی ظاہر ہونے کا خطرہ سر پر بدستور منڈلا رہا تھا۔ لوشیا نے کہا کہ وہ خود مل کر سارے گھر کی صفائی کریں گی۔ چنانچہ وہ جھاڑ پونچھ میں مصروف ہو گئیں۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ کپتان کے بھوت نے ابھی تک ان کے کسی کام میں مداخلت نہیں کی تھی یا تو وہ اس گھر میں نہیں تھا اور سیر سپاٹے کے لئے باہر گیا ہوا تھا اور زیادہ بڑی خاموشی سے اس تبدیلی کا جائزہ لے رہا تھا۔ دوپہر تک مارتھا نے لوشیا کے ساتھ مل کر ڈرائنگ روم بیڈ روم اور ایک سائیڈ روم کی صفائی کر دی تھی۔ دوسری منزل کے دوسرے کمرے اسی طرح بند پڑے تھے۔ لوشیا کو ابھی ان کمروں کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ باورچی خانے کی بھی جھاڑ پونچھ کر کر دی گئی۔ یہاں پرانی طرز کا ایک بڑا سا چولہا بنا تھا۔ قریب ہی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کٹی ہوئی لکڑیوں کا ڈھیر رکھا تھا۔ بجلی اس دو منزلہ عمارت میں نہیں لگی تھی۔ لوشیا نے مارتھا سے کہا۔

"گنجے کلرک مائیکل آئے تو اُسے کہیں گے کہ مکان میں بجلی لگا کر دے۔ بجلی اور گیس کے بغیر ہمارا گذارہ نہیں ہو سکتا۔ باورچی خانے میں ہم کب تک لکڑیاں جلاتے رہیں گے۔"

اتنے میں باہر موٹر کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ کلارک مائیکل اپنی پرانی کھٹیچر سی موٹر خود چلاتا چلا آرہا تھا۔ آنکھوں کے آگے اس نے ہیٹ کا چھجا کر رکھا تھا۔ گرین ہاؤس کے بڑے آہنی گیٹ کے باہر ہی اس نے گاڑی کھڑی کر دی۔ کھڑکی میں لوشیا کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ مائیکل نے ہاتھ ہلا کر مسکراتے ہوئے سلام کیا۔ پھر اس نے گھبراہٹ کے انداز میں ایک جیب میں سے پائپ نکالا۔ اسے سلگانے کے خیال کو ملتوی کر کے دوسری جیب میں ڈالا۔ رومال سے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھا اور دل ہی دل ہی دل میں خدا کو یاد کر کے گاڑی سے اتر کر گرین ہاؤس کے اجڑے ہوئے ویران باغ میں داخل ہو گیا۔ وہ بھوت کے خیال سے بہت ڈرا ہوا تھا۔ مگر لوشیا پر وہ اپنے خوف کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا، بلکہ الٹا اس پر اپنی دلیری اور بہادری کی دھاک بٹھانا چاہتا تھا۔ گنجا کلارک ایک جھاڑی کے پاس پہنچا تو جیسے کسی نے اس کے آگے ٹانگ کر کے اسے زمین پر الٹا کر دے مارا۔

گنجے کلارک کے ہونٹوں سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ کپڑے جھاڑ کر اٹھا اور پیچھے بھاگنے ہی والا تھا کہ سامنے سے لوشیا آتی دکھائی دی۔

"مجھے بہت افسوس ہے مسٹر مائیکل کو آپ گر پڑے۔ کہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟"

"جی نہیں۔ شکریہ شکریہ۔ گھاس پر سے پھسل گیا تھا۔"

گنجے کلارک نے مسکرانے کی زبردستی کوشش کی اور ہکلاتے ہوئے کہا۔ لوشیا اسے اپنے ساتھ ساتھ ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ یہاں ہر شے اب صاف ستھری اور چمک دار ہو گئی تھی۔ مائیکل نے ہنس کر کہا:

"نیا مکان مبارک ہو خاتون! آپ نے تو بڑی جلدی اسے صاف ستھرا کر لیا۔ اس مکان میں تو صدیوں کی گرد چڑھی تھی۔"

لوشیا بولی۔ "جی ہاں۔ ابھی اس کی مرمت وغیرہ بھی کرنی ہوگی۔ صفائی تو صرف ڈرائنگ روم اور بیڈ روم کی ہے ابھی۔" "تشریف رکھیں مسٹر مائیکل! کیا آپ کاغذات لے آئے ہیں؟"

"جی ہاں! جی ہاں! یہ لیجیے۔ یہاں دستخط کر کے اس کی ایک کاپی آپ اپنے پاس رکھ لیں۔ دوسری کاپی کمیٹی کے ریکارڈ میں محفوظ رہے گی۔"

لوشیا نے رجسٹری کے کاغذات کلارک سے لے کر الماری میں رکھ لئے۔

"آپ کیا پئیں گے مسٹر مائیکل؟ کافی یا چائے؟"

"کافی — کافی ہی ٹھیک رہے گی۔"

گنجے کلارک نے رومال سے گردن پر آیا ہوا پسینہ پونچھ کر کہا۔ وہ گھبرا رہا تھا۔ اسے پکا یقین تھا کہ باغ میں بھوت نے ہی ٹانگ اڑا کر اسے گرا دیا تھا۔ وہ اب اس گھر سے جلدی بھاگ جانا چاہتا تھا۔ لیکن کروڑ پتی امریکی بیوہ کی حسین صحبت بھی اسے بہت پسند تھی۔ وہ اتنی جلدی اس سے جدا بھی نہیں ہونا چاہتا تھا۔ کافی کی چسکی لیتے ہوئے گنجے کلارک نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد لوشیا سے پوچھا:

"بیگم صاحبہ! بھوت نے تو آپ کو نہیں ستایا؟"

لوشیا قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"مسٹر مائیکل! ابھی تک تو کسی بھوت ووت سے میری ملاقات نہیں ہوئی، ہاں اگر اس نے شرف ملاقات بخش دیا تو میں تمہیں یقین دلاتی ہوں۔ دونوں کی یہ بڑی اہم اور دلچسپ ملاقات ہوگی۔"

"کمال ہے۔ کمال ہے — آپ بڑی بہادر خاتون ہیں۔ امریکی بڑے دلیر ہوتے ہیں۔ میں بھی امریکی ہوں۔ ٹیکساس میں میرے پردادا کا تیل......"

اور گنجا مائیکل کوئی سترھویں بار اپنا امریکی شجرہ نسب کھول کر بیٹھ گیا۔ لوشیا نے مارتھا سے کہا کہ باورچی خانے میں جا کر فروٹ کیک لے آئے۔ مارتھا نے سر پر سفید ٹوپی اور گلے میں سفید فرل والا ایپرن پہن رکھا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی سر جھکا کر باورچی خانے کی طرف آ گئی۔

باورچی خانے کی الماری سے فروٹ کیک نکال کر اس نے میز پر رکھا اور خود میز کے دراز میں سے جھک کر چھری تلاش کرنے لگی۔ چھری ہاتھ میں لے کر وہ کیک اٹھانے لگی تو کیک وہاں نہیں تھا بڑی بڑی سفید آنکھیں کھول کر اس نے گھوم کر دیکھا۔ کیک دوسرے میز پر پڑا تھا۔ وہ سر جھکا کر غور کرنے لگی کہ اس نے کیک پہلے میز پر رکھا تھا۔ یہ دوسرے میز پر کون لے گیا؟ کہیں یہ کارستانی بھوت کی تو نہیں؟ گھبرا کر اس نے جلدی سے فروٹ کیک اٹھایا اور باہر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ مائیکل لوشیا کو ابھی تک اپنے امریکی آباؤ اجداد کے بارے میں بتا رہا تھا۔ فروٹ کیک دیکھ کر وہ بڑا خوش ہوا۔

"فروٹ کیک میری دادی بہت اچھا بنایا کرتی تھی۔ میری بڑی بہن بھی کمال کا فروٹ کیک بناتی

تھی لیکن ......"

حبشی خادمہ نے کہا۔

"ابھی ابھی میں نے باورچی خانے میں میز پر کیک رکھا تو وہ غائب ہو گیا اور ....."

اتنا سننا تھا کہ گنجے کلرک کے ہاتھ میں پکڑا ہوا کیک کا ٹکڑا اچھل کر دور جا گرا۔ وہ جیب سے رومال نکال کر ہاتھ صاف کرنے لگا اور کھڑے ہو کر بولا۔ "اچھا بیگم صاحبہ! مجھے اجازت دیں۔ کل وقت حاضر ہوں گا۔"

لوشیا نے کہا۔ "ارے مسٹر مائیکل! آپ نے تو کافی بھی پوری نہیں پی۔"

"شکریہ بیگم صاحبہ! کل پی لوں گا باقی کافی، خدا حافظ! خدا حافظ!....."

گنجا کلرک مائیکل سر پر ہیٹ جمانے کی کوشش کرتے ہوئے گھبراہٹ کے عالم میں کمرے سے باہر نکل گیا وہ تیز تیز قدم اٹھاتا لان میں سے گزرنے لگا۔ باورچی خانے میں گرین ہاؤس کا بھوت ظاہر ہو گیا تھا اور مائیکل کی جان گھبرا رہی تھی کہ کہیں بھوت اس پر حملہ نہ کر دے کیونکہ اس نے بھوت کا مکان کروڑ پتی بیوہ کے حوالے کیا تھا۔ وہ لان میں سے نکل کر گیٹ سے باہر آیا ہی تھا کہ جیسے کسی نے پیچھے سے زور سے دھکا دیا۔ مائیکل اچھل کر گھاس پر گر پڑا۔ اس کا ہیٹ پرے جا پڑا۔ عینک اتر گئی۔ وہ ہ ہو کرتا گھبرا کر اٹھا۔ ٹوپی سر پر رکھی۔ ناک پر عینک جمائی اور ہاتھ اٹھا کر بولا:

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے اسے منع کیا تھا۔ میں بے قصور ہوں۔"

اسے معلوم تھا کہ بھوت اس کے سر پر آن پہنچا ہے۔ پھر اسے ایک تیز اور کرخت آواز سنائی دی:

"تم کون ہوتے ہو۔ میرا مکان فروخت کرنے والے؟ تمہیں یہ حق کس نے دیا؟ کیا تم جانتے نہیں ہو کہ یہ میرا مکان ہے۔ میں اس کا مالک ہوں؟"

مائیکل نے پہلی بار بھوت کی تیز، بھاری اور گمبھیر آواز سنی تھی۔ وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"مسز سمتھ ضدی خاتون ہیں۔ میں نے بہت منع کیا مگر وہ اپنی بات پر اڑی رہیں۔ میں بے گناہ ہوں۔ مسٹر بھوت! میں بے گناہ ہوں۔"

"دفع ہو جاؤ بدبخت چوہے۔"

ایک زور کی دھپ گنجے کلرک کے سر پر پڑی۔ اس کا ہیٹ پچک گیا اور وہ دہائی دیتا تیزی سے گیٹ سے باہر نکل گیا۔ اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے انجن سٹارٹ کر دیا اور اسی میل کی رفتار سے وہاں سے رفوچکر ہو گیا۔ دوپہر گزر گئی۔ شام ہو گئی۔ لوشیا نے ڈرائنگ روم میں اپنے کپڑوں کا صندوق کھولا اس میں سے کپڑے نکال نکال کر الماری میں رکھ رہی تھی۔ مارتھا باورچی خانے میں رات کا کھانا تیار کر رہی تھی۔ گنجے کلرک نے وعدہ کر لیا تھا۔ کہ وہ بہت جلد باورچی خانے میں گیس بھی لگوا دے گا اور بجلی کا بندوبست بھی کر دے گا۔ شام کو سمندر کی طرف سے سرد ہوا چلنے لگی۔ سمندر کی طرف سے سرد ہوا چلنے لگی۔ سمندر کی طرف کھلنے والی تمام کھڑکیاں بند کر دی گئیں۔ لوشیا نے مارتھا کو کمرے کا جھاڑ روشن کرنے کے لئے کہا۔ اس پرانے جھاڑ میں کوئی پچاس کے قریب موم بتیاں لگی تھیں۔ مارتھا نے دیا سلائی جلائی ہی تھی کہ وہ بجھ گئی۔ حبشی خادمہ گھبرا کر لوشیا کے پاس آئی۔

"بیگم صاحبہ! دیا سلائی نہیں جل رہی۔"

"وہ کیسے نہیں جل رہی۔ لاؤ میری طرف۔"

لوشیا نے دیا سلائی جلائی تو وہ جلنے لگی۔

"تم تو یونہی گھبرا رہی ہو مارتھا ــــ جاؤ اب فانوس روشن کر دو۔"

مارتھا نے ڈرتے ڈرتے دیا سلائی رگڑی تو وہ جل اٹھی۔ اس دفعہ اسے کسی نے پھونک مار کر نہ بجھایا۔ فانوس روشن کر کے چھت کے ساتھ لٹکا دیا گیا۔ سو برس کے بعد پہلی بار گاؤں کے لوگوں نے گرین ہاؤس کے ڈرائنگ روم کی کھڑکیوں پر پوری روشنی دیکھی۔ گاؤں میں یہ بات تیزی سے پھیل گئی تھی کہ گرین ہاؤس کسی کروڑ پتی امریکی بیوہ نے خرید لیا ہے اور وہ خود اس میں رہنے کے لئے آ گئی ہے۔ لوگ خوش بھی تھے کہ چلو ایک ویران بھوت گھر آباد ہوا۔ شائد اس طرح سے بھوت وہاں سے چلا جائے۔ اور ان کی جان عذاب سے چھوٹے اور انہیں اندیشہ بھی تھا کہ کہیں یہ امریکی بیوہ بھوت کے انتقام کا شکار نہ ہو جائے۔ اب گاؤں والوں نے دور گرین ہاؤس کی کھڑکیوں پر روشنی دیکھی تو بس دیکھتے ہی رہ گئے۔

رات کا کھانا لوشیا نے ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھ کر کھایا۔ ابھی ڈرائنگ روم گندہ تھا اور اس

قابل نہیں ہوا تھا کہ اس میں لوشیا بیٹھ کر کھانا کھا سکے۔ مارتھا نے بڑے مزے دار کھانے پکائے تھے۔ لوشیا نے کہا:

"مارتھا! کہتے ہیں اس سمندری ساحل کی مچھلیاں بڑی لذیذ ہوتی ہیں۔ کل مارکیٹ جا کر مچھلیاں خرید کر لانا اور ان کے کباب بنانا۔"

"بہتر ہے بیگم صاحبہ۔"

کھانے کے بعد لوشیا کافی پیتے ہوئے شام کا اخبار پڑھتی رہی جو گاؤں میں رات کے پہلے پہر میں آجاتا تھا۔ اخبار میں کروڑپتی بیوہ لوشیا کی تصویر چھپی تھی۔ ساتھ ہی گنجے مائیکل کی تصویر بھی چھپی تھی۔ نیچے خبر تھی جس میں لکھا تھا کہ کروڑپتی امریکی بیوہ مسز لوشیا سمتھ نے سو سالہ پرانا آسیبی گھر گرین ہاؤس خرید لیا ہے۔ لوشیا نے مارتھا سے کہا:

"دیکھو مارتھا! میرے ساتھ اس گنجے ڈرپوک کلرک کی بھی تصویر چھپی ہے۔ تم کہاں بیٹھی تھیں۔ تمہاری تصویر بھی آنی چاہیئے تھی۔ اچھا میں گنجے مائیکل سے پوچھوں گی۔"

مارتھا نے سفید دانتوں کی بھرپور نمائش کرتے ہوئے کہا:

"بیگم صاحبہ! میں اتنی کالی ہوں کہ شاید اخبار پر میری تصویر نہ آسکے۔"

اور پھر خود ہی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ کچھ دیر اخبار پڑھنے کے بعد لوشیا اپنے بیڈ روم میں اوپر چلی گئی۔ بیڈ روم کو اچھی طرح سے صاف کر کے مارتھا نے سفید نئی نکور چادریں بچھادی تھیں۔ آتشدان میں آگ بھی روشن کر دی گئی تھی۔ کارنس پر شمع دان میں بڑی موم بتی جل رہی تھی جس کی سنہری روشنی سارے بیڈ روم میں پھیلی ہوئی تھی۔ لوشیا پلنگ سے ٹیک لگا کر لیٹ گئی اور کتاب پڑھنے لگی۔ سونے سے پہلے وہ ضرور کچھ نہ کچھ پڑھا کرتی تھی۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ ابھی اس نے چھ سات ورق ہی پڑھے ہوں گے کہ موم بتی ایک دم سے بجھ گئی۔ لوشیا نے چونک کر شمع دان میں بجھی ہوئی موم بتی میں سے دھوئیں کی پتلی سی لکیریں اوپر اٹھ رہی تھی۔ لوشیا نے اٹھ کر دیا سلائی سے موم بتی دوبارہ روشن کی اور پلنگ پر آکر بیٹھی ہی تھی کہ موم بتی پھر سے بجھ گئی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ کسی نے اسے پھونک مار کر بجھایا ہے۔ لوشیا نے تیسری بار شمع روشن کی۔ وہ پھر بجھ گئی اب تو لوشیا سمجھ گئی کہ یہ بھوت کی کارستانی ہے۔ اس نے اونچی آواز میں کہا:

"مسٹر بھوت! تم جہاں کہیں بھی کھڑے ہو۔ ایک بات کان کھول کر سن لو کہ میں تمہاری ان توں سے ڈرنے والی نہیں ہوں۔ تم چاہے جو کچھ کر لو۔ میں اس گھر میں ہی رہوں گی۔ سمجھے؟"

لوشیا نے چوتھی بار موم بتی روشن کی تو اسے کسی نے نہ بجھایا۔ وہ پلنگ پر آکر نیم دراز ئی اور پڑھنے لگی۔ اسے کتاب پڑھتے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ کمرے میں جیسے بھونچال سا آ ا، اس کا پلنگ زور زور سے ہلنے لگا۔ وہ ایک دم سے پلنگ پر سے اچھل کر فرش پر آگئی۔ ش بالکل ساکت تھا۔ ظاہر ہے یہ کام بھی بھونچال کا نہیں بلکہ بھوت کا تھا۔ پلنگ ابھی تک رہا تھا اور اس کا سنہری فریم چیخ رہا تھا۔ لوشیا نے کہا:

"مسٹر بھوت! تم مجھے پریشان نہیں کر سکتے۔ میں بڑے مضبوط اعصاب کی عورت ہوں۔ میں زدہ نہیں ہوں گی۔" لوشیا نے پہلی بار بھوت کی آواز سنی۔

"محترمہ! یہ گھر میرا ہے۔ میں اس گھر کا مالک ہوں۔ میں نے آپ کا بہت لحاظ کیا ہے آپ لئے بہتری یہی ہے کہ اپنا بوریا بستر اٹھا کر صبح یہاں سے چلی جائیں۔"

لوشیا نے غصے میں کہا:

"مسٹر بھوت! تم کون ہوتے ہو، ایک زندہ انسان سے اس طرح باتیں کرنے والے تم بھوت ہو۔ میں زندہ انسان ہوں۔ تم مجھے شکست نہیں دے سکتے۔ میں نے تمہیں پہلے بھی کہا ہے اور اب ی کہتی ہوں کہ میں یہاں سے ہرگز ہرگز نہیں جاؤں گی۔ اب جاؤ اور مجھے سونے دو۔"

کپتان کے بھوت کی تیز آواز سنائی دی:

"آپ کو سخت نقصان اٹھانا پڑے گا محترمہ! آپ کی بھلائی اسی میں ہے کہ آپ یہاں سے لی جائیں۔"

لوشیا نے پرعزم لہجے میں کہا:

"میں نے یہ مکان چھوڑنے کے لئے نہیں خریدا۔ میں نے اس لئے خریدا ہے کہ اس میں اری زندگی بسر کروں گی۔ تمہیں میرے خلاف جو کرنا ہے کر لو۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گی؛ شب بخیر۔"

لوشیا پلنگ پر کمبل لے کر لیٹ گئی۔ اس کا منہ کمبل سے باہر تھا اور بڑے غور سے کمرے میں

چاروں طرف دیکھ رہی تھی جیسے کپتان کے بھوت کو تلاش کر کے دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ا/
کے بعد کپتان کے بھوت کی کوئی آواز سنائی نہ دی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ چلا گیا ہے۔ لوشیا نے پھ
کتاب پڑھنی شروع کر دی۔ جب وہ تھک گئی اور اسے نیند آنے لگی۔ تو شمع دان میں جلتی موم بت
بجھانے کے لئے اٹھی۔ ابھی وہ پلنگ سے اٹھی ہی تھی کہ کسی نے پھونک مار کر موم بتی گل کر دی لو
ذرا مسکرائی اور بولی۔ "مسٹر بھوت! تمہارا شکریہ!"

بھوت کی طرف سے کوئی آواز نہ آئی۔ اچانک لوشیا نے سنجیدہ چہرہ بنا کر کہا۔ "مسٹر بھوت!
تم میں اتنی بھی شائستگی نہیں ہے کہ جب ایک شریف خاتون سونے لگے تو اس کے بیڈروم سے چلے جا

بھوت کی آواز بالکل نہ آئی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بیڈروم میں طاری رہی۔ پھر لوشیا
دیکھا کہ دروازہ اپنے آپ ذرا سا کھلا اور پھر اس زور سے بند ہوا کہ کارنس پر شمع دان کپکپا اٹھا۔
ہنس پڑی اور پھر کمبل اوڑھ کر سو گئی۔

صبح گرین ہاؤس کے لان کے درختوں میں چڑیوں کی گنجار کے ساتھ لوشیا کی آنکھ کھل گئی۔ کھڑ
یوں سے سفید سفید روشن دھوپ بیڈروم میں آ رہی تھی۔ لوشیا انگڑائی لے کر اٹھی اس نے اپنے جا
جسم پر پھیلے ہوئے ریشمی شب خوابی کے لباس کو درست کیا اور آئینے کے آگے بیٹھ کر بالوں میں برش
کرنے لگی۔ مارتھا اس کے لئے چائے کی پیالی لے کر آ گئی۔ لوشیا نے اس سے پوچھا کہ رات کیسی گذری!
ڈر تھا کہ کہیں کپتان کے بھوت نے اسے بھی جا کر نہ ڈرایا دھمکایا ہو۔ اس کے الٹ مارتھا نے سفید دان
نکال کر کہا:

"میں تو گہری نیند سوئی رہی بیگم صاحبہ۔"

ناشتے کے بعد لوشیا لان میں آ گئی۔ مارتھا نے بید کی سبز رنگ کی کرسیاں دھوپ میں ڈال
تپائی پر سنہری رنگ کے سنگتروں سے بھری ہوئی سفید پلیٹ رکھ دی۔ لان کی جھاڑیاں آگے آگے۔
صاف کر دی گئی تھیں۔ دھوپ بڑی چمکیلی اور گرم تھی۔ آسمان نیلا اور خوشگوار تھا۔ سمندر کی طرف
بڑی خنک اور نم دار ہوا چل رہی تھی۔ لوشیا نے مارتھا سے کہہ کر اپنا ٹائپ رائٹر باہر ہی منگوا لی
اس کا خیال تھا کہ وہ خوشگوار سنہری دھوپ میں بیٹھ کر اپنا نیا ناول لکھنا شروع کرے گی۔ اس ناول
پلاٹ کئی دنوں سے اس کے دماغ میں چکر لگا رہا تھا۔ مارتھا نے کافی کی ایک پیالی لا کر اس کے پاس

رکھ دی۔ لوشیا نے سفید کاغذ ٹائپ رائٹر پر چڑھایا اور ابھی اس نے پہلی سطر ہی لکھی تھی کہ گنجا کلرک
مائیکل اپنی پھٹیچر کار میں آن وارد ہوا۔ صبح بخیر کہہ کر وہ کرسی کھینچ کر میز کے قریب ہو گیا۔ ہیٹ اتار کر
میز پہ رکھا اور سنگترہ اٹھا کر چھیلتے ہوئے بولا:

"بیگم صاحبہ! آپ کیا لکھنے لگیں صبح صبح؟ کہیں میرے خلاف کوئی شکایت تو ٹائپ نہیں کر
رہیں؟"

لوشیا نے مسکرا کر کہا۔ "میں اپنا ناول شروع کر رہی ہوں۔"

مائیکل بڑا خوش ہوا۔ "بخدا بڑی اچھی بات ہے۔ ناول لکھنے کے لئے تو یہ جگہ بڑی آئیڈیل ہے
کمال کی بات ہے کہ جب میں پہلی بار یہاں آیا تو میرا خیال بھی ناول لکھ کر روزی کمانے کا تھا۔ مجھے امید
ہے آپ یہاں اپنی زندگی کا بہترین ناول لکھ سکیں گی۔"

گنجے مائیکل کی بے جا مداخلت سے لوشیا بور ہو گئی۔ مائیکل نے مارتھا کو آواز دے کر خود ہی کہا
کہ وہ اس کے لئے بھی کافی کی ایک پیالی لے آئے۔ لوشیا نے خندہ پیشانی سے ٹائپ رائٹر بند کر دیا۔
وہ اس بے ضرر سے مسخرے کلرک کو ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے پوچھا کہ وہ کس طرح آیا
ہے۔ مائیکل نے بتایا کہ اس نے گیس اور بجلی لگوانے کا سارا انتظام کر دیا ہے۔ کل سے کاریگر لوگ اپنا
کام شروع کر دیں گے۔ لوشیا نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ گنجے مائیکل نے دوسرا سنگترہ چھیل کر اس کی
ایک قاش منہ میں ڈالی ہی تھی کہ کسی نے ہاتھ مار کر سنگترہ ہوا میں اچھال دیا۔ وہ ہڑبڑا گیا۔ سنگترہ گھاس
پر دور جا گرا۔ وہ سنگترہ اٹھانے کے لئے آگے کو جھکا ہی تھا کہ جیسے کسی نے اس کی پیٹھ پہ زور سے لات
ماری۔ مائیکل اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ وہ خوفزدہ ہو کر اٹھا۔ اپنی ٹوپی گھاس پر سے اٹھا کر جھاڑی
اور سر جھکا کر خدا حافظ کہہ کر وہاں سے بھاگ گیا۔ لوشیا ہنستی رہ گئی۔ جب اس کی موٹر نظروں سے
اوجھل ہو گئی تو لوشیا نے ہوا سے باتیں کرنے کے انداز میں کہا:

"شکریہ مسٹر بھوت! —— اب میں آرام سے اپنا کام کر سکوں گی۔"

بھوت کی بھاری اور چڑچڑی آواز سنائی دی۔

"لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمہیں اس گھر میں رہنے کی اجازت مل گئی ہے۔ میں تمہیں ایک
بار پھر وارننگ دیتا ہوں مسز سمتھ کہ ایک ہفتے کے اندر اندر اس گھر سے واپس چلی جاؤ۔ نہیں تو

انجام کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہوگی۔"

لوشیا غصے میں آ کر بولی۔

"مسٹر بھوت! تم بار بار کی دھمکیاں دے کر مجھے ڈرا نہیں سکتے۔ میں بھی تمہیں آخری بار وارننگ دیتی ہوں کہ میرے معاملات میں دخل دینا بند کر دو اور چپکے سے اس کے گھر اس کونے میں جا کر سو جاؤ جہاں تم ایک سو برس سے سو رہے ہو۔ جاؤ اور اب مجھے کام کرنے دو۔"

بھوت نے کوئی جواب نہ دیا۔ مارتھا ٹھیک اس وقت کافی کی پیالی لے کر پیچھے کھڑی تھی۔ اس کی سفید ڈیلوں والی آنکھیں ہوئی تھیں۔ اس نے ڈرتے ڈرتے چاروں طرف دیکھا اور پھر مالکن سے پوچھا:

"میڈم! آپ کسی سے باتیں کر رہی ہیں؟"

لوشیا نے پلٹ کر مارتھا کو دیکھا اور مسکرا کر کہا:

"نہیں تو — میں تو کسی سے باتیں نہیں کر رہی تھی۔"

مارتھا نے کہا: "میڈم! میں نے خود آپ کی آواز سنی ہے۔ آپ کسی کو ڈانٹ رہی تھیں۔"

لوشیا جلدی سے بولی: "اوہ! دراصل میں ناول کے ایک کردار کی زبان سے مکالمے ادا کر رہی تھی۔ مجھے ناول لکھتے لکھتے بولنے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔"

مارتھا نے کافی کی پیالی میز پر رکھ دی۔ اسے لوشیا کی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ بھوت کا خیال ایک بار پھر مارتھا کے دماغ میں پھرنے لگا تھا۔

"کیا مسٹر مائیکل چلے گئے؟"

"ہاں! انہیں جلدی جانا تھا۔ یہ کافی کی پیالی تم جا کر پی لو ——"

مارتھا کافی کی پیالی اٹھائے سر کو حیرانی سے دائیں بائیں جھٹکتی مکان کے اندر چلی گئی۔ لوشیا نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد ذرا بلند آواز میں پوچھا۔

"مسٹر بھوت! کیا تم چلے گئے ہو؟"

بھوت کی آواز نہ آئی۔ ہاں دوسرے لمحے جیسے کسی نے زور سے پاؤں مار کر سنگتروں والی تپائی گرا دی۔ لوشیا ہنس دی۔

"میں جانتی ہوں، اب تم جا رہے ہو۔"

دوپہر کے کھانے تک لوشیا ناول لکھتی رہی۔ پھر کھانا کھانے اندر آ گئی۔ مارتھا نے اس دوران ڈرائنگ روم کی جھاڑ پونچھ کر کے اسے سجا بنا دیا تھا۔ لوشیا نے دوپہر کا کھانا ڈرائنگ روم میں ہی ایا۔ دوپہر کے بعد بجلی کا ایک انسپکٹر یہ دیکھنے کے لئے آ گیا کہ گرین ہاؤس میں کہاں کہاں بجلی لگوانی ہے مائیکل اس کے ساتھ ہی تھا۔ انسپکٹر ڈرا ہوا تھا۔ اس نے گرین ہاؤس کے بھوت کے بارے میں بہت ڈنے قصے سن رکھے تھے۔ مگر لوشیا نے اسے بھاری معاوضہ دینے کا وعدہ کیا تھا جس کے لالچ میں وہ آ گیا پکٹر بیڈ روم میں داخل ہوا ہی تھا کہ آتشدان کے پاس رکھا ہوا کرچھا اپنے آپ اوپر اٹھا اور دھم سے کی پیٹھ پر پڑا۔ وہ چیخ مار کر بیڈ روم سے بھاگ گیا۔ گنجے مائیکل نے سنا تو وہ بھی گھبرا کر باہر آ گیا۔ یں لوشیا نے انسپکٹر کو بہتیرا سمجھانے کی کوشش کی مگر اس نے ایک نہ سنی اور اپنا فیتہ لپیٹ کر نو دو گیارہ گیا۔ گنجے مائیکل نے ہیٹ اتار کر بڑے ادب سے کہا

"بیگم صاحبہ! اگر مسٹر بھوت کی یہی حرکتیں رہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، اس مکان میں گیس اور بجلی نہ آ سکے گی اور آپ کو باقی عمر موم بتیوں کی روشنی میں بسر کرنی پڑے گی۔"

لوشیا نے مائیکل سے کہا کہ وہ کل کسی دوسرے انسپکٹر اور کاریگروں کو لائے، وہ کوشش کرے کہ ایسا ناخوشگوار حادثہ پھر کبھی نہ ہو۔ مائیکل چلا گیا۔ لوشیا اسی وقت اپنے بیڈ روم میں آئی اور ں نے کھڑکی کے پاس لگی ہوئی دوربین کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر کہا:

"مسٹر بھوت! اگر تم نے اپنے رویے کی معافی نہ مانگی تو میں دُوربین ابھی اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دوں گی۔ میں جانتی ہوں۔ یہ تمہارے ڈیڑھ سو سالہ پرانے بحری جہاز کی یادگار دُوربین ہے اور تم اسے برباد ہوتے نہ دیکھ سکو گے۔"

بیڈ روم کا دروازہ زور سے کھلا اور پھر بھوت کی بوجھل آواز سنائی دی:

"مسز سمتھ! میں اگر چاہوں تو تمہارے ہاتھ سے بڑی آسانی سے دُوربین چھین کر تمہیں کھڑکی سے ہر پھینک سکتا ہوں۔ مگر میں صرف تمہارے لئے ایسا نہ کروں گا۔ برائے مہربانی دوربین کو واپس پنی جگہ پر رکھ دو۔"

لوشیا نے کہا: "پہلے وعدہ کرو کہ تم میرے گھر میں آنے والے کاریگروں کو کچھ نہیں کہو گے۔"

"وعدہ کرتا ہوں۔"

لوشیا نے ہنستے ہوئے دوربین کھڑکی میں سے رکھ دی۔ بھوت کی بارعب آواز پھر گونجی۔

"مگر میں یہ وعدہ ہرگز نہیں کر سکتا کہ تمہیں اس گھر میں رہنے کی اجازت دوں گا۔ تم لوگوں نے اس گھر میں آ کر میرے صدیوں کے سکون کو تباہ برباد کر دیا ہے۔ آخر تم لوگ کسی دوسری جگہ کیوں نہیں چلے جاتے؟"

لوشیا بولی۔ "اس لئے کہ مجھے یہ گھر پسند ہے۔ یہ میرے خوابوں کی تعبیر ہے۔ اور اب تو مجھے تم بھی اچھے لگنے لگے ہو۔"

"شٹ اپ۔"

اس کے ساتھ ہی بیڈروم کا دروازہ زور سے جھنجھنا کر بند ہو گیا۔ بھوت چلا گیا۔ لوشیا ہنستی ہوئی نیچے آ گئی۔ دوسرے روز گرین ہاؤس میں بجلی اور گیس آ گئی۔ ایک ہفتے کے اندر اندر وہاں ٹیلیفون بھی لگ گیا۔ اس دوران میں کپتان کے بھوت نے وعدے کے مطابق کسی کو کچھ نہ کہا۔ اس نے لوشیا سے بھی کوئی بات نہ کی۔ لوشیا نے اپنا ناول آدھے کے قریب لکھ لیا تھا۔ دو ہفتے گذر گئے کپتان کے بھوت کی آواز نہ آئی تو لوشیا بھی کچھ اداس سی ہو گئی ایک روز وہ شام کے وقت بیڈروم میں کھڑکی کے پاس بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ آتشدان میں ہلکی ہلکی آگ جل رہی تھیں۔ سمندر کی لہریں دور تک غروب ہوتی شام کی تاریخی روشنی میں سُرخ ہو رہی تھیں کہ لوشیا کو کمرے میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ لوشیا کا دل یونہی دھڑکنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اس نے آہستہ سے کہا:

"مسٹر بھوت! کیا یہ تم ہو؟"

بیڈروم میں خاموشی چھائی رہی۔ لوشیا نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا تو بھوت کی آواز سنائی دی۔ آج پہلی بار اس کی آواز میں لوشیا کو ایک عجیب قسم کا باوقار ٹھہراؤ اور گھلاوٹ سی محسوس ہو رہی ہے بھوت نے کہا:

"تم مجھے بھوت نہ کہا کرو۔ اگرچہ میں زندہ نہیں ہوں۔ مُردہ ہوں اپنی لاش کا بھوت ہوں۔ اپنی لاش کی رُوح ہوں۔ مگر میرا نام جارج ہے۔ تم مجھے کیپٹن جارج کے نام سے پکار سکتی ہو۔"

لوشیا نے کہا۔ "تمہارا نام معلوم کر کے مجھے خوشی ہوئی ہے کیپٹن جارج! تم اتنے دن کہاں رہے؟"

"اسی گھر میں تھا۔"

"پھر تم نے آواز کیوں نہیں دی؟"

"تم کس لئے آواز دیتا؟ مجھے ضرورت کیا پڑی ہے تمہیں بلانے کی۔ تم میری دوست نہیں ہو۔ تم نے میرے مکان پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے۔ یہ میری مہربانی ہے کہ میں نے تمہیں نہیں کہا۔ کوئی اور ہوتا تو اُسے اٹھا کر سمندر میں پھینک دیتا۔"

لوشیا کا پارہ بھی ایک دم چڑھ گیا۔ اس نے فرش پر پاؤں مار کر کہا:

"کیپٹن جارج! تم بھی غور سے سن لو۔ میں بھی تمہیں اپنا دشمن سمجھتی ہوں۔ تم میرے دوست نہیں ہو۔ تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟ ذرا مجھے اٹھا کر سمندر میں پھینکنے کی کوشش تو کرو۔ خدا کی قسم نانی یاد کروا دوں گی۔"

"اوہ شٹ اپ"

اس کے ساتھ ہی کسی نے بڑے زور سے بیڈروم کا دروازہ بند کر دیا۔ بھوت چلا گیا تھا۔ لوشیا بڑی دیر تک غصے میں اِدھر اُدھر ٹہلتی رہی۔ اس واقعے کو پھر دو ہفتے گذر گئے اور گرین ہاؤس کے بھوت کیپٹن جارج کی آواز پھر سنائی نہ دی۔ لوشیا نے اپنا ناول ختم کر لیا تھا اور اب وہ لندن جانے کی تیاریاں کر رہی تھی تاکہ وہاں ایک پبلشر کو جا کر اپنا ناول چھاپنے کے لئے دے۔ اس عرصے میں اسے کئی بار گرین ہاؤس کے بھوت کا خیال آیا۔ ایک روز وہ ڈرائنگ روم میں کیپٹن جارج کی تصویر کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ جارج بڑا حسین اور پُروقار شخص تھا۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو..... لوشیا کے گال شرم سے سرخ ہو گئے۔ کیپٹن جارج کی نیلی پراسرار آنکھیں لوشیا کو اپنی طرف گھورتی محسوس ہوئیں۔ وہ باہر لان میں آ گئی۔

موسم بہار شروع ہو چکا تھا۔ لان میں جگہ جگہ رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ ہوا میں پھولوں کی میٹھی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ مارتھا باورچی خانے میں رات کے کھانے کا بندوبست کر رہی تھی باورچی خانے کی کھڑکی کے قریب سے گذرتے ہوئے لوشیا نے مارتھا سے کہا کہ وہ ذرا سمندر کے کنارے ٹہلنے جا رہی ہے۔ لوشیا گرین ہاؤس کے لان سے گذر کر ساحل سمندر پر آ گئی۔ سمندر کی لہریں پُرسکون تھیں اگرچہ ہوا میں ٹھنڈک تھی مگر اس ٹھنڈک کو سنہری دھوپ نے کافی حد تک اپنے اندر جذب کر لیا

تھا۔ لوشیا کے سنہری بال سمندری ہوا میں اڑ رہے تھے۔ اچانک لوشیا نے محسوس کیا۔ جیسے کوئی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ اس نے گردن گھما کر بائیں جانب دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ریت پر اس کے ساتھ ساتھ کسی مرد کے قدموں کے بھی نشان پڑ رہے تھے۔ گرین ہاؤس کا بھوت کیپٹن جارج لوشیا کے پہلو بہ پہلو چل رہا تھا۔ وہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن ریت پر اس کے قدموں کے نشان پڑتے چلے جا رہے تھے۔ لوشیا نے مسکرا کر کہا۔ "کیپٹن جارج! دن کتنا حسین ہے!"

بھوت نے کچھ نہ کہا۔ لوشیا نے دوبارہ موسم کی تعریف کی تو کیپٹن جارج کے بھوت نے کہا۔

"میڈم! میرے لئے موسم ہمیشہ خوشگوار رہتا ہے اور دن ہمیشہ حسین رہتے ہیں۔"

لوشیا سٹ پٹا گئی۔ بڑا بددماغ بھوت ہے یہ بھی۔ پھر اس نے کیپٹن جارج کے بھوت سے اپنے ناول کی باتیں شروع کر دیں۔ بھوت نے کہا:

"مجھے معلوم ہے تم کل لندن اپنے پبلشر کے پاس جا رہی ہو، لیکن وہ تمہاری کتاب نہیں چھاپے گا۔"

لوشیا نے ٹُنک کر کہا:

"تمہیں کیسے معلوم ہو گیا کہ وہ میری کتاب نہیں چھاپے گا؟"

بھوت کی آواز سنائی دی۔ "میں وہ کچھ بھی جانتا ہوں جو تم نہیں جانتیں میڈم!"

"تم لندن جا رہی ہو۔ وہاں جا کر تمہیں خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ میں ٹھیک کہہ رہا تھا۔"

"تو پھر تم جہنم میں جاؤ۔"

لوشیا نے غصے سے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دیکھا کہ ریت پر اب کسی مرد کے پاؤں کے نشان نہیں پڑ رہے تھے۔ کیپٹن جارج کا بھوت غائب ہو چکا تھا۔ لوشیا کو کیپٹن جارج کے بھوت کی بات بڑی بُری لگی۔ وہ واپس مکان پر آ گئیں اور لندن جانے کی تیاریاں کرنے لگی۔ اتنے میں گنجے مائیکل کی پرانی کار کے بے ہنگم ہارن کی آواز سنائی دی اور حسب معمول اس کے ہارن کی آواز سن کر لان میں بیٹھی ہوئی سرخ چڑیاں پھڑپھڑا کر اڑ گئیں۔ خادمہ مارتھا نے باورچی خانے سے نکل کر گنجے مائیکل کو ڈانٹا کہ وہ برائے مہربانی اپنی کار کا احمقانہ ہارن نہ بجایا کرے۔ جس کی آواز سے بے چاری لال چڑیاں دانہ دنکا چنتے چنتے ڈر کر اڑ جاتی ہیں۔ گنجے مائیکل نے ہیٹ اتار کر ادب سے جھکتے ہوئے کہا:

"محترمہ! میری موٹر کے ہارن کی آواز سن کر تو پرندے گانا شروع کر دیتے ہیں۔ ہی ہی ہی!"

مارتھا زمین پر پاؤں مار کر واپس باورچی خانے میں چلی گئی۔ مائیکل لوشیا کے پاس ڈرائنگ روم میں آ گیا اور ادب سے سر جھکا کر سلام کرنے کے بعد اسے بتایا کہ لندن جانے کی ٹکٹ خرید لی گئی ہے اور سیٹ بک کرا دی گئی ہے۔ گاڑی صبح آٹھ چالیس پر قصبے کے سٹیشن سے چل پڑتی ہے۔ لوشیا نے ٹکٹ لے کر رکھ لیا اور مائیکل کا شکریہ ادا کیا۔ مائیکل نے کہا کہ شکریہ ادا کرنے کی کیا ضرورت ہے میڈم! پھر ناک سکیڑ کر بولا:

"شامی کبابوں کی خوشبو کہاں سے آ رہی ہے۔"

لوشیا نے ہنس کر مارتھا کو آواز دی کہ وہ شامی کبابوں کی ایک پلیٹ لا کر مائیکل کو چکھائے۔ مارتھا نے ناک بھوں چڑھایا پر کیا کر سکتی تھی۔ شامی کباب لا کر گنجے مائیکل کے آگے رکھ دیئے۔ مائیکل نے خوشی خوشی ایک شامی کباب اٹھا کر ہڑپ کیا اور دوسرا ہاتھ میں لے کر اٹھا اور رخصت لے کر باہر نکل گیا۔ لان میں اس نے دوسرا شامی کباب کھانے کے لئے ہاتھ منہ کے پاس کیا ہی تھا کہ کسی نے جیسے زور سے ہاتھ مار کر شامی کباب دور مٹی میں گرا دیا۔ مائیکل ہڑبڑا گیا۔ سمجھ گیا کہ بھوت سر پر پہنچ گیا ہے:

"معافی چاہتا ہوں مسٹر بھوت! معافی! معافی!"

اور وہ موٹر میں بیٹھ کر قصبے کو بھاگ گیا۔

اگلے روز صبح لوشیا ٹرین کے فسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں سوار لندن کی طرف جا رہی تھی۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ کھیتوں میں دھوپ ابھی پیلی پیلی تھی، لیکن آسمان صاف تھا۔ لوشیا کی سیٹ کے بالکل سامنے ایک بوڑھا انگریز بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ لیکن اس پر لوشیا کے جوان حسن اور سنہرے بالوں والے گداز بدن نے کچھ ایسا جادو کیا کہ وہ اخبار کے پیچھے سے بار بار لوشیا کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک بار لوشیا نے اسے اپنی طرف گھورتے دیکھا تو بڈھا انگریز گھبرا سا گیا اور یونہی سر پر ہیٹ اتار کر موسم کی باتیں کرنے لگا۔ وہ کھسکتا ہوا سیٹ پہ اتنا آگے آ گیا کہ اس کے گھٹنے لوشیا کے گھٹنوں سے ٹکرانے لگے۔ لوشیا کو یہ بہت بُرا لگا۔ اس نے مسکرا کر بڈھے کو پیچھے کر دیا۔ مگر وہ بھی ایک ہی ضدی اور ہوس پرست تھا باتیں کرتے ہوئے پھر آگے کو کھسکتا چلا آیا۔ لوشیا بڑی تنگ آ گئی۔ اچانک کسی نے پیچھے سے بڈھے کا کوٹ پکڑ کر کھینچا۔ وہ گھبرا کر پیچھے پلٹا۔ پیچھے تو کوئی بھی نہیں تھا۔ بڈھا حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر سر جھٹک اخبار پڑھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد پھر اس نے لوشیا سے نظر بازی شروع کر دی

اور آگے کو کھسکنے لگا۔ اب اس کا ایک ہاتھ اخبار کے نیچے سے لوشیا کے گھٹنے پر آگیا۔ لوشیا نے گھٹنا پیچھے کر لیا ہاتھ اور آگے آگیا۔

کسی نے پیچھے سے بڈھے انگریز کے سر پر ایک دو ہتڑ مارا۔ اس کی عینک دور جا گری۔ وہ خوفزدہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کمپارٹمنٹ میں ان دونوں کے سوا اور کوئی نہ تھا اور لوشیا اس کے بالکل سامنے بیٹھی تھی۔ پھر یہ دو ہتڑ کس نے مارا؟ بڈھا انگریز ابھی کچھ سوچ بھی نہ پایا تھا کہ ایک دو ہتڑ اور اس کی پیٹھ پر پڑا۔ وہ اپنی سیٹ پر گر پڑا۔ گرتے ہی وہ اپنی ٹوپی، اخبار اور چھڑی سنبھال کر اٹھا اور بڑی تیزی سے باہر نکل گیا۔ لوشیا ہنس پڑی۔ اس نے آہستہ سے کہا:

"کیپٹن جارج! تمہارا شکریہ!"

گرین ہاؤس کا بھوت لوشیا کے ساتھ اس کے کمپارٹمنٹ میں سفر کر رہا تھا۔ ہوس پرست بڈھے انگریز کی سرزنش اسی نے کی تھی۔ بھوت نے کہا:

"ایسے آدمیوں کو کڑی سزا دینی چاہیئے شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"پھر بھی تم نے مجھے ایک بور شخص کی صحبت سے بچا لیا۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں۔"

"بھوت نے کہا۔" لندن تم فضول جا رہی ہو مسز سمتھ! تمہارا پبلشر تم سے کتاب نہیں لے گا۔"

لوشیا کو پھر طیش آگیا۔ اس نے کہا۔ "نہیں لیتا تو نہ لے۔ تم کون ہوتے ہو میرے معاملات میں دخل دینے والے؟"

لوشیا اونچی آواز میں بول رہی تھی کہ کمپارٹمنٹ میں وہی بڈھا انگریز ایک حبشی کنڈکٹر کو لے کر آگیا۔ کنڈکٹر نے اکیلے کمپارٹمنٹ میں لوشیا کو کسی سے اونچی آواز میں باتیں کرتے سنا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"محترمہ! آپ۔ آپ کس سے باتیں کر رہی ہیں؟"

لوشیا نے پلٹ کر دیکھا۔ سامنے وہی خبیث انگریز اور کنڈکٹر کھڑا تھا اس نے کہا کہ وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ بڈھے انگریز نے کہا۔ یہ جھوٹ کہتی ہے۔ اس نے کوئی چڑیل قابو کر رکھی ہے جس نے مجھے دو ہتڑ مارے ہیں میں ریلوے پر ہرجانے کا دعویٰ کروں گا۔ کنڈکٹر لوکھلا سا گیا تھا۔ اتنے میں ایک دو ہتڑ بڑی زور سے حبشی کنڈکٹر کے سر پر بھی پڑ گیا۔ وہ تو چیخ مار کر کمپارٹمنٹ سے

ہر بھاگا۔ بڈھا انگریز ابھی سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ کسی نے اس کے سر پر سے ہیٹ اچھال کر کھڑکی سے باہر ینک دیا۔ وہ گھبرا کر شور مچاتا باہر نکل گیا۔ لندن کے ایک سٹیشن پر گاڑی رک گئی۔

وہاں اتنا ہجوم تھا کہ کسی کو کسی کی خبر نہ رہی۔ لوشیا بڑے حسین ہلکے سلیٹی رنگ کے لباس میں ڈس تھی۔ اس کے سنہری بال بڑی نفاست سے بنے ہوئے تھے۔ وہ ہجوم میں سے گذرتی سٹیشن سے باہر ئی۔ اس نے ایک ٹیکسی لی اور شہر کی گنجان آبادی میں ایک پبلشر کے دفتر میں آگئی۔ اس پبلشر ے اس کی بات پہلے سے ہو چکی تھی۔ پبلشر بڑی خندہ پیشانی سے لوشیا سے ملا۔ لوشیا نے اسے بنا ناول دکھایا تو اس نے پہلے سے زیادہ خندہ پیشانی کے ساتھ انتہائی معذرت بھرے لہجے میں کہا ہ اسے بہت افسوس ہے کہ کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز نے کل رات ہی فیصلہ کیا ہے کہ ایک برس ے لئے کوئی بھی نئی کتاب شائع نہ کی جائے اور پہلے چھپی ہوئی کتابوں کی فروخت کو منظم کیا جائے۔ شیا کو ایک دم سے کیپٹن جارج کے بھوت کا خیال آگیا۔ کم بخت یہ ساری اسی کی شرارت ہے۔ دگر کل تک تو طے تھا کہ کتاب بڑے اہتمام سے چھاپی جائے گی۔ لوشیا نے کہا کہ وہ اتنی دولت مند ہے کہ نے پلے سے رقم خرچ کر کے ناول چھاپ سکتی ہے مگر وہ چاہتی ہے کہ اس کا پہلا ناول لندن کے مشہور شاعتی ادارے کے زیر اہتمام چھپے۔ پبلشرز نے ایک بار پھر معذرت کرتے ہوئے کہا:

"محترمہ! یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ ہمارے ناچیز ادارے کو اتنی اہمیت دے رہی ہے۔ یقین کریں اگر ہمارے بورڈ آف ڈائرکٹرز یہ فیصلہ نہ کرتے تو میں بڑی خوشی سے آپ کی کتاب بھی پریس بھجوا دیتا۔"

اب لوشیا کو بھوت کا ہلکا سا طنزیہ قہقہہ سنائی دیا۔ بھوت کی آواز سوائے لوشیا کے ور کوئی نہیں سن سکتا تھا۔ لوشیا بھوت کے طنزیہ قہقہے کی آواز سن کر جل ہی تو گئی۔

بھوت نے کہا:

"میں نہ کہتا تھا، یہ ادارہ تمہاری کتاب نہیں چھاپے گا۔ ویسے تم اگر کہو تو یہ کتاب اب بھی چھپ سکتی ہے۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز کا فیصلہ بدلا جا سکتا ہے۔"

لوشیا نے سختی سے کہا:

"میں تمہاری کیا پروا کرتی ہوں۔"

اس جملے پر بے چارہ پبلشر لوشیا کا منہ تکنے لگا۔

"محترمہ! یہ آپ کیا فرما رہی ہیں۔ میں تو......."

لوشیا گھبرا گئی۔ جھٹ پبلشر سے معذرت بھرے لہجے میں کہنے لگی کہ وہ اس سے مخاطب نہیں تھی۔

پبلشر نے اور زیادہ حیران ہو کر کہا کہ پھر وہ کس سے مخاطب تھی؟ کیونکہ کمرے میں سوائے ان دونوں کے اور کوئی نہیں تھا۔ لوشیا کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ بس وہ اتنا ہی کہہ سکی کہ کبھی کبھی اسے دورہ سا پڑتا ہے اور بے اختیار منہ سے کوئی نہ کوئی جملہ نکل جاتا ہے۔ پبلشر بے چارہ حیران سا منہ لیے بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا کہ ایک دم سے فون کی گھنٹی بجی۔ پبلشر نے فون اٹھا کر ہیلو کہا اور پھر بڑے ادب سے گفتگو شروع کر دی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ادارے کے سب سے بڑے افسر سے بات کر رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے فون بند کر دیا اور لوشیا کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا:

"آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی محترمہ کہ بورڈ آف ڈائریکٹرز نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا ہے اور ہم آپ کی کتاب شوق سے چھاپنے کو تیار ہیں۔"

لوشیا بہت خوش ہوئی۔ بھوت کی ہلکی سی ہنسی کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ اس نے کہا "مجھے تم پر رحم آ گیا تھا مسز سمتھ۔"

"شٹ اپ" لوشیا نے جھنجلا کر کہا۔ بے چارہ پبلشر ایک بار پھر ہکا بکا ہو کر لوشیا کا منہ تکنے لگا۔ اب لوشیا کو سوائے اس کے اور کچھ نہ سوجھا کہ وہ کتاب کا مسودہ پبلشر کی میز پر رکھ کر باہر بھاگ جائے۔ اس کے نکلتے ہی ایک کلرک اندر آیا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ پبلشر نے غصے میں جھنجلا کر اسے "شٹ اپ" کہا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

لوشیا وہاں سے نکل کر پیکاڈلی سرکس کے چوک میں ایک کافی ہاؤس میں آ کر بیٹھ گئی۔ اسے خوشی تھی کہ اس کی پہلی کتاب ایک مشہور اشاعتی ادارے کی طرف سے چھاپی جا رہی ہے اور افسوس بھی تھا کہ خواہ مخواہ پبلشر کو غلط فہمی ہوئی۔ اسے بھوت پر بڑا غصہ آ رہا تھا۔ کافی کا ایک پیالہ پی کر وہ ایک بار پھر لندن کے زبردست ہجوم میں گم ہو گئی اس نے جی بھر کے شہر کی مختلف سڑکوں پر گشت کی۔ پھر ایک ٹیوب سٹیشن کے باہر کھڑی ہو کر ٹیکسی کا انتظار کرنے لگی۔ وہ دوپہر کے کھانے سے پہلے

واپس گرین ہاؤس پہنچ جانا چاہتی تھی۔ قصبے کی طرف گاڑی ٹھیک بارہ بجے جاتی تھی اور ابھی ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ریلوے سٹیشن پر کچھ وقت چہل قدمی میں گزار دے گی۔ اتنے میں ٹیکسی اس کے قریب آ کر رک گئی۔

ٹھیک ایک بجے لوشیا اپنے گھر گرین ہاؤس پہنچ گئی۔ لان میں گنجہ مائیکل بڑی بے چینی سے ایک بڈھے کھوسٹ انگریز کے ساتھ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ انہوں نے اُٹھ کر ٹوپیاں اتار کر لوشیا کا خیر مقدم کیا۔ مائیکل نے طوطے کی طرح گردن گھما کر بڈھے انگریز کا لوشیا سے تعارف کروایا۔ معلوم ہوا کہ وہ اس سارے علاقے کی کارپوریشن کا میئر ہے۔ گنجے مائیکل نے لوشیا کو بتایا کہ ڈارلنگٹن کے نواب نے بڑی کرم فرمائی سے اس علاقے کا دورہ کرنے کی دعوت منظور فرمائی ہے اور کارپوریشن نے فیصلہ کیا ہے کہ گرین ہاؤس میں نواب صاحب کو ایک زبردست دعوت دی جائے، کیونکہ اس سارے علاقے میں گرین ہاؤس سے بڑھ کر کوئی بھی جگہ ڈارلنگٹن کے نواب کے شایان شان نہیں ہے۔ بڈھے میئر نے بڑی عاجزی سے کہا:

"ہمیں خوشی ہوگی اور ہم آپ کے بے حد شکر گزار ہوں گے، اگر آپ ہمیں اتنی اجازت دے دیں گے کہ ہم پرسوں شام نواب صاحب کو گرین ہاؤس میں کھانا کھلا سکیں۔"

لوشیا نے پوچھا "مہمانوں کی تعداد کتنی ہوگی؟" گنجے مائیکل نے جلدی سے کہا۔

"یہی کوئی سوڈیڑھ سو کے قریب۔"

بڈھا میئر بولا۔ "آپ کے قیمتی مکان کی کسی شے کو گزند نہیں پہنچے گی۔"

"مہمان دوسری منزل کے ہال کمرے میں کھانا کھائیں گے اور بس اس کے بعد چلے جائیں گے۔"

لوشیا انہیں انکار نہ کر سکی۔ اس نے کہہ دیا کہ مجھے منظور ہے۔ گنجہ مائیکل اور بڈھا میئر بڑے خوش ہوئے۔ بھوت کی بارعب غصیلی آواز سنائی دی۔

"مجھے منظور نہیں۔ میں اس الو کے پٹھے نواب کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ وہ میرے مکان کے بڑے کمرے میں احمق قسم کے انگریزوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائے اور فرش پر ہڈیاں پھینکے۔"

بھوت کی آواز سوائے لوشیا کے اور کوئی نہ سن سکتا تھا۔ وہ جلدی سے بولیں:

«تم کون ہوتے ہو مجھے حکم دینے والے؟»

«میں ——— میں کون ——— ؟» گنجہ مائیکل ہکلاتے ہوئے بولا۔

لوشیا نے جلدی سے کہا۔

«نہیں نہیں میں تمہیں نہیں کہہ رہی تھی۔ میرا مطلب ہے میں ویسے ہی ——— ویسے ہی کہہ رہی تھی۔ آپ لوگ بے شک نواب صاحب کو لے کر آ جائیں۔ مجھے خوشی ہوگی۔»

گنجہ مائیکل فوری طور پر بڈھے میئر کو لے کر گرین ہاؤس سے باہر نکل آیا۔ اسے دال میں کچھ کالا کالا دکھائی دینے لگا تھا اور پیشتر اس کے کہ ساری کی ساری دال ہی کالی ہو جائے، وہ وہاں سے رفو چکر ہو جانا چاہتا تھا۔ جب وہ دونوں چلے گئے تو لوشیا نے بھوت سے مخاطب ہو کر کہا؛

«تم جہاں کہیں بھی ہو کان کھول کر سن لو۔ یہ دعوت گرین ہاؤس کے ہال میں ہوگی اور ضرور ہوگی۔ اس لئے کہ یہ میرا مکان ہے۔ میرا اس مکان پر پورا پورا حق ہے۔

«میں تمہاری دخل اندازی ہرگز برداشت نہیں کروں گی۔»

«دیکھ لوں گا۔»

بھوت کی صرف اتنی آواز سنائی دی۔ آواز میں بڑا غصہ تھا۔ پھر کسی نے زمین پر پڑی ہوئی گھاس میں پانی دینے کی نالی کو زور سے اٹھا کر دور پٹخ دیا۔ لوشیا ہنس پڑی۔ مارتھا نے باورچی خانے کی کھڑکی میں سے پانی دینے والی ربڑ کی نالی کو اپنے آپ فضا میں بلند ہو کر زور سے زمین پر گرتے دیکھ لیا تھا اور اس کا سر چکرا سا گیا۔ وہ پیالی میں دلیہ ڈال رہی تھی۔ اس کا دلیہ ڈالنے والا ہاتھ وہیں کا وہیں رکا رہ گیا۔

گنجہ مائیکل بڑا خوش تھا کہ اس کی کوشش سے میئر کی عزت افزائی ہوئی ہے اور اب وہ نواب صاحب کے آگے بھی سرخرو ہو سکے گا۔ اگلے برس ضرور اس کی ترقی کر دی جائے گی۔ میئر قصبے کے خوب صورت سرکاری ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا۔ گنجہ مائیکل دعوت میں بلائے جانے والے مہمانوں کی فہرست تیار کر کے اسے میئر کے پاس لے جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اس کے کمرے کے دروازے کو کسی نے اس زور سے کھول کر بند کیا کہ اس کے شیشے جھنجھنا اٹھے

گنجہ مائیکل اپنی کرسی پر کانپ گیا۔

«یا خدا خیر ———»

پھر کسی نادیدہ ہاتھ نے اس کی ٹائی اتنی زور سے پکڑ کر کھینچی کہ اس کی گردن کی رگیں پھول گئیں۔ اور آنکھیں باہر کو ابل آئیں۔ اب اسے بھوت کی غضبناک آواز سنائی دی:

«حرام خور گدھے! اگر پھر کبھی تم نے میرے گرین ہاؤس پر لوگوں کی دعوت کا انتظام کیا تو میں تمہاری گردن طوطے کی طرح مروڑ کر گندی نالی میں پھینک دوں گا۔»

مائیکل سمجھ گیا کہ بھوت آ گیا ہے۔ اس کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ آنکھیں ابلی پڑی تھیں۔ موت بالکل سامنے دکھائی دے رہی تھی۔ سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ہاتھ جوڑ کر معافی مانگے۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ بھوت نے ایک جھٹکا دے کر اسے فرش پر گرا دیا۔ دروازہ ایک بار پھر کھل کر بڑے زور سے بند ہوا۔ چپڑاسی بھاگتا ہوا اندر آیا۔ اس کا صاحب فرش پر سے اٹھ کر گلے میں اپنی ٹائی ڈھیلی کرتے ہوئے بری طرح کھانس رہا تھا۔ گنجے مائیکل نے ہاتھ کے اشارے سے اسے پانی لانے کو کہا اور کرسی پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور کھانسنے لگا۔

بڈھا میئر اپنے عالیشان آرام دہ کمرے کے آگے برآمدے میں بید کی کرسی پر گدے میں دھنسا بیٹھا بڑی آن بان سے سگار پی رہا تھا اور ایک فائل پر دستخط کر رہا تھا۔ دستخط کرنے کے بعد اس کو خیال آیا کہ ابھی تک کلرک مائیکل دعوت کے مہمانوں کی فہرست لے کر نہیں آیا۔ اس نے قریب ہی رکھے ہوئے ٹیلیفون کا چونگا اٹھایا اور کمیٹی کے دفتر فون کیا۔ ابھی وہ نمبر ملا ہی رہا تھا کہ جیسے کسی نے جھنجھوڑ کر فون اس کے ہاتھ سے لے کر نیچے پھینک دیا۔ بڈھا میئر صم بکم ہو کر دائیں بائیں تکنے لگا۔ کون ہے؟ کون ہے؟ مگر وہاں تو اس کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ کیپٹن جارج کا بھوت بالکل اس کی کرسی کے پاس کھڑا تھا۔ بڈھے میئر کو بھوت کی ہیبتناک آواز سنائی دی۔

«سنو! اگر پرسوں تم لوگوں نے میرے گھر گرین ہاؤس پر الو کے پٹھے نواب اور دوسرے لوگوں کی دعوت کی تو کارپوریشن کے ٹرک کو سارے کے سارے مہمانوں کی لاشیں اٹھانی پڑیں گی۔ میں ان سب مہمانوں کو نواب اور تمہارے سمیت ہلاک کر دوں گا۔ میں گرین ہاؤس کا بھوت بول رہا ہوں۔

اتنا سننا تھا کہ بڈھے میئر کے ہاتھ سے سگار گر پڑا اور وہ سگار کے ساتھ ہی برآمدے کے فرش

پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔ بھوت کے اس کارنامے کی خبر لوشیا کو بھی ہو گئی۔

اسے بڑا غصہ آیا کہ گرین ہاؤس کی مالک تو وہ ہے۔ کیپٹن جارج کے بھوت کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کے مکان میں منعقد ہونے والی تقریبات کے بارے میں حکم صادر کرے۔ وہ اپنے بیڈروم میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ وہ ہر پانچ منٹ کے بعد بھوت کی آواز دیتی کہ شاید وہ آ گیا ہے۔ کوئی آدھے گھنٹہ بعد بھوت کی آواز سنائی دی:

"میں جانتا ہوں تم کس لئے غصے میں ہو۔"

لوشیا نے زمین پر پاؤں مار کر کہا:

"میں اسے ہرگز پسند نہیں کرتی کہ تم میرے مکان پہ ہونے والی تقریبات کے بارے میں حکم صادر کرتے پھرو۔"

بھوت کی آواز بھی اسی تلخی سے بلند ہوئی۔

"اور میں بھی یہ ہرگز پسند نہیں کرتا کہ تم ہر ایرے غیرے کو گرین ہاؤس میں کھانے کی دعوت دو۔"

لوشیا نے کہا۔ "یہ گھر میرا ہے۔"

بھوت نے کہا۔ "یہ گھر میرا ہے تم پچاس ساٹھ برس بعد مر جاؤ گی۔ اس کے بعد پھر یہ گھر میری ملکیت میں آ جائے گا۔ میں ہمیشہ سے زندہ ہوں اور ہمیشہ زندہ رہوں گا۔ یہ مکان ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا۔"

بھوت کی اس بات پہ لوشیا ایک دم سے خاموش ہو گئی۔ وہ کچھ اداس بھی ہو گئی اسے خیال آیا کہ کیپٹن جارج کا بھوت ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ ایک روح تھی اور روح اذیت میں مبتلا ہو سکتی ہے، لیکن اسے موت کبھی نہیں آ سکتی۔ یہ بات بھوت نے بھی محسوس کی کہ اس کے منہ سے ایک ایسی بات نکل گئی ہے جو اسے لوشیا کے سامنے نہیں کہنی چاہیئے تھی۔ وہ بھی پریشان سا ہو گیا۔ اس نے لوشیا کی دلجوئی کے لئے کہا۔ "میں معذرت خواہ ہوں مسز سمتھ! میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ میں تمہارا دل دکھاؤں۔ اصل میں......."

لوشیا نے ایک اداس مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

"کیپٹن جارج! تم نے ٹھیک کہا۔ میں تو ایک روز مر جاؤں گی۔ پھر یہ مکان تمہارے پاس چلا جائے گا۔ شاید تم میرے مرنے کا انتظار کر رہے ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے لوشیا۔"

"خبردار جو مجھے لوشیا کے نام سے پکارا۔ تمہارے لئے میں مسز سمتھ ہوں۔"

"تو پھر جہنم میں جاؤ۔"

بھوت نے چیخ کر کہا۔ یہ آواز اتنی اونچی اور ڈراؤنی تھی کہ اس کی گونج نیچے باورچی خانے تک گئی جہاں مارتھا آلوؤں کا بھرتہ بنا رہی تھی۔ چمچ اس کے ہاتھ سے گر پڑا اور اس نے بڑی بڑی آنکھیں نکال کر چھت کی طرف دیکھنے شروع کر دیا۔ سوائے گرین ہاؤس کے بھوت کے یہ آواز کسی اور کی نہیں ہو سکتی تھی۔ لوشیا پلنگ پر اوندھی لیٹ گئی اور اپنا حسین چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ اس کا متناسب خوب صورت نازک بدن اس کی ہلکی ہلکی سسکیوں کے ساتھ ہل رہا تھا۔ اچانک لوشیا نے اپنے کندھے پر ایک ٹھنڈے ہاتھ کا بدن میں کپکپی طاری کر دینے والا لمس محسوس کیا۔ اسے اپنے جسم میں موت کی سردی سرایت ہوتی محسوس ہوئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ یہ بھوت کا ہاتھ تھا۔ لوشیا کو اپنے غرور کی تسکین ہوتی محسوس ہوئی۔ بھوت نے جلدی سے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ لوشیا کو بھوت کی ندامت بھری آواز سنائی دی:

"میں معافی چاہتا ہوں مسز سمتھ! میں نے تمہارا دل دکھا دیا۔ مجھے معاف کر دو۔ شب بخیر!"

لوشیا کچھ کہنے والی تھی کہ اسے دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ بھوت جا چکا تھا۔ وہ پلنگ پر سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس آئی اور باہر کھلے سمندر کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پلکوں میں جذب ہو گئے اور ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

اس رات لوشیا نے خواب دیکھا کہ وہ کیپٹن جارج کے ساتھ گہرے سمندروں میں بادبانی جہاز پر سفر کر رہی ہے۔ بادل گرج رہے ہیں۔ بجلی چمک رہی ہے۔ بارش برس رہی ہے سمندر میں زبردست طوفان آیا ہوا ہے۔ ان کا جہاز سمندری موجوں کے رحم و کرم پر ہے۔ کیپٹن جارج

جہاز کو سنبھالنے کی پوری جد وجہد کر رہا ہے۔ پھر اچانک آسمان سے بجلی گرتی ہے اور جہاز دو ٹکڑے ہو کر سمندر میں غرق ہو جاتا ہے۔ لوشیا کیپٹن جارج سے لپٹ جاتی ہے۔ دونوں سمندر کی گہرائیوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ پھر لوشیا نے دیکھا کہ وہ کیپٹن جارج کے ساتھ ایک رتھ پر سوار صحرا کی وسعت میں چلی جا رہی ہے۔ گھوڑوں کے نتھنوں سے جھاگ اڑ رہی ہے۔ اچانک دو شیر پہاڑی پر سے ان پر حملہ کرتے ہیں۔ کیپٹن جارج نے فرعون مصر کا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ تلوار کے ایک ہی وار سے دونوں شیروں کو ہلاک کر دیتا ہے۔ پھر یہ رتھ آسمان پر پھیلے ہوئے سنہری بادلوں میں گم ہو جاتا ہے۔

لوشیا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا، کھڑکی کے باہر رات کے آسمان پر صبح کی ہلکی روشنی کی جھلکیاں نمودار ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ نیلے ستاروں کا رنگ سفید پڑ رہا تھا۔ اس کے دل و دماغ پر کیپٹن جارج کا خیال چھایا ہوا تھا۔ اسے ایک پل کے لئے بھی احساس نہ تھا کہ کیپٹن جارج سو برس ہوئے مر چکا ہے اور اب اس کی روح، اس کا بھوت اس دو منزلہ عمارت میں رہتا ہے وہ بستر پر سے اٹھی اور بڑی خاموشی سے ننگے پاؤں سیڑھیوں کے قالین پر قدم رکھتی نیچے ڈرائنگ روم میں کیپٹن جارج کی تصویر کے سامنے آ گئی۔ تصویر کے سامنے آتے ہی خواب کا طلسم ٹوٹ گیا۔ وہ واپس حقیقت کی دنیا میں آ گئی۔

اس کے دل کو ایک ملال سا ہوا کہ کیپٹن جارج زندہ نہیں بلکہ مردہ تھا۔ کاش وہ زندہ ہوتا، وہ اس سے شادی کر لیتی۔ حقیقت میں اس نے پہلی بار اپنے دل کی دھڑکنوں میں کیپٹن جارج کی محبّت کے دھیمے نغمے کی آواز سنی تھی وہ دیر تک کیپٹن جارج کی تصویر کو دیکھتی رہی۔ تصویر میں کیپٹن جارج بھی لوشیا کو اپنی نیلی پراسرار آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ کارنس پر شمع دان میں بجلی کا بلب روشن تھا۔ جس کی دھیمی روشنی میں لوشیا کو یوں محسوس ہوا جیسے کیپٹن جارج اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا ہے۔

لوشیا نے شرما کر سر جھکا لیا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر واپس اپنے بیڈ روم میں آ گئی وہ یہ سوچ کر کچھ گھبرا گئی کہ کہیں کیپٹن جارج کے بھوت کو اس کے دل کا حال معلوم تو نہیں ہو گیا۔ اس نے اپنا شک دور کرنے کے لئے آہستہ سے جارج کہہ کر بھوت کو آواز دی۔ بھوت نے کوئی جواب نہ دیا۔ لوشیا بڑی خوش ہوئی کہ بھوت کمرے میں نہیں اور اسے اس کے دل کا حال معلوم نہیں ہوا لیکن یہ اس کی بھول تھی۔ کیپٹن جارج کا بھوت لوشیا کے بیڈ روم میں موجود تھا اور کونے میں کھڑا

وقت سے اس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ رہا تھا جس وقت سے لوشیا بیدار ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی نیچے گیا تھا اور اسے اپنی تصویر کو محبت سے گھورتے دیکھتا رہا تھا۔ پھر اس کے ساتھ ہی واپس بیڈ روم میں آیا تھا۔ اس نے لوشیا کی وہ دھیمی محبت بھری آواز بھی سنی تھی جب اس نے سرگوشی میں "جارج" کہہ کر اسے آواز دی تھی۔ لوشیا پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ گئی۔ اب اس کا دل محبت کے شیریں خیالات سے لبریز تھا۔ اس نے سرہانہ اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کے نرم بل میں اپنا حسین چہرہ چھپا لیا۔ ایک ہوک اس کے دل سے اٹھی۔

کاش! کیپٹن جارج زندہ ہوتا!

اس دن لوشیا کچھ اداس اداس سی رہی۔ کسی کام میں اس کا جی نہ لگا۔ رات کو بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے جارج کو بہت یاد کیا۔ کئی بار اس کا نام لوشیا کے ہونٹوں پر آیا مگر اس نے آواز نہ دی۔ شاید وہ اس کا غرورِ حسن یا تمکنت عشق تھی جس نے اس کے ہونٹوں پر اپنی انگلی رکھ دی۔ ایک دو دن چار دن گزر گئے۔ بھوت نے لوشیا کو آواز نہ دی۔ وہ غمگین سی ہو گئی لیکن وہ اوپر سے مارتھا سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی تھی کہ اگر کہیں بھوت موجود ہو تو وہ یہی سمجھے کہ لوشیا بڑی خوش ہے اور اسے بھوت کی آواز کی کمی محسوس نہیں ہو رہی۔

ایک رات وہ اپنے دل میں کیپٹن جارج کے بھوت کا خیال لئے پلنگ پر لیٹ گئی اور ایک تازہ فلمی رسالے کی ورق گردانی کرنے لگی۔ مارتھا سفید اپرن باندھے کافی لے کر آ گئی۔ کھانے کے بعد لوشیا کافی اپنے بیڈ روم میں ہی منگوالی تھی۔ چونکہ زیادہ تر کیپٹن جارج کے بھوت کی آواز بیڈ روم میں ہی آیا کرتی تھی۔ اس لئے اب وہ زیادہ وقت سونے کے کمرے میں ہی گذارتی تھی۔ بالکل اس بے چین عاشق مزاج لڑکی کی طرح جسے اس کے محبوب کے ٹیلیفون کا انتظار ہو۔ رات کا پہلا پہر بڑا حسین تھا۔ آسمان پر اگست کے بادل چھائے ہوئے تھے اور چٹانوں کی طرف سے سمندر کی موجوں کا ہلکا ہلکا شور سنائی دے رہا تھا۔ کافی پیتے ہوئے لوشیا اپنی وفادار خادمہ مارتھا سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ مارتھا اپنی مالکہ کے لئے گرم شال بنتی رہی۔ مارتھا نے بڑے بڑے ڈھیلے گھما کر اچانک دائیں بائیں دیکھا اور پھر جیسے راز بھرے انداز میں کہا۔

"بیگم صاحبہ! خدا کا شکر ہے پھر کبھی بھوت دکھائی نہیں دیا۔ لوگوں نے تو ہمیں بڑا ڈرایا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ ڈر سے میں بھی شروع شروع میں کانپا کرتی تھی مگر اب بالکل نہیں ڈرتی۔ میرا
ہے کہ بھوت ہمارے ڈر سے بھاگ گیا ہے۔"

مارتھا اپنے سفید دانت نکال کر کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ لوشیا کا خیال تھا کہ بھوت
کو اس گستاخی کا مزہ چکھانے کے لئے ضرور آئے گا مگر وہ نہ آیا۔ اب لوشیا کا دل بہت ہی
ہوگیا۔ اسے یقین ہوگیا کہ کیپٹن جارج کا بھوت وہاں نہیں ہے۔ شاید وہ چلا گیا ہے۔ کہیں
ہمیشہ کے لئے تو نہیں چلا گیا؟ لوشیا کا ننھا سا دل اس کے خوب صورت سنگِ مرمر ایسے سینے
اندر زور زور سے دھڑکنے لگا۔

مارتھا کافی کا طشت اٹھا کر شب بخیر کہہ کر نیچے چلی گئی۔ بیڈروم میں لوشیا اکیلی رہ گئی
دیر بعد پلنگ پر لیٹی کتاب پڑھ رہی تھی۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر بیڈروم کی
بجھائی اور سمندر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ بیڈروم کی بتی بجھتے ہی اند
رات کی دھیمی دھیمی سی روشنی کا خاکستری رنگ کا غبار پھیل گیا جو اسے بہت پراسرار لگا۔ دور
میں آسمان پر بجلی کی چمک لہرائی، تھوڑی دیر بعد بادلوں کی ہلکی سی گرج سنائی دی۔ ٹھنڈی ہوا
جھونکا ریشمی گاؤن کے نیچے لوشیا کے عریاں بدن سے ٹکرا کر نکل گیا۔ اسے کپکپی آگئی۔ پھر بادل زور
سے گرجا اور بارش شروع ہوگئی۔ لوشیا نے کھڑکی بند کر دی اور پلنگ پر لیٹ کر کمبل اوپر کر
بارش کی بوندیں کھڑکی کے شیشے سے ٹکرا رہی تھیں۔ بھوری سمندری چٹانوں سے لہروں کے ٹکرا
کا شور بڑھ گیا تھا۔ لوشیا کے دل میں خوف کی ہلکی سی لہر اٹھی۔ وہ اکیلی تھی۔ آج پہلی بار اسے اپنے
اکیلی ہونے کا احساس ہوا تھا۔ اس نے نیچے مارتھا کو فون کر کے پوچھا کہ مکان کے سارے درواز
اور کھڑکیاں اچھی طرح سے بند ہیں؟ مارتھا نے کہا کہ تمام دروازوں اور کھڑکیوں کی اندر
چٹخنیاں لگا دی گئی ہیں۔ لوشیا نے ایک بار پھر مارتھا کو شب بخیر کہا اور فون بند کر دیا۔ ا
سے پہلے کبھی لوشیا نے کھڑکیوں، دروازوں کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ شاید اسے غیر شعور
طور پر یہ احساس رہتا تھا کہ اس مکان میں اس کے علاوہ کیپٹن جارج کا بھوت بھی ہے۔ اب
یہ احساس ماند سا پڑ گیا تھا کیونکہ بیڈروم میں بھوت کی آواز کو گونجے پورے سات دن ہو
گئے تھے۔

لوشیا دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بیڈروم
پراسرار اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس اندھیرے میں کسی کی پرانی یادوں کے سائے بھی سرگوشیاں
سنائی دیتے تھے۔ بجلی چمکی تو بیڈروم ایک بار چکا چوند ہو کر پھر اندھیرے میں ڈوب گیا۔
ساتھ ہی بادل اس زور سے گرجا کہ لوشیا اپنے بستر پر لیٹی لیٹی کانپ اٹھی۔ آج کی رات
کیوں اس کا دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا۔ آج کی رات اسے اکیلے پن کا احساس
تھا۔ بارش بڑے زور سے ہو رہی تھی۔ فضا میں سردی بڑھ گئی تھی۔ لوشیا نے ایک اور کمبل
اوپر لے لیا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی۔ یہی وہ وقت تھا جب چور کی کمند
لوشیا کی کھڑکی کے باہر آکر اٹک گیا۔

چور رسی کے ذریعے آہستہ آہستہ اوپر چڑھتا بارش میں بھیگتا لوشیا کی کھڑکی پر پہنچ گیا۔ پھر وہ
چکنے آہستہ آہستہ اوپر چڑھتا بارش میں بھیگتا لوشیا کی کھڑکی پر پہنچ گیا۔ پھر بادل گرجے اور اس
شور میں وہ کھڑکی کھول کر کمرے میں داخل ہو جائے۔ تاکہ اگر کھڑکی کے کھلنے سے کوئی شور پیدا
وہ بادلوں کی گرج میں دب کر رہ جائے۔ یہ چور اس علاقے کا بڑا نامی گرامی ڈاکو تھا۔ اس
ہاتھوں سے دو ایک قتل بھی ہو چکے تھے۔ پولیس اس کی تلاش میں تھی۔ لیکن وہ مفرور تھا۔ اس
نے کروڑپتی امریکی بیوہ کے بارے میں سن رکھا تھا کہ گرین ہاؤس کے اجاڑ مکان میں آکر ٹھہری
ہے اور اس کے پاس لاکھوں کی مالیت کے ہیرے جواہرات ہیں چنانچہ چور کسی مناسب وقت
انتظار کرنے لگا۔ آج موسم خراب تھا اور اس کے لئے بڑا خوشگوار تھا۔

بجلی چمکی۔ اس کے بعد بادلوں کی گرج بلند ہوئی۔ اس شور میں ڈاکو نے دھکا دے کر بیڈروم
کھڑکی کھول دی اور اندر آگیا۔ اندر آتے ہی وہ زمین پر بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا اور جائزہ لینے لگا
لوشیا کی آنکھیں بند تھیں۔ کھڑکی کھلنے کی آواز سے اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اس نے سوچا کہ
ہوا کے زور کی وجہ سے کھڑکی کھل گئی ہے۔ پھر اسے خیال آیا کہ شاید اس کا محبوب کیپٹن جارج کا
بھوت آیا ہو۔ اس احساس نے اس کے دل میں ایک شمع کی سی روشن کر دی۔ اس نے دھیمے
سے لہجے میں جارج کو آواز دی:

"جارج! کیا یہ تم ہو؟"

اس کے جواب میں بادل زور سے گرجے اور بارش کی بوچھاڑیں تیز ہو گئیں۔ لوشیا نے دیکھا کہ کھڑکی کا کھلا پٹ زور زور سے چوکھٹ کے ساتھ بج رہا ہے۔ جارج کا بھوت کہیں بھی نہ تھا۔ کھڑکی ہوا کے زور سے کھل گئی تھی، اس کی آواز اب اسے پریشان کر رہی تھی وہ پلنگ پر سے اٹھی۔ تاکہ جا کر کھڑکی کو بند کر دے۔ ڈاکو کھڑکی سے ہٹ کر اندھیرے میں پرے ہو گیا۔ لوشیا نے کھڑکی کے پٹ بند کر کے اندر سے چٹخنی لگا دی۔ واپس آ کر وہ پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی کہ ڈاکو پستول تان کر اس کے سرہانے آن کھڑا ہوا۔

"محترمہ! میں اس علاقے کا مشہور قاتل ہوں۔ آپ کے پاس جو ہیرے جواہرات پڑے ہیں وہ میرے حوالے کر دیں نہیں تو مرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔"

لوشیا کے منہ سے حیرت اور خوف کے مارے چیخ سی نکل گئی۔ وہ کمبل ہٹا کر پلنگ سے اٹھنے لگی تھی کہ قاتل ڈاکو نے پستول کی ٹھنڈی نالی لوشیا کی نرم و نازک گردن کے ساتھ لگا دی۔ وہ اسی جگہ پتھر بن کر رہ گئی۔

"محترمہ! میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ کسی کو پکارنے، فون کرنے یا بھاگنے کی کوشش نہ کریں۔ میری ایک ہی گولی آپ کو بڑے اطمینان سے موت کے گھاٹ اتار دے گی۔ کیا آپ کو اس جوانی میں مرتے ہوئے افسوس نہیں ہو گا؟ بہتر یہی ہے کہ اپنے تمام ہیرے جواہرات میرے حوالے کر دیں۔ آپ اتنی مالدار ہیں کہ آپ کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لایئے جلدی کیجئے۔ میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔"

لوشیا نے کہا: "میرے پاس جتنے بھی جواہرات ہیں وہ سارے کے سارے قصبے کے بینک میں جمع ہیں۔ اس وقت میرے سرہانے کے نیچے صرف تین چار سو ڈالر کے نوٹ اور ڈرائنگ روم کی الماری میں ہزار دو ہزار کے نوٹ ہوں گے۔ وہ تم لینا چاہو تو لے سکتے ہو۔"

ڈاکو نے سرد لہجے میں کہا:

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔ محترمہ کروڑپتی بیوہ صاحبہ! ہیرے جواہرات اسی بیڈ روم میں ہیں۔"

لوشیا نے روتے ہوئے کہا:

"میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ جواہرات میرے پاس نہیں ہیں۔ وہ قصبے کے بنک کے لاکر میں جمع ہیں۔"

ابھی لوشیا نے فقرہ ختم ہی کیا تھا کہ ڈاکو نے پوری طاقت سے لوشیا کے گال پر الٹا ہاتھ دے مارا۔ تھپیڑ کی آواز کے ساتھ ہی لوشیا کی چیخ بلند ہوئی اور وہ پلنگ پر گر پڑی۔ بادل بڑے زور سے گرجا۔ ڈاکو نے پستول کی نالی لوشیا کے ماتھے پر رکھ کر غصے میں کہا:

"میں چار تک گنوں گا۔ اگر تم نے جواہرات کا بکس میرے حوالے نہ کیا تو گولی چلا دوں گا۔ ایک دو۔ تین۔"

لوشیا کی چیخ اٹھی۔ "ٹھہرو..... میں سچ کہتی ہوں۔ جواہرات قصبے لاکرز میں ہیں۔ تم مجھ سے اس کی چابی لے سکتے ہو۔"

"بکواس بند کرو۔" ڈاکو غرایا۔ وہ لوشیا کے منہ پر زور سے گھونسا مارنے ہی والا تھا کہ بادل بڑے زور سے گرجا، بجلی چمکی۔ بادل ایک بار پھر شدت سے گرجا۔ اس کی گونج سے کمرے کی کھڑکیاں بج اٹھیں۔ معاً کسی نے ڈاکو کو گردن سے پکڑ کر پیچھے کھینچا۔ اس نے پلٹ کر پستول تان دیا۔ "ہینڈز اپ"۔ کون ہے۔ میں گولی چلا دوں گا۔"

اس کے پیچھے کوئی بھی نہیں تھا۔ لوشیا کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ وہ سمجھ گئی کہ جارج کا بھوت آ گیا ہے، اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "جارج! کیا یہ تم ہو؟"

"کون ہے جارج؟" ڈاکو چلایا۔

لوشیا نے کوئی جواب نہ دیا۔ جارج کے بھوت نے بھی کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے صرف اتنا کیا کہ بڑے آرام سے ڈاکو کے پستول والے ہاتھ کو اپنی لوہے کے شکنجے ایسی طاقتور اور ٹھنڈی یخ مٹھی میں لے کر اسے اتنی سختی سے دبا دیا کہ ڈاکو کے ہاتھ سے پستول نیچے گر پڑا۔ پھر بھوت نے اسے دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھا لیا۔ لوشیا نے دیکھا کہ ڈاکو بیڈ روم کی نیم روشن، نیم اندھیری فضا میں چھت کے قریب ہوا میں معلق ہو گیا ہے۔ ڈاکو ہوا میں ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔ وہ دم بخود ہو گیا تھا کہ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ اسے یہ کون ہے جس نے دونوں ہاتھوں پر اٹھا لیا ہے۔ مگر وہ نظر نہیں آتا۔ پھر اسے خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ گرین ہاؤس کا

بھوت ہے۔ اسے پسینہ آگیا۔ بھوت نے بڑے آرام سے بغیر کچھ سوچے سمجھے اُٹھا کر کھڑکی سے باہر
سمندر کے کنارے پھیلی ہوئی بھوری چٹانوں پر پھینک دیا۔ قاتل کی ایک چیخ بلند ہوئی تو طوفانی
رات کے شور میں کسی کو سنائی نہ دی۔ لوشیا کی جان میں جان آگئی تھی۔ اس نے آنکھوں میں خوشی
کے آنسو بھرتے ہوئے کہا:

"جارج! تم نے میری جان بچالی۔ میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔"

کیپٹن کے بھوت نے کہا۔

"شکریے کی کیا ضرورت ہے مسز سمتھ۔ یہ تو میرا فرض تھا۔"

"پھر وہی مسز سمتھ؟ میں نے تمہیں کئی بار کہا ہے جارج کو مجھے مسز سمتھ کہنے کی بجائے صرف
لوشیا کہا کرو۔"

"لوشیا!"

بھوت نے جیسے دل کی گہرائیوں اور محبت کی سرگوشیوں میں آواز دی۔ لوشیا کا دل کے
ساتھ اس کے حسین جسم کا ایک ایک ذرہ دھڑکنے لگا۔ اس کے ہونٹ گرم ہو کر کپکپانے لگے اور وہ
آگے بڑھی۔

"جارج! تم اتنی دیر کہاں رہے ہو؟"

بھوت نے آہستہ سے کہا:

"لوشیا! کیا تم میرا انتظار کر رہی تھیں؟"

"ہاں جارج! میں اعتراف کرتی ہوں کہ۔ کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔"

بادل اتنی شدت سے گرجا کہ بیڈ روم کی ایک ایک شے جھنجھلا اٹھی۔ بارش کی آواز
پہلے سے زیادہ بہتر ہو گئی۔ بھوت کی آواز آئی:

"مجھ سے محبت کر کے تمہیں کیا مل جائے گا لوشیا؟ مجھ سے محبت کرنا گذرتی ہوا کے جھونکے
سے محبت کرنا ہے۔ جو صرف تمہیں چھو کر گذر جائے گا۔"

لوشیا نے ایک سرد آہ بھر کر کہا:

"اگر ایسا ہے کہ تو پھر ایسے ہی سہی۔ میں گذرتے ہوا کے جھونکے سے پیار کرتی ہوں جو صرف

ے جسم کو چھو کر گذر جاتا ہے۔ اگر تم میری زندگی کے لئے صرف ایک سائے کی حیثیت رکھتے
جارج! تو پھر میں اس سائے سے ہی محبت کرتی ہوں۔"

کیپٹن کے بھوت کی آواز پھر بلند ہوئی:

"اندھیرے میں اپنا راستہ تلاش نہ کرو لوشیا! میری محبت تمہیں سوائے محبت کے اور
نہیں دے سکے گی۔"

"مجھے صرف محبت چاہیئے جارج! تمہاری محبت! مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے۔۔۔۔۔ خدا کے
لئے ایک بار میرے سامنے آجاؤ۔ کیا تم مجھے نظر نہیں آسکتے؟"

کیپٹن جارج کے بھوت نے ٹھنڈی سانس لیا اور کہا:

"کاش میں ایسا کر سکتا لوشیا! یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میں اگر اپنی کپتان کی وردی
میں سامنے آ بھی جاؤں تو تمہاری دنیاوی آنکھیں مجھے نہیں دیکھ سکتیں۔"

"لیکن تم مجھے چھو تو سکتے ہو جارج!"

"ہاں۔ مگر میرا لمس اس قدر سرد ہے کہ تم زیادہ دیر اسے برداشت نہ کر سکو گی۔"

"مجھے اپنے ساتھ لگا لو جارج! میں تمہاری محبت میں اتنی اداس ہوں کہ روتے روتے آنسوؤں
کے طوفان میں بہہ جاؤں گی۔"

پھر لوشیا نے جارج کے لمس کو محسوس کیا۔ ٹھنڈے یخ ہاتھوں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا
۔ جارج کے لمس میں بے انتہا سردی اور ٹھنڈک تھی۔ لوشیا کو یوں لگا جیسے وہ سردی کی سل
کے نیچے ہی نیچے اترتی جا رہی ہے۔ جارج کا بھوت لوشیا سے الگ ہو گیا۔ لوشیا سردی سے کانپ
رہی تھی۔

"کمبل اوڑھ لو لوشیا! تم میرے لمس کو برداشت نہیں کر سکو گی۔ اس لئے میں تم سے دور
ہٹا ہوں۔"

لوشیا نے دونوں کمبل اپنے اوپر کر لئے۔ سردی کی وجہ سے اس کے دانت بج رہے تھے۔
یہ سوچ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے کہ جس سے وہ پیار کرتی ہے، اسے ہاتھ سے چھو بھی
نہیں سکتی۔ بھوت نے بڑی محبت سے لوشیا کے سنہری بالوں میں اپنا ہاتھ پھیرا۔

"لوشیا! میں اس وقت سے تمہیں پیار کرتا ہوں جب تم پہلی بار اس گھر میں آئی تھی۔ لیکن میں اپنی زبان سے اس محبت کا اظہار نہ کر سکا۔ یقین کرو ایک سو سال میں پہلی بار میرا دل کسی کے نام پر دھڑکا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے۔ جیسے میں پھر سے زندہ ہو گیا ہوں اور دوسرے لوگوں کی طرح چلتا پھرتا ہوں۔ سانس لیتا ہوں۔"

"اوہ جارج! میرے جارج!"

یہ کہہ کر لوشیا نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ جارج کے بھوت کا ہاتھ لوشیا کے بالوں سے پھسل کر اس کے نرم و نازک ریشمی گالوں کو پیار سے سہلانے لگا۔ بھوت کا ہاتھ اس قدر ٹھنڈا تھا کہ لوشیا کے سارے بدن میں ایک سنسناہٹ اور تھرتھری سی دوڑ گئی۔ بھوت نے جلدی سے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ بجلی چمک کر بجھ گئی۔ بادل گرج کر اپنے پیچھے ایک بھیانک گونج چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ لوشیا نے جارج کو آواز دی:

"جارج!"

جارج کے بھوت نے جواب نہ دیا۔ وہ جا چکا تھا۔

اگلے روز قصبے کی پولیس کو مشہور مفرور قاتل اور ڈاکو نیج کی لاش چٹانوں کے پاس ملی۔ لوشیا نے پولیس کے سامنے یہی بیان دیا کہ ڈاکو آدھی رات کو اس کمرے میں قتل اور ڈاکے کی نیت سے آیا تھا کہ کھڑکی میں سے نیچے گر پڑا اور مر گیا۔ اس رات جارج کا بھوت پھر لوشیا سے ملنے آیا۔ کھڑکی سے باہر کھلے آسمان پر چاند نکلا ہوا تھا۔ اس کی چاندنی ایک روپہلی چادر کی طرح کھلے سمندر کے سینے پر پھیلی ہوئی تھی۔ جارج کا بھوت اور لوشیا کھڑکی کے پاس میز پر بیٹھ گئے اور بہترین اطالوی وائن کی چسکیاں لیتے ہوئے پیار محبت کی باتیں کرنے لگے۔ جارج کا بھوت اسے سو برس پہلے سمندری مہموں کی کہانیاں سنانے لگا۔ کس طرح وہ اپنا جہاز لے کر جنوبی ہند کے جزائر کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں طوفان آ گیا۔ اس کا جہاز ٹوٹ کر غرق ہو گیا۔ وہ ایک لکڑی کے تختے پر تیرتا ہوا اجنبی خوابوں کے جزیرے میں پہنچ گیا۔

لوشیا اپنی ہتھیلی پر اپنا نازک رخسار رکھے بڑی دلچسپی سے جارج کی باتیں سن رہی تھی۔ اسے جارج دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر اس کی گہری، باوقار محبت بھری آواز نے اس کی

پوری صورت لوشیا کے سامنے کھڑی کر دی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے جارج اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا اسے محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ لوشیا جارج کے بھوت کی محبت بھری آواز میں کھو کر رہ گئی تھی۔ محبت کی آواز میں اسے سمندروں کے طوفان، طوفانوں کی گونج میں اور محبت بھرے دلوں کی سرگوشیاں سنائی دیتی تھیں۔ اس نے اچانک جارج کی بات کاٹ کر کہا:

"جارج کیا تم ہمیشہ اسی طرح مجھ سے محبت کرتے رہو گے؟"

جارج کے بھوت کی ہلکی سی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ اس نے کہا:

"لوشیا! میں تو تمہاری زندگی کے بعد بھی تم سے پیار کرتا رہوں گا۔ بلکہ تمہاری زندگی ختم ہونے کے بعد مجھ سے تمہارا سچا پیار شروع ہو گا۔ میں تو اس دن کی راہ دیکھ رہا ہوں جب تم اس دنیا میں اپنی طبعی عمر گذارنے کے بعد بوڑھی ہو جاؤ گی اور پھر ایک دن اس دنیا سے رخصت ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرے پاس آ جاؤ گی۔"

لوشیا کے بدن میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی۔ کیا میں بوڑھی بھی ہو جاؤں گی؟ کیا بوڑھی ہو کر میرے چہرے پر جھریاں پڑ جائیں گی؟ پھر میں مر جاؤں گی؟ کیا میں زندگی کی لذتیں، مسرتیں اور خوشیاں حاصل کئے بغیر ہی بوڑھی ہو کر مر جاؤں گی؟ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو گا۔ میں جوانی کی خوشیوں اور لذتوں کے سمندر میں دور تک تیرتے ہوئے نکل جاؤں گی۔ لوشیا کو یہ بات بڑی سی عجیب لگی کہ جارج اس کی موت اور اس کے بڑھاپے کا انتظار کر رہا ہے۔ اس کا دل اداس ہو گیا۔

اب جارج کا بھوت روز رات کو لوشیا کے بیڈ روم میں آتا۔ وہ دونوں اطالوی وائن کے پیالے گلاس لے کر سمندر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پاس میز پر بیٹھ جاتے اور پیار محبت کی دھیمی دھیمی سرگوشیوں میں باتیں کیا کرتے۔ کسی وقت جارج اپنا ہاتھ لوشیا کے بالوں پر پھیرتا تو لوشیا کے سر میں سردی کی لہر سی دوڑ جاتی۔ وہ جارج کے بھوت کے ہاتھ کو مس کر سکتی تھی۔ لیکن اس کے ہاتھوں کی انگلیوں کو اس نے کبھی نہیں محسوس کیا تھا۔ نہ ناک، نہ کان اور نہ آنکھیں۔ پھر بھی لوشیا اسے پیار کرتی تھی اور آدھی آدھی رات تک اس سے باتیں کرتی رہتی تھی، بارشوں، سمندری ہواؤں کے طوفانوں اور کرسمس کی برف باریوں میں بھی دونوں کھڑکی

کے ساتھ لگے بیٹھے گرم گرم کافی کی پیالیاں سامنے رکھے باتیں کرتے رہتے۔

برفیں پگھل رہی تھیں کہ لوشیا کو اپنی کتاب کے سلسلے میں لندن جانا پڑ گیا۔ وہ صبح کی گاڑی میں بیٹھ کر لندن پہنچ گئی۔ اپنے پبلشر سے ضروری باتیں کرنے کے بعد اس نے دوپہر کا کھانا پبلشر ہی کے ساتھ کھایا۔ واپس جانے سے پہلے وہ لندن کی سڑکوں پر پیدل آوارہ گردی کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے پبلشر کی گاڑی کو واپس بھجوا دیا اور اکیلی سڑک کے فٹ پاتھ پر ایک طرف کو چل پڑی۔ یہ سڑک آگے جا کر ایک بڑے ہی خوب صورت پارک میں نکل گئی تھی۔ یہاں بڑے ہی پرانے اور گھنے درختوں کے جگہ جگہ جھنڈ کھڑے تھے جن کے سایوں میں کہیں بچے کھیل رہے تھے اور کہیں بوڑھے بنچوں پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ لوشیا کو سنہری دھوپ اور کھلے آسمان تلے یہ پارک بڑا ہی حسین لگا۔ اس کا جی چاہا کہ اس پارک میں کچھ دیر تنہا بیٹھ کر موسم سے لطف اندوز ہو۔ لوشیا پارک کی ایک روش پر چلتی ہوئی اوک کے ایک گنجان درخت کے پاس آ گئی۔ یہاں گل لالہ کی کیاریوں کے پاس سبز رنگ کا ایک بنچ خالی پڑا تھا۔ وہ اس بنچ پر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر بنچ پر بیٹھے رہنے کے بعد لوشیا نے اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ دریا کی طرف آ گئی۔ یہاں ایک خاموش اور پرسکون کنج میں اس نے ایک لمبے بالوں والے دبلے سے آرٹسٹ کو دیکھا جو سٹینڈ پر بورڈ رکھے تصویر بنا رہا تھا۔ لوشیا اس کے قریب سے گذری تو نوجوان آرٹسٹ کی اس پر نظر پڑ گئی۔ لوشیا کے سرخ بالوں اور متناسب جسم نے اسے بڑا متاثر کیا وہ لوشیا کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا ”اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں آپ کی تصویر بنانا چاہتا ہوں۔“

لوشیا نوجوان آرٹسٹ کی اس بے باکی پر دل میں بہت خوش ہوئی۔ وہ آرٹسٹ کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور اس کی تصویر کو دیکھنے لگی۔ یہ تصویر پارک میں کھڑے ایک گنجان درخت کی تھی جس کے نیچے ایک بوڑھا بنچ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ لوشیا کو تصویر بڑی پسند آئی۔ تصویر کے رنگ بڑے شوخ اور زندگی سے بھرپور تھے۔ اس نے کہا:

”تم مجھے اچھے آرٹسٹ معلوم ہوتے ہو۔“

نوجوان آرٹسٹ نے جھک کر لوشیا کی تعظیم کی اور کہا:

”اس عزت افزائی کے لئے میں آپ کا ممنون ہوں۔ لیکن آپ نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ میں آپ کی ایک تصویر بنانا چاہتا ہوں۔“

”وہ کیوں؟“ لوشیا نے جان بوجھ کر پوچھا۔ شاید وہ اس نوجوان سے اپنی تعریف سننا چاہتی تھی۔ آرٹسٹ نے مسکرا کر کہا

”اس لئے کہ آپ کا جسم زندگی کے تر و تازہ جذبات سے بھرپور ہے۔ آپ کی آنکھوں میں سمندروں کی گہرائی ہے اور آپ کے بال چنار کے پتوں کی طرح سرخ ہیں۔ شاید ایسے ہی بال بلکہ جوڈیا سلومی کے تھے۔“

لوشیا نے کسی جیتے جاگتے گوشت پوست کے زندہ انسان کی زبانی اپنے حسن کی اتنی تعریف اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور کانوں کی لوئیں گرم ہو گئیں اس نے بے اختیار کہہ دیا:

”تم میری تصویر بنا سکتے ہو۔“

ازجوان آرٹسٹ خوش ہو کر بولا:

”کیا آپ میرے سٹوڈیو میں جانے کی زحمت گوارا کریں گی۔ میں آپ کو ماڈل بناؤں گا۔“

”لیکن میں تو تھوڑی دیر بعد لندن سے واپس گاؤں جا رہی ہوں۔“

”کیا آپ کل اسی وقت تشریف نہیں لا سکتے۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا شاید یہ تصویر میری زندگی کی بہترین تصویر ہو اور مجھے سالانہ نمائش میں پہلا انعام مل جائے۔“

لوشیا انکار نہ کر سکی۔ ویسے بھی اسے نوجوان آرٹسٹ کے گفتگو کرنے اور لمبے بالوں کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد جھک کر اوپر اٹھانے کا انداز بڑا پسند آ گیا تھا۔ اس نے مسکرا کر کچھ سوچتے ہوئے کہا:

”بہت اچھا۔ میں کل اسی وقت یہاں ملوں گی۔“

آرٹسٹ نے جھک کر کہا:

”میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں محترمہ!“

لوشیا مسکراتی ہوئی وہاں سے آگے چل دی۔ دوپہر کی گاڑی میں بیٹھ کر وہ واپس گرین ہاؤس

آ گئی۔ رات کے کھانے کے بعد وہ بیڈ روم میں آئی تو اس کے کانوں میں نوجوان آرٹسٹ کی باتیں سرگوشیاں کر رہی تھیں اور اس کا یونانی دیوتاؤں جیسا بھرا بھرا خوب صورت چہرہ بار بار آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا۔ آدھی رات کو اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کے پلنگ کے پاس جھکا ہوا ہے۔ لوشیا کو اپنے چہرے پر کسی کے ٹھنڈے سانسوں کی سردی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ ایک دم سے اٹھ بیٹھی۔

"جارج! کیا تم ہو؟"

"ہاں لوشیا! میں ہوں۔"

کیپٹن جارج کے بھوت کی پراسرار آواز سنائی دی۔ جارج کی آواز میں کچھ تھکن کچھ اداسی تھی۔ لوشیا کو خیال آیا کہ شاید بھوت کو پتا چل گیا ہے کہ وہ کل لندن میں نوجوان آرٹسٹ سے ملنے جا رہی ہے۔ اس نے سوچا کہ اسے جارج کو ساری بات بتا دینی چاہیئے۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ لوشیا نے نوجوان آرٹسٹ کے بارے میں جارج کو ساری بات بتائی اور یہ بھی کہا کہ وہ کل لندن جا رہی ہے کیونکہ نوجوان آرٹسٹ اس کی تصویر بنانا چاہتا تھا۔ جارج کی دھیمی سی ہنسی کی آواز آئی:

"بڑی خوشی کی بات ہے لوشیا! تمہیں ہر طرح خوش خوش زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ تم خوش ہوتی ہو تو مجھے بھی خوشی ہوتی ہے۔ شب بخیر!"

جارج کی آواز غائب ہو گئی۔ لوشیا نے ایک دوبارا سے آوازیں دیں۔ لیکن جارج کا بھوت کمرے سے جا چکا تھا۔ اس نے سوچا کہیں جارج نے حسد تو محسوس نہیں کیا؟ کہیں وہ نوجوان آرٹسٹ کو اپنا رقیب تو نہیں سمجھنے لگا؟ لیکن لوشیا کیا کر سکتی تھی۔ وہ جارج کو کس طرح سمجھا سکتی تھی۔ جارج ایک روح تھی جسم کے بغیر اور لوشیا ایک روح تھی جسم کے ساتھ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ زمین پر وہ دونوں ایک ساتھ قدم اٹھا کر نہیں چل سکتے تھے اور لوشیا کو ابھی زمین پر بہت دور تک سفر کرنا تھا۔ دوسرے روز وہ گاڑی میں سوار ہو کر جانے کی بجائے اپنی بڑی موٹر میں بیٹھ کر لندن کی طرف روانہ ہو گئی۔ آج اس نے بڑے شوخ رنگ کے مختصر سے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے گلے کا نیلا سکارف اور سر کے سرخ بال ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ وہ ستر میل

ھنٹہ کی رفتار پر سڑک پر لندن کی طرف اڑی جا رہی تھی۔ آدھے گھنٹے سے بھی پہلے اس کی ر لندن کے خوب صورت پارک کے گیٹ میں داخل ہو کر ایک طرف کار پارک پر کھڑی ہو ۔ وہ وقت سے کچھ پہلے آگئی تھی۔ اس نے دریا کے کنارے بڑے درخت کے پاس جا کر ا کہ نوجوان آرٹسٹ بھی وقت سے کچھ پہلے آگیا تھا اور ایک بنچ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا شیا کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ تعظیماً اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے جھک کر لوشیا کو سلام کیا بولا کہ اس کی مالک مکان بہت شور مچا رہی تھی۔ وہ اس سے تنگ آکر وقت سے پہلے ہی ۔ کچھ اسی قسم کا بہانہ لوشیا نے بھی بنایا۔ ان کی اس بہانہ سازی سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ایک سرے کو ملنے کے لئے بے تاب ہو رہے تھے۔ لوشیا کو ساتھ لے کر نوجوان آرٹسٹ کار پارک رف آگیا۔ لوشیا کی بڑی گاڑی دیکھ کر وہ کچھ حیران سا ہوا۔ اس نے لوشیا کی سماجی حیثیت بارے میں کچھ ہلکی قسم کی رائے قائم کر رکھی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ شاید یہ امریکی عورت لندن لسی دوست کے ساتھ سیر سپاٹا کرنے آئی ہے۔ لوشیا کی کار دیکھ کر وہ بولا:

"بڑی خوب صورت کار ہے آپ کی۔"

لوشیا مسکراتے ہوئے بولی۔ "تمہیں پسند ہے تو لے لو۔ میں دوسری گاڑی لے لوں گی۔"

نوجوان آرٹسٹ کا آدھا منہ کھلا ہی رہ گیا۔ یہ ایک مذاق کا جملہ تھا، لیکن اگر نوجوان سٹ ہاں کرتا تو لوشیا ضرور کار کی چابی اس کے حوالے کر دیتی۔

آرٹسٹ نے مسکرا کر کہا:

"میرا خیال ہے میرا غریبانہ سٹوڈیو اس لائق نہیں کہ وہاں آپ ایسی اونچے خاندان ماتون ماڈل بنے۔"

لوشیا نے نوجوان کا ہاتھ پکڑ کر اسے گاڑی میں بٹھاتے ہوئے کہا:

"مجھے تمہارے سٹوڈیو میں جا کر خوشی ہوگی۔"

لوشیا خود کار ڈرائیو کر رہی تھی۔ آرٹسٹ اسے راستہ بتاتا چلا جا رہا تھا۔ فراخ سڑکوں سے ہوتے ہوئے گاڑی لندن کے گندے مندے علاقے میں داخل ہو گئی۔ لوشیا پہلے اس قے میں کبھی نہیں آئی تھی۔ آرٹسٹ نے کھسیانہ سا ہو کر کہا:

"محترمہ! میں ایک غریب آرٹسٹ ہوں۔ میں اونچے علاقے کے فلیٹ میں نہیں رہ رہا۔ مجھے اُمید ہے آپ میرے ساتھ اس علاقے میں آنے پر مجھے معاف کر دیں گی۔"

"کوئی بات نہیں ہے۔ آخر یہاں بھی انسان رہتے ہیں۔"

آرٹسٹ کا سٹوڈیو کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا تھا۔ یہ ایک بینگی ٹیڑھی چار منزلہ عمارت کی تیسری منزل پر تھا۔ جگہ جگہ رنگ بکھرے تھے۔ آرٹسٹ نے ایک کرسی کی گرد جھاڑ کر لوشیا کو اس پر بیٹھنے کے لئے کہا اور خود ایک الماری میں سے ڈرائنگ کی چیزیں نکال کر میز پر رکھنے لگا۔ پھر سگریٹ بجھا کر بولا:

"سب سے پہلے تو میں آپ کے لئے کافی بناؤں گا۔"

"ضرور" لوشیا نے کہا۔ "لیکن ہم نے ایک دوسرے کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔ میرا نام لوشیا ہے۔ میں امریکہ سے یہاں سیر و سیاحت کرنے آئی ہوں۔"

نوجوان آرٹسٹ نے کہا:

"اور میرا نام الفریڈ ہے۔ میں آرٹسٹ ہوں۔ ایک غریب آرٹسٹ۔ ایک غریب ریلوے مزدور کا بیٹا۔ جس کا اس دنیا میں اب کوئی نہیں اور خدا کا شکر ہے کہ میرا کوئی نہیں ہے۔ غریب اور آزاد ہوں۔ میں تصویریں بناتا ہوں انہیں بیچ کر جو دو چار پیسے مل جاتے ہیں ان سے اپنی گذر اوقات کرتا ہوں۔"

لوشیا نے کہا۔ "مجھے تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی الفریڈ! تم اگر چاہو تو مجھے صرف لوشیا کے نام سے پکار سکتے ہو۔"

"ہیلو لوشیا!"

"ہیلو! الفریڈ۔"

دونوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے اور الفریڈ نے بڑی بے باکی کے ساتھ لوشیا کو اپنے ساتھ لگا کر اس کے سرخ ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے لوشیا کو یہ بہت ا لیکن وہ تڑپ کر پرے ہٹ گئی۔

"تم بڑے اکھڑ ہو گئے الفریڈ!"

الفریڈ نے اسی وقت ایک ٹوٹی ہوئی چینک میں کافی بنائی۔ دونوں کافی پیتے رہے الفریڈ نے لوشیا کو اپنی بنائی ہوئی واٹر کلر اور آبی رنگوں کی تصویریں دکھائیں جو لوشیا کو بہت پسند آئیں۔ لوشیا نے الفریڈ سے پوچھا:

"تمہارا کیا خیال ہے میرے بارے میں الفریڈ؟"

الفریڈ نے سگریٹ کا کش لگا کر دھوئیں کے چھلے بناتے ہوئے کہا:

"تم ایک بے حد خوب صورت جسم والی حسین عورت ہو اور میری طرح فاقہ زدہ نہیں ہو۔ شاید یہ گاڑی تمہاری ہے اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ تمہارے کسی دوست کی ہو۔ لیکن مجھے تمہاری دولت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے صرف تمہارے سرخ بالوں اور تمہارے خوب صورت جسم سے دلچسپی ہے۔ میں تمہیں پینٹ کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ تم پیدا ہی اس لئے ہوئی کہ تمہیں پینٹ کیا جائے۔ تمہاری تصویر بنا کر اسے پیرس کی سب سے بڑی گیلری میں رکھا جائے۔ میرا خیال ہے میں نے اپنے خیالات تم پر اچھی طرح واضح کر دیئے ہوں گے۔"

لوشیا نے یہ باتیں ساری زندگی کسی سے نہیں سنی تھیں۔ اس کی نوجوانی غریب باپ کے سائے میں غریبی سے جنگ کرتے گذری تھی۔ جوان ہوئی تو اُسے ایک کروڑپتی بڈھے خاوند کو سنبھالنا پڑا جس کے جذبات سرد پڑ چکے تھے۔ بیوہ ہوئی تو ایک ایسے شخص نے اس سے اظہار محبت کیا جو مر چکا تھا جو صرف اس کے کانوں تک اپنے ٹھنڈے سانس کا لمس پہنچا سکتا تھا جو اسے چھو بھی نہیں سکتا تھا اور جس کو وہ خود بھی نہیں چھو سکتی تھی۔ الفریڈ کی باتوں نے لوشیا کو زندگی کے ایک انتہائی روشن اور حسین پہاڑ کی چوٹی پر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ لوشیا اپنے جسم میں زندگی کی گرم اور تیز رو حرارت محسوس کر رہی تھی۔ اس نے کافی کا گھونٹ پی کر الفریڈ کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا:

"الفریڈ! تمہاری باتوں سے مجھے بڑا سکون، بڑی خوشی مل رہی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اسی طرح باتیں کرتے جاؤ اور میں سنتی رہوں، پہروں بیٹھی سنتی رہوں۔ ہماری ملاقات کو آج دوسرا دن ہے۔ لیکن مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔"

الفریڈ نے آگے بڑھ کر لوشیا کے بالوں کو چوم لیا۔

"مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔"

آرٹسٹ کی کھلی کھڑکی میں سے ہوا کا ایک تیز جھونکا اندر آیا اور دیوار کے ساتھ لگی ہوئی ایک تصویر دھڑام سے فرش پر گر پڑی۔ الفریڈ اور لوشیا نے حیران ہو کر تصویر کو دیکھا۔ کیونکہ اس وقت باہر بالکل ہوا نہیں چل رہی تھی۔ الفریڈ نے اٹھ کر تصویر پھر سے ٹانگ دی۔

"یہ ہوا کہاں سے آ گئی؟"

لوشیا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ ہوا کہاں سے آئی ہے اور اس ہوا کے ساتھ کون سٹوڈیو میں آیا ہے۔ یہ جارج تھا۔ جارج کی روح تھی۔ گرین ہاؤس کا بھوت تھا جسے لوشیا کا الفریڈ سے اظہار محبت اچھا نہیں لگا تھا لوشیا نے چاہا کہ وہ جارج سے مخاطب ہو کر کہے کہ وہ الفریڈ کے آگے دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی ہے۔ مگر وہ خاموش رہی۔ الفریڈ کے سامنے وہ جارج سے کوئی بات نہیں کر سکتی تھی۔

الفریڈ نے اس روز لوشیا کے کتنے ہی پنسل سکیچ بنائے۔ سکیچ بڑے مکمل تھے اور ان کے خطوط بڑے اثر انگیز اور اظہار کی شدت سے بھرپور تھے۔ لوشیا جانے کے لئے اٹھی تو آرٹسٹ الفریڈ نے اس کا ہاتھ تھام کر چوم لیا اور کہا کہ وہ کل بھی ضرور آئے۔ لوشیا نے پوچھا کہ کیا کل آنا ضروری ہے؟

الفریڈ نے کہا:

"ہاں لوشیا! ایسا لگتا ہے کہ اب تمہارا ہر روز آنا ضروری ہے۔ کیا تم کل آؤ گی؟"

"ہاں! ضرور آؤں گی۔"

لوشیا چلی گئی۔ الفریڈ اسے چھوڑنے نیچے سڑک تک آیا۔ لوشیا اپنی شاندار گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی۔ بلڈنگ کی مالکہ بڑی تیز نگاہوں سے ان دونوں کو الوداعی کلمات کہتے دیکھتی رہی۔ جب لوشیا چلی گئی تو ملکہ نے الفریڈ کو جھڑک کر کہا:

"کم بخت! یہ کس نواب زادی کو پھانسا ہے؟ خیر مجھے تو اپنے کرائے سے غرض ہے۔ تم جاؤ جہنم میں۔ لاؤ چھ ماہ کا کرایہ۔ نہیں تو آج ہی سارا سامان کھڑکی سے باہر سڑک پر پھینک دوں گی۔"

الفریڈ نے بڑی مشکل سے بدمزاج مالکہ کو راضی کیا کہ وہ دو ایک دن کے اندر اندر کرائے رقم ادا کر دے گا۔

لوشیا گرین ہاؤس پہنچ گئی۔ مارتھا لان میں الگنی پر دھلے ہوئے کپڑے ڈال رہی تھی۔ لوشیا اس سے پوچھا کہ کوئی آیا تھا؟ مارتھا نے سر ہلا کر کہا کہ کوئی نہیں آیا تھا۔ پھر حیرانی کے ساتھ لی:

"کوئی ایک گھنٹہ پہلے ڈرائنگ روم میں لگی اس نیلی آنکھوں والے کیپٹن کی تصویر اپنے فرش پر گر پڑی۔"

"پھر؟" "پھر کیا بیگم صاحبہ! ابھی تک وہیں پڑی ہے۔ میں اکیلی تو اسے دیوار پر نہیں سکتی تھی۔"

"آؤ مارتھا! تصویر کو پھر سے لگا دیتے ہیں۔"

لوشیا سمجھ گئی کہ یہ تصویر بھی ٹھیک اسی وقت گری تھی جب الفریڈ کے سٹوڈیو میں اس دیوار سے تصویر گری تھی اور یہ جارج کی روح نے ایسا کیا تھا۔ لوشیا دل میں افسوس کرنے کہ اس نے جارج کی روح کو کیوں صدمہ پہنچایا گیا مگر اب اس کے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔ ریڈ نے لوشیا کے دل کے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کر دیا تھا۔ اس نے مارتھا کے ساتھ کپتان جارج کی تصویر دیوار کے ساتھ پھر سے لگا دی۔ وہ کچھ دیر وہاں کھڑی تصویر کو غور دیکھتی رہی۔ اسے یوں لگا جیسے جارج کی آنکھوں میں حزن و ملال کا رنگ اتر آیا ہے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد لوشیا نے کچھ دیر آرام کیا اور پھر سہ پہر کو سمندر کے کنارے چہل قدمی نے نکل گئی۔ اس کے دل میں جارج کی طرف سے قسم قسم کے خیال آ رہے تھے وہ اس کے آگے دل کھول کر رکھ دینا چاہتی تھی۔ اس نے چلتے چلتے آہستہ سے جارج کی روح کو آواز دی۔ کا خیال تھا کہ شاید جارج کی روح اس کے ساتھ ساتھ چل رہی ہو۔ جارج کی روح نے کوئی ز نہ دی۔ لوشیا نے دیکھا اس کے پہلو بہ پہلو ریت پر پاؤں کے نشان بھی نہیں پڑ رہے ج کی روح وہاں نہیں تھی۔ پھر وہ کہاں تھی؟ لوشیا سیر سے واپس آئی تو بڑی تھکی ہوئی وہ لان میں کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔ مارتھا اس کے لئے پھلوں کے جوس کا گلاس لے آئی

لوشیا نے پھلوں کے رس کا گلاس پی لیا۔ پھر سر آرام کرسی کی پشت سے لگا کر آسمان پر غروب ہ
سورج کی سرخی کو تکنے لگی۔ اسے آسمان پر جارج کی تصویر دکھائی دی جس کی نیلی آنکھیں آہ
پر پھیلتے پھیلتے ایک سمندر بن گئیں۔ اس سمندر میں بھیانک طوفان آ گیا اور لوشیا نے ایک ج
کو اس میں ہچکولے کھا کر ڈوبتے دیکھا۔ اس کے کانوں میں ڈوبتے ملاحوں کی چیخیں سنائی دیں
ان میں ایک چیخ کیپٹن جارج کی بھی تھی۔ لوشیا نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر وہ سر کو جھ
کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا ہوا بیگم صاحبہ؟" مارتھا نے کپڑے الگنی پر ڈالتے ہوئے رک کر پوچھا۔ "کچھ نہیں
سر درد کر رہا ہے۔ میں بیڈ روم میں جا رہی ہوں۔"

لوشیا بیڈ روم میں آ کر پلنگ پر اوندھے منہ گر پڑی اور سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ ر
روتے جب اس کے دل کی بھڑاس نکل گئی تو اُسے محسوس ہوا کہ وہ ہلکی پھلکی ہو گئی ہے۔ وہ
کر سمندر کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے دوربین میں سے سمندر کو د
سمندر کی لہریں دور دور تک اُٹھ رہی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر سمندری طوفان اور ڈو
ملاحوں کی آوازیں سنیں۔ وہ بیڈ روم سے نکل کر نیچے آ گئی۔ وہ ڈرائنگ روم میں لگی
جارج کی تصویر سے آنکھیں چرا کر باہر لان میں نکل گئی۔ لان خالی تھا۔ درخت کے نیچے آرا
ویسے ہی پڑی تھی۔ مارتھا جا چکی تھی۔ شاید باورچی خانے میں کھانا تیار کر رہی تھی۔ لوشیا گ
ہاؤس کے گیٹ میں سے گزر کر سمندر کی طرف چل پڑی۔ شام غروب ہو رہی تھی۔ سمندر کی
سے خنک ہوا کے جھونکے اس کے سرخ بالوں اور بادامی رنگ کے گاؤن کو اڑا رہے تھے۔
سمندر پر کافی دور چلنے کے بعد وہ ان بھوری چٹانوں کے پاس آ کر رک گئی جہاں سمند
لہریں ٹکرا ٹکرا کر شور پیدا کر رہی تھیں۔

لوشیا چٹانوں سے ٹکراتی موجوں کو دیکھنے لگی۔ نیلے پانی کی لہریں دور دور سے
چٹانوں سے اپنا سر پھوڑتیں اور سفید جھاگ اڑا کر واپس چلی جاتیں۔ لوشیا کے دل کی
حالت تھی۔ وہ ایک چٹان پر بیٹھ گئی۔ پانی کے چھینٹے اس کے کپڑوں پر پڑنے لگے۔ لوشیا س
کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر اچانک اس نے جارج کی روح کو آواز دی:

"جارج! تم کہاں ہو؟ میرے پاس آؤ۔ میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ اپنے دل کی باتیں
ایسی باتیں جو میں نے اس سے پہلے تم سے کبھی نہیں کیں۔ سنو! میرے اندر بھی ایک دل ہے،
ایسا دل جو محبت کے نام سے ناآشنا رہا۔ جس کو کسی نے اپنی محبت کا گیت نہ سنایا۔ سنو!
میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں الفریڈ سے بھی محبت کرتی ہوں۔ تم زندگی میں مجھے کبھی نہیں
مل سکتے۔ تم زندہ ہو کر میرے سامنے نہیں آ سکتے۔ لیکن الفریڈ زندہ ہے، وہ گوشت پوست
کا بنا ہوا نوجوان ہے، وہ میرے بالوں کو چوم سکتا ہے۔ وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مجھے
اپنے گلے سے لگا سکتا ہے۔ اس کے لمس میں محبت کی گرمی ہے۔ اس نے میرے ٹھنڈے منجمد
جذبات کی برف کو اپنی محبت کی گرم دھوپ سے پگھلا دیا ہے۔ میں ایک انسان ہوں ایک
عورت ہوں۔ زندہ عورت، مجھے بتاؤ میں کہاں جاؤں؟ الفریڈ کو چھوڑوں تو تمہارے پاس کیسے
آؤں؟ الفریڈ کے پاس جاؤں تو تمہیں کیسے چھوڑوں؟ مجھے جواب دو۔ تم بولتے کیوں نہیں
تم خاموش کیوں ہو؟ جارج! جارج کی روح! جارج کی رُوح!......"

وہاں سوائے چٹانوں سے ٹکراتی سمندر کی لہروں کے شور کے اور کوئی آواز نہیں تھی۔
جارج کی روح نے کوئی جواب نہ دیا۔ جارج کی روح وہاں کہیں بھی نہیں تھی۔

لوشیا نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں ڈھانپ لیا اور وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ اس
کی سسکیاں سمندر کے شور میں ڈوب گئیں۔ شام کی سرخی رات کے اندھیرے میں بدل گئی
آسمان پر سمندر کے اوپر قطبی ستارہ چمکنے لگا۔ لوشیا چٹان پر سے اٹھی اور واپس گھر کی
طرف چل پڑی۔ اسے سردی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا سر بھاری ہو گیا تھا اور درد کرنے
لگا تھا۔ اپنے بیڈ روم میں آ کر اس نے کھانا کھا کر کافی پی اور پھر کمبل اوڑھ کر سو گئی۔ اسے
بہت جلد نیند آ گئی۔ آدھی رات کو اس کی اپنے آپ آنکھ کھل گئی۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی بےچینی
سے فرش پر چل رہا ہے۔ لوشیا کو کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی اس نے آہستہ
سے آواز دی:

"جارج! کیا یہ تم ہو؟ جارج! مجھے معاف کر دو۔ ایک بار مجھ سے بات کرو۔ آخری
بار میری ایک بات سن لو جارج!" قدموں کی دھیمی سی چاپ رک گئی۔ کمرے میں گہری

خاموشی چھاگئی۔ سمندر کی طرف سے ہوا کا ایک جھونکا آیا اور کھڑکی کا ایک پٹ کھل گیا۔ نے اٹھ کر کھڑکی کے باہر جھانکا۔ آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ سمندر پر دور تک تار چھائی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے کھڑکی بند کی اور پلنگ پر گر کر آنکھ بند کر لیں۔

دوسرے روز اسے الفریڈ کو ملنے جانا تھا۔ اس نے الفریڈ سے وعدہ کر رکھا تھا۔ ایک بار اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ الفریڈ کے پاس نہ جائے۔ وہ جارج کو بھی نہ پکارے۔ وہ ان سب کو بھول جائے۔ لیکن گھڑی نے نو بجائے تو لوشیا کی آنکھوں کے سامنے لمبے بالوں اور یونانی دیوتا ایسی شکل والے آرٹسٹ الفریڈ کی شکل گھوم گئی۔ وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا لوشیا کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوگا۔ لوشیا ایک دم اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس نے الماری کھول کر دراز میں سے نوٹوں کی دو گڈیاں نکال کر پرس میں رکھیں اور باہر آگئی۔ مارتھا لان میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ لوشیا نے اسے بتایا کہ وہ لندن اپنے پبلشر سے ملنے جا رہی ہے۔ شام تک واپس آجائے گی۔ گاڑی میں بیٹھ کر اس نے انجن سٹارٹ کیا اور لندن جانے والی سڑک پر ہوا کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ سارا رستہ وہ نوجوان آرٹسٹ اور جارج کے بارے میں سوچتی رہی۔ پھر اس نے اپنے خیالات کو جھٹک دیا اور صرف نوجوان آرٹسٹ کے خیال کو اپنے ذہن میں رکھا۔

گاڑی اب لندن کے مضافات میں داخل ہوگئی تھی۔ شہر کی پر ہجوم چوڑی چکلی سڑکوں پر سے ہوتی لوشیا شہر کے گنجان آباد غریب علاقے میں آگئی۔ اس نے الفریڈ کے مکان کے نیچے گاڑی کھڑی کر کے ہارن دیا۔ الفریڈ نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ لوشیا گاڑی میں سے باہر نکل رہی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ دونوں نے ہاتھ ہلا کر ایک دوسرے کا خیر مقدم کیا اور ان کے چہرے خوشی سے کھل گئے۔ اسٹوڈیو میں جا کر لوشیا نے دیکھا کہ آرٹسٹ الفریڈ نے اپنی غریبانہ حیثیت کے مطابق کمرے کو خوب سجا رکھا تھا۔ میز کے گلدان میں گلاب کے تازہ پھول سجے تھے۔ فرش بھی صاف تھا اور چیزیں بڑے سلیقے سے اپنی اپنی جگہوں پر لگی تھیں۔ لوشیا کا خیر مقدم الفریڈ نے اسے گلے لگا کر اس کے ہونٹوں کو چوم کر کیا۔ لوشیا کے جسم سے بہترین عطر کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔

"مجھے امید تھی لوشیا تم ضرور آؤ گی۔"

لوشیا نے پرانے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا:

"میں نے وعدہ جو کیا تھا۔ تم نے تو آج کمرے کو بڑا خوب صورت بنا رکھا ہے۔"

"یہ صرف تمہاری آمد کی خوشی میں لوشیا! آہ! تمہیں کیا معلوم لوشیا کہ میں تم سے کس قدر ے کرتا ہوں۔ ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ صرف تمہارے خیال میں سلگتا رہا۔ لوشیا! مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ میری حالت اس چکور کی طرح ہوگئی ہے جو چاندنی راتوں میں ں کے پیچھے پاگلوں کی طرح گھومتا پھرتا ہے۔"

لوشیا کی آنکھیں محبت بھری باتیں سن کر اپنے آپ بند ہونے لگیں۔ الفریڈ نے جھک کر لوشیا ھیں چوم لیں۔ لوشیا نے کہا۔

"الفریڈ! کیا تم اسی طرح ساری زندگی مجھ سے محبت کرتے رہو گے؟ مجھے چھوڑ تو نہیں دو گے۔ بھول تو نہیں جاؤ گے؟"

آرٹسٹ نے سرگوشی میں کہا:

"کبھی نہیں لوشیا! کبھی نہیں! میں تمہیں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ تمہاری محبت کا نقش میرے پر اتنا گہرا ہے کہ میں اگر چاہوں بھی تو تمہیں نہیں بھلا سکتا۔ میں ہر گھڑی، ہر پل تمہیں یاد کرتا ا۔"

انہوں نے ایک ہی میز پر ساتھ ساتھ بیٹھ کر دوپہر کا کھانا کھایا۔ کافی پی۔ پھر الفریڈ ایک ی سے انگوروں کی وائن کی بوتل نکال کر لے آیا۔ وہ بڑے مزے سے وائن کی چسکیاں لیتے ئے محبت کی دنیا میں کھو گئے۔ الفریڈ نے کہا:

"میری جان! اب میں تمہاری ایک نیوڈ تصویر بنانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری تصویر یورپ کے تمام آرٹسٹوں کی تصویروں کو مات کر دے۔"

لوشیا نے ذرا بے چین ہو کر کہا۔

"لیکن ..... الفریڈ ..... اس کے لئے تو مجھے سارے کپڑے اتارنے پڑیں گے۔"

"پھر کیا ہوا لوشیا! یہ تو آرٹ ہے۔ یہ تو فن ہے۔ کپڑے اتارنے سے کیا ہو جائے گا۔ ہاری تصویر ہی تو بناؤں گا۔"

لوشیا اس نوجوان آرٹسٹ کی جادو بھری باتوں میں اس قدر کھو گئی تھی کہ اس نے پرد
کے پیچھے جاکر اپنے سارے کپڑے اتار دیئے اور پلنگ پر الفریڈ کی مرضی کا پوز بنا کر نیم درا
ہو گئی۔ الفریڈ لوشیا کے جسم کی خوب صورتی دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا ک
لوشیا کا بدن ایک بھرپور کلاسیکی بدن تھا ایک لمحے کے لئے تو اُسے احساس ہوا جیسے مونا لز
اس کے سامنے کپڑے اتار کر لیٹی ہوئی ہے۔ اس نے سٹینڈ پر بورڈ لگایا اور چارکول س
جلدی جلدی اس کا سکیچ بنانے لگا، وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا اور سکیچ بنائے ج
رہا تھا۔ آدھے گھنٹے میں اس نے سکیچ مکمل کر لیا اور پھر لوشیا کے پاس آکر پلنگ پر بیٹھ گی
اس نے جھک کر لوشیا کے حسین نازک جسم پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔

لوشیا سمٹ گئی۔ الفریڈ اور آگے بڑھ گیا۔ لوشیا نے ایک ہاتھ سے الفریڈ کو پر
کیا اور پھر دوسرے ہاتھ سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ ایک ایسے باغ عدن میں پہنچ گئی
جہاں دریاؤں کی اچھلتی ہوئی میٹھی لہروں کا سنگم تھا۔ جہاں درختوں پر سرخ رنگ کے پر
بول رہے تھے۔ جہاں آسمان پر ستاروں کی مہتابیاں چھوٹ رہی تھیں۔

لوشیا کا خواب ٹوٹ گیا تو اُنہوں نے بڑی محبت سے بیٹھ کر کافی پی۔ لوشیا نے پر
میں سے ڈالروں کی گڈی نکال کر الفریڈ کے آگے رکھ دی۔ یہ دو ہزار ڈالر کے نوٹ
الفریڈ نے کہا:

”یہ کیا ہے لوشیا؟“

لوشیا نے مسکرا کر کہا:

”تم نے اس روز کہا تھا ناں کہ تمہیں مکان کی مالکہ تنگ کرتی ہے۔ یہ اس کو د
کے لئے ہے۔ تم کچھ رنگ لے آنا۔ آخر تمہیں میری تصویر بھی تو بنانی ہے۔“

الفریڈ نے لوشیا کے مجبور کرنے پر ڈالروں کی گڈیاں لے کر رکھ لیں۔ اب شام ہو
تھی۔ لوشیا جانے کے لئے اٹھی۔ الفریڈ نے آگے بڑھ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور اس سے
لیا کہ وہ کل بھی ضرور آئے گی۔ لوشیا محبت کے سمندر میں بہے جا رہی تھی۔ اس نے وعدہ کر
کہ وہ کل بھی ضرور آئے گی۔

لوشیا واپس گرین ہاؤس آگئی۔ اب وہ محبت کی خواب انگیز دنیا میں کھو چکی تھی۔ رات کو
س نے خواب میں بھی الفریڈ کو دیکھا کہ اس پر جھکا اس کے سرخ بالوں کو چوم رہا ہے۔ وہ سوتے
ں ہی مسکرا دی۔ صبح اٹھتے ہی اس نے سب سے پہلے الفریڈ کو فون کیا۔ یہ نمبر الفریڈ نے ساتھ والے
لیٹ کا دے رکھا تھا۔ لوشیا نے الفریڈ کو بتایا کہ اس نے رات خواب میں اسے اپنے سرخ بالوں
و بوسہ دیتے دیکھا ہے۔ الفریڈ نے بڑے پُرجوش لہجے میں کہا کہ وہ بھی ساری رات اس کے سرخ
ہونٹوں کو پیار کرتا رہا ہے۔

”لوشیا! تم کس وقت آرہی ہو؟ میں تمہارا بے تابی سے انتظار کر رہا ہوں۔“

لوشیا نے محبت بھرے لہجے میں کہا:

”ابھی تو دن نکلا ہی ہے الفریڈ پیارے! ناشتے کے بعد پہنچ جاؤں گی۔“

”تم ناشتا میرے ساتھ آکر کرو۔ میں انتظار کروں گا۔ بس میں اور کچھ نہیں سننا چاہتا۔
اگر تم نہ آئیں تو میں ناشتا نہیں کروں گا۔“

لوشیا کی حالت اس تیر کی مانند تھی جو اپنی کمان سے نکلنے کو بے تاب ہو۔ اسے سمندر میں چھلانگ
لگانے کے لئے صرف ایک اشارے کی ضرورت تھی۔ اشارہ اسے مل گیا تھا اور اس نے چھلانگ
لگا دی۔ گاڑی میں بیٹھ کر وہ ہوا کے دوش پر اڑتی ہوئی الفریڈ کے سٹوڈیو میں پہنچ گئی۔ آج
وہاں کی حالت پہلے سے بدلی ہوئی ہے۔ کمرے میں کچھ نئے کینوس اور کھانے پینے کی چیزوں کے
تازہ ڈبے پڑے تھے۔ الفریڈ نے اپنے لئے سگریٹوں کے کتنے ہی پیکٹ اور شراب کی بوتلیں خرید کر
سجا رکھی تھیں۔ ظاہر ہے لوشیا کے ڈالروں کی امداد سے وہ خوش حال ہو گیا تھا۔ اس نے لینڈ لیڈی
کو بھی چھ ماہ کا پیشگی کرایہ دے دیا تھا۔ وہ نیلے رنگ کی نئی جیکٹ اور زرد پتلون میں ملبوس تھا
اس کے بالوں سے اعلیٰ قسم کے شیمپو کی خوشبو آرہی تھی اور بھورے رنگ کی مونچھیں بڑی نفاست
سے ترشی ہوئی تھیں۔ میز پر کافی کا نیا سیٹ اور ایک نئی جاپانی کیتلی رکھی تھی۔ جس میں سے کافی
کی گرم گرم مہک اُٹھ رہی تھی۔ چیکوسلاویکیہ کی پھولدار پلیٹوں میں سنہری توش اور زرد مکھن
کی ٹکیہ گلاب کے بھرے ہوئے گلدان کے پاس بڑی خوب صورت لگ رہی تھی لوشیا کو یہ دیکھ
کر خوشی ہوئی کہ اس کی ذرا سی مدد سے الفریڈ نے بہتری کی طرف ترقی کی ہے۔ وہ چاہت

یہی تھی - اگر الفریڈ ساری رقم شراب میں اڑا دیتا تو اسے دکھ ہوتا ۔

سٹوڈیو میں آتے ہی اس نے الفریڈ کو گلے لگا لیا ۔

" مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے الفریڈ کہ تم نے اپنا معیارِ زندگی بلند کر لیا ہے ۔"

الفریڈ مسکراتے ہوئے اعلیٰ قسم کا سگریٹ سلگا کر بولا :

" میں نے ہمیشہ ایک بہترین زندگی بسر کرنے کا خواب دیکھا ہے لوشیا! میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے میرے خوابوں کی دنیا سے ہمکنار کر دیا ۔"

انہوں نے ایک ہی میز پر بیٹھ کر ناشتا کیا اور پھر گاڑی میں بیٹھ کر لندن کی پارکوں کی سیر کرنے نکل گئے ۔ دوپہر کے کھانے تک وہ شہر کی تفریح گاہوں میں گھومتے پھرتے سیر کرتے رہے ، چڑیا گھر میں انہوں نے بلایا کے بندروں کو چنے ڈالے ، عجائب گھر میں انہوں نے مصر کی قدیم ملکاؤں کی ممیوں کو محبت کی نظروں سے دیکھا اور قدیم مصر کے محبت بھرے گیت دہرائے ۔ پیکاڈلی سرکس میں انہوں نے ڈنمارک سے آئے ہوئے تر و تازہ گلابوں کے گچھے خرید کر گاڑی میں رکھے ، ایک بہت بڑے شوروم میں جا کر لوشیا نے الفریڈ کو نیا سوٹ ، نئے بوٹ ، عطر کی قیمتی شیشیاں ، سویڈن کی کلون فرانس کی وائین اور جاپان کا ایک بڑا خوبصورت ٹیپ ریکارڈر خرید کر دیا ۔ دوپہر کا کھانا انہوں نے ایک عالی شان ہوٹل میں بیٹھ کر کھایا ۔ سٹوڈیو میں واپس آ کر الفریڈ نے دو گلاسوں میں فرانس کی اعلیٰ وائین بھری اور ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ لگا ہوا ریڈیو اون کر دیا ۔ تیز انگریزی میوزک کی دھن پر وہ دونوں کمرے میں رقص کرنے لگے ۔ فرنچ وائین کی گرمی ڈنمارک کے گلابوں کی خوشبو اور کوپن ہیگن کی کلون کی وحشت انگیز مہک نے لوشیا کو پاگل کر دیا ۔ وہ ناچتے ناچتے پسینے میں شرابور ہو کر الفریڈ کی باہوں میں گر پڑی اور ایک بار پھر بپھرتی ہوئی سمندری لہروں اور چٹانوں سے ٹکراتی ، جھاگ اڑاتی موجوں کی دنیا میں پہنچ گئی ۔ شام کو وہ تھکی ماندی گرین ہاؤس پہنچی ، مگر اس کا دل محبت کی لذتوں سے چور تھا ۔ اس نے ایک کیف کے عالم میں مارتھا کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا اور بیڈ روم میں جا کر ایسی گہری نیند سوئی کہ اگلے روز دن چڑھے اس کی آنکھ کھلی ۔

اب ایک بار پھر وہ الفریڈ کے پاس جانے کی تیاریاں کر رہی تھی ۔ وفادار خادمہ مارتھا

ے اپنی بیگم صاحبہ میں ایک خوشگوار تبدیلی دیکھی تھی ۔ وہ بہت خوش تھی کہ اب اس کی مالکہ کبھی
داس اور روتی ہوئی آنکھوں سے نہیں ملتی ۔ اس نے کبھی مالکہ سے نہ پوچھا تھا کہ وہ شہر میں
س سے ملنے جاتی ہے ۔ لوشیا نے بھی مارتھا سے الفریڈ کا ذکر نہیں کیا تھا ۔ محبت کا راستہ گناہ
ی کھائی کے ساتھ ساتھ ہو کر گزرتا ہے ۔ انسان کا ذرا سا بھی پاؤں پھسل جائے تو پھر اسے گناہ
ی کھائی میں گرنے سے کوئی نہیں بچا سکتا ۔ لوشیا نکلی تو محبت کی دل آویز راہوں پر تھی ۔ لیکن
ہ پھسل کر گناہ کی کھائی میں گر پڑی تھی ۔ وہ اس کھائی کی گہرائیوں میں اتنی دور نکل گئی تھی ۔
اب اگر وہ خود بھی چاہتی تو واپس نہیں آسکتی تھی ۔ اس پر ایک نشہ سا طاری تھا ۔ اس نشے
ں وہ سوائے الفریڈ کے دنیا کی ہر شے کو بھول گئی تھی ۔ الفریڈ کی دنیا ہی بدل گئی تھی اب
شہر کے غریب علاقے کی گنجان آبادی سے نکل کر ایک ماڈرن علاقے کے خوبصورت فلیٹ
ں آگیا تھا ۔ اس کا سٹوڈیو دیکھ کر کسی امیر زادے کے سٹوڈیو کا گمان ہوتا تھا ۔ زندگی کی ہر
ائش اسے میسر تھی ۔ لوشیا کے پرس کا منہ الفریڈ کی ہر ضرورت کے لئے ہر وقت کھلا رہتا
اس نے لوشیا کو جیسے اپنے جادو کے پھندے میں پھانس لیا تھا ۔ وہ اس کی مرضی کے بغیر
ے قدم نہ اٹھاتی تھی ۔ اس کروڑپتی امریکی بیوہ کی دولت سے الفریڈ نے اپنا الگ بنک بیلنس
م کر لیا ہے ۔

لوشیا نوجوان آرٹسٹ کی محبت میں دیوانی ہو چکی تھی ۔ کبھی کبھی اسے جارج کی روح کا
ل آتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے ہزاروں سال پہلے اس نے ایک سہانا خواب دیکھا ہو ۔
ین ہاؤس میں اب جارج کی روح کی آواز کبھی سنائی نہیں دی تھی ۔ جارج کی روح نے بھی شاید
کو بھلا دیا تھا لیکن ایسا نہیں تھا ۔ جارج کی روح یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی اور خاموش تھی ۔
شیا اپنی زندگی ، اپنی جوانی کا پورا پورا حق استعمال کر رہی تھی اور جارج کی روح اسے
کے حق سے محروم نہیں کر سکتی تھی ۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جارج کی روح اداس اور
وش ہو کر کھلے سمندروں کی وسعتوں کے اوپر پھیلے ہوئے سفید بادلوں میں گم ہو
ہے ۔

رات کی تاریکیوں میں گناہ کا بویا ہوا بیج آخر دن کی روشنی میں ننھا سا پودا بن کر

نمودار ہوگیا۔ لوشیا کو محسوس ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ لوشیا ایک مالدار امریکی کی بیوہ تھی
معاشرے میں اس کی ایک اہمیت اور ایک اہم مقام تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے الفریڈ کو گرین ہا
میں ٹھہر جانے پر کبھی مجبور نہیں کیا تھا۔ وہ جانتی کہ اس سے اس کی بدنامی ہوگی۔ وہ شادی کے بغیر
الفریڈ کو اپنے گھر نہیں رکھ سکتی تھی اور شادی کا خیال اسے اس وقت آیا جب اس کے پیٹ میں
الفریڈ کے گناہ کا پھل حرکت کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اسے الفریڈ سے شادی کر لینی چاہیئے۔ وہ ا
سے بے پناہ محبت کرتی ہے اور الفریڈ بھی اس پر جان نثار کرتا ہے۔ پھر اس کو بچہ بھی ہونے والا
ایک مدّت کے بعد اس کے سوکھے ویران چمن میں بہار آئی تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے ناامید کر دیا تھ
کہ اس کے ہاں کبھی اولاد نہیں ہوگی۔

لندن کے بوڑھے ڈاکٹر نے جب اس کا معائنہ کرنے کے بعد اسے بتایا کہ وہ ماں بننے والی
تو لوشیا بے حد خوش ہوئی، اسے یقین تھا کہ الفریڈ بھی یہ خوش خبری سن کر بے حد خوش ہوگا وہ گا
میں بیٹھ کر بھاگی بھاگی الفریڈ کے فلیٹ پر پہنچی۔ الفریڈ نہایت قیمتی سوٹ میں ملبوس صوفے پر نیم دراز چا
کے سگریٹ ہولڈر میں سگریٹ سلگائے رسالہ پڑھ رہا تھا۔ قریب ہی ٹیپ ریکارڈ پر گام جرا
گانا ہو رہا تھا۔ الفریڈ کا ایک پیر گانے کی دھن پر متحرک رہا تھا۔ لوشیا نے اندر جاتے ہی الفریڈ کا م
چوم لیا۔ الفریڈ نے کوئی حرکت نہ کی۔ اب اسے لوشیا کے ہونٹوں میں وہ مٹھاس اور گرمی نہ ملتی تھ
پھر بھی اس نے اپنے طرزِ عمل سے یہ کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ لوشیا کو محض سکے پیدا کرنے وا
مشین سمجھتا ہے۔

الفریڈ نے رسالہ پھینک کر آنکھیں بند کر کے لوشیا کے گلے میں بانہیں ڈال دی اور اسے بالکل کا
انداز میں چوم کر بولا:

"ڈیئر آج بڑی خوش ہو۔ کیا بات ہے؟"

لوشیا نے کہا:

"ایک خوشی کی بات ہے۔ کان میں کہوں گی۔"

الفریڈ نے اپنا کان مسکراتے ہوئے لوشیا کے ہونٹوں کے پاس کر دیا۔ جب لوشیا نے ا
بتایا کہ وہ ایک بچے کی ماں بننے والی ہے تو الفریڈ کے چہرے کی ہنسی ایک دم غائب ہوگئی۔ مگ

یا ہوشیار آدمی تھا۔ فوراً ہی خوش ہو کر بولا:

"بڑی خوشی کی بات ہے لوشیا۔"

اور پھر وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس آگیا اور گلی میں جھانکنے لگا۔ لوشیا نے اس کو پیچھے سے اپنی
غوش میں لے لیا اور اس کے چوڑے شانے پر اپنا رخسار رکھ کر کہنے لگی کہ کیا اسے خوشی نہیں ہوئی؟
لفریڈ نے بڑی مشکل سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس کا کیا فائدہ ہے لوشیا۔ ہم تو شادی شدہ
نہیں ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے؟"

لوشیا نے الفریڈ کے بالوں میں انگلیاں پھیر کر کہا:

"میں نے تم سے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہم شادی کر لیں گے الفریڈ! آج ہی گرجے میں جا کر
شادی کر لیں گے۔ پھر تم میرے ساتھ گرین ہاؤس اٹھ چلنا۔ تم میرے خاوند اور اس کے گھر کے مالک
ن کر رہو گے۔"

الفریڈ نے سگریٹ ہولڈر سے نکال کر پاؤں تلے مسل دیا اور پھر صوفے پر بیٹھ کر گہری سوچ
بں ڈوب گیا۔ لوشیا اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"تم اداس کیوں ہو گئے ہو الفریڈ؟ کیا تم کو میرا فیصلہ پسند نہیں آیا؟ کیا تم مجھ سے شادی
کرنے پر تیار نہیں ہو؟"

الفریڈ اتنی جلدی لوشیا کو ہاتھ سے نہیں کھونا چاہتا تھا۔ اس نے لوشیا کی طرف دیکھ کر
مسکرا کر کہا:

"ایسی بات نہیں ہے لوشیا! میری اس سے زیادہ اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے کہ تم
مجھے اپنا خاوند بنا لو۔"

"پھر تم ایک دم سے سوچ میں کیوں ڈوب گئے ہو؟"

الفریڈ نے پلٹ کر لوشیا کو سنجیدہ چہرے سے دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
بولا:

"میں صرف ایک شرط پر تم سے شادی کر سکتا ہوں۔ لوشیا کہ تم ..... تم اس بچے کو ضائع کر دو"
لوشیا پر جیسے بجلی سی گری۔ ایک مدّت کے بعد اس کے شجرِ امید پر پھل آیا تھا اور الفریڈ

اسے بھی نوچ کر پھینک دینا چاہتا تھا۔ اس نے حیرت زدہ ہو کر کہا:

"یہ ...... یہ تم کیسی عجیب شرط لگا رہے ہو۔ الفریڈ! تم اس ہونے والی ننھی سی جان کے لئے پریشان کیوں ہو؟ آخر ہمیں شادی تو کرنی ہی ہے۔ یہ تو ہمارا جائز بچہ ہوگا۔"

الفریڈ کمرے میں ٹہلنے لگا:

"میں مجبور ہوں لوشیا! میں جانتا ہوں، شادی کے بعد یہ ہمارا جائز بچہ ہوگا۔ لیکن میں تمہارے ساتھ اس وقت تک شادی نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ یہ بچہ ضائع نہیں ہو جاتا۔ یہ میری ایک ایسی مجبوری ہے جس کو میں تمہارے سامنے بیان نہیں کر سکتا۔"

لوشیا صوفے کی پشت سے سر لگا کر بیٹھ گئی۔ اسے اپنا جسم ٹھنڈا ہوتا محسوس ہوا۔ اس نے الفریڈ سے پانی مانگا۔ الفریڈ نے اسے پانی کا گلاس دیا۔ پانی پی کر لوشیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ الفریڈ نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا اور اس پر اپنی گفتگو کا جادو کرنے لگا۔

"لوشیا! خدا کے لئے مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تم سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ تم سے جُدا ہونے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔"

لوشیا نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ "پھر تم میرا بچہ کس لئے ضائع کرانا چاہتے ہو!

"تم بچہ ضائع ہونے کے بعد مجھے چھوڑ دو گے۔ مجھ سے شادی نہیں کرو گے۔ تمہارا دل اب مجھ سے بھر گیا ہے۔ تم کسی دوسری لڑکی سے محبت کرنے لگے ہو۔"

الفریڈ نے لوشیا کو بہت سا پیار کرنے کے بعد کہا:

"میں سوائے تمہارے اور کسی سے محبت نہیں کرتا لوشیا! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ سوائے تمہارے میری زندگی میں دوسری کوئی عورت نہیں ہے۔ میں تم سے شادی کرنے کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔ تمہارے بغیر میری زندگی ایک ویران جنگل کی طرح ہوگی۔ جس میں کبھی بہار کا گذر نہ ہو۔ میں دل و جان سے تمہیں چاہتا ہوں۔ بس تم میری مجبوری کو سامنے رکھتے ہوئے میری اتنی سی بات مان لو اور اس بچے کو ضائع کرا دو۔ ابھی کوئی نقصان نہیں ہوگا اور پھر بچہ پھر بھی پیدا کر لیں گے۔ شادی کے بعد ہم جتنے چاہیں بچے پیدا کر سکتے ہیں۔"

لوشیا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹروں نے مجھے کہہ دیا تھا کہ بچہ نہیں ہوگا۔ اب میری گود ہری ہوئی ہے تو تم اسے ں اجاڑ رہے ہو۔ کیا جانے پھر مجھے کبھی بچہ نہ ہو۔ میں کبھی بھی ماں نہ بن سکوں۔"

الفریڈ نے بڑی مکاری سے لوشیا کی آنکھوں پر بوسہ دے کر کہا:

"ایسا کبھی نہیں ہوگا لوشیا! اب جبکہ تمہیں ایک بار بچہ ہوا ہے تو یقین کرو تم دوسری ربھی ماں بنو گی۔ تمہیں شادی کے بعد بھی بچہ ضرور ہوگا۔ لوشیا! کیا میری خاطر میری محبّت کی اطر یہ قربانی نہیں کر سکتیں؟"

لوشیا کا دل پگھلنے لگا تھا۔ الفریڈ کی محبّت اس کی سب سے بڑی کمزوری بن گئی تھی۔ ں نے کہا۔ "آخر تمہیں ایسی کیا مجبوری ہے الفریڈ کہ تم یہ بچہ رکھنا نہیں چاہتے؟ کیا تم مجھے بھی ربتاؤ گے؟ آخر میں تمہاری بیوی بننے والی ہوں۔"

الفریڈ نے لوشیا کا سرخ بالوں والا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر کہا:

"پیاری لوشیا! یہ ایک ایسا راز ہے جس پر سے پردہ میں شادی کی پہلی رات ہی اٹھاؤں ۔ مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں تمہارا ہوں اور ہمیشہ تمہارا رہوں گا۔ تم کل یہ بچہ ضائع کراؤ۔ ں پرسوں تم سے گرجے میں جا کر شادی کر لوں گا۔"

لوشیا سنبھل کر بیٹھ گئی۔ وہ بچہ ضائع کرانے پر راضی ہو گئی تھی۔ اس پر الفریڈ کی جادو ری پر محبت باتوں کا اثر ہو گیا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ اسے اپنی محبّت اور شادی شدہ زندگی کی اطر بچے کی قربانی دے دینی چاہئیے۔ آخر الفریڈ اس سے شادی کر رہا ہے۔ خدا نے چاہا تو بچہ ر بھی ہو جائے گا۔ اس نے الفریڈ کی طرف دیکھ کر کہا:

"میں تمہاری محبّت کی خاطر یہ قربانی دینے کو تیار ہوں۔"

الفریڈ نے خوش ہو کر لوشیا کو اپنے گلے سے لگا لیا۔

دوسرے روز لوشیا کو ساتھ لے کر الفریڈ شہر کے سب سے بڑے اور مشہور ڈاکٹر کے لینک میں گیا۔ ڈاکٹر نے ساری بات سن کر یہ ناجائز کام کرنے سے انکار کر دیا۔ الفریڈ اب نی ایک جاننے والی لیڈی ڈاکٹر کے پاس آ گیا جو چوری چھپے یہ کام کرتی تھی۔ اس کو لوشیا

نے دو سو ڈالر دیئے اور لوشیا کا بچہ ضائع کر دیا گیا۔ دو روز تک لوشیا گرین ہاؤس میں اپ
بیڈ روم میں پڑی رہی۔ اس نے مارتھا کو صرف اتنا بتایا کہ وہ بیمار ہو گئی ہے اور لیڈی ڈاکٹر
زیر علاج ہے صحت مند ہوتے ہی سب سے پہلے اس نے مارتھا کو یہ خوش خبری سُنائی کہ وہ لند
کے آرٹسٹ الفریڈ سے شادی کر رہی ہے۔ مارتھا کو حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ حیرت اس لئ
ہوئی کہ لوشیا نے اس سے پہلے اس سے شادی کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی اور خوشی اس
لئے ہوئی کہ اتنی مدت بعد لوشیا کا گھر آباد ہو رہا تھا۔ لوشیا جتنی دیر بیمار رہی۔ الفریڈ برا
فون پر اس کی مزاج پرسی کرتا رہا۔ شائد اس لئے کہ وہ لوشیا کو کسی قسم کے بھی شک میں مبتلا نہیں
کرنا چاہتا تھا۔

صحت مند ہوتے ہی لوشیا سیدھی الفریڈ کے سٹوڈیو میں پہنچی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اس
کا خیر مقدم کیا اور شادی کے بارے میں پروگرام طے کیا جانے لگا۔ الفریڈ نے بڑی ہوشیاری سے
کام لیتے ہوئے ایک پل کے لئے بھی لوشیا پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ او
اس کے دل میں کیا تھا؟ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ لوشیا جلد سے جلد شادی کرنا چاہتی تھ
لیکن الفریڈ نے ایک ہفتے کی تاریخ ڈال دی۔ لوشیا راضی ہو گئی۔ شادی کی تاریخ سترہ مئی
ہو گئی۔ وہ سارا ہفتہ لوشیا اور الفریڈ شاپنگ کرتے رہے۔ لوشیا نے اپنے لئے اور مارتھا کے
لئے بہترین کپڑے خریدے۔ الفریڈ کے لئے بھی اس نے شادی کا نہایت عمدہ اور قیمتی سوٹ خرید
اپنی شادی والے دن کا جوڑا خریدنے کے لئے لوشیا الفریڈ کو ساتھ لے کر لندن سے پیرس گئی۔

پیرس میں جو دکان یورپ بھر میں دلہن کے جوڑے تیار کرنے میں مشہور تھی، وہ دونوں اس
دکان پر آ گئے۔ یہ دکان ایک بہت بڑے سٹوڈیو کی طرح تھی۔ خادمائیں انہیں ایک ایسے کمرے
میں لے گئیں، جہاں چاروں طرف دیواروں پر فرش سے لے کر چھت تک آئینے لگے تھے
الفریڈ دوسرے کمرے میں بیٹھ گیا اور خادماؤں نے لوشیا کو دلہن کا جوڑا پہنانا شروع کر دیا۔ جب
وہ پوری دُلہن بن کر الفریڈ کے سامنے آئی تو ایک وہ بھی لوشیا کا حسن دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس
نے دانتوں تلے انگلی داب لی اور سوچا کاش وہ لوشیا سے شادی کر سکتا۔ لوشیا نے مسکراتے
ہوئے کہا۔

"کیوں الفریڈ! کیسی لگتی ہوں میں؟"

"تم اس وقت مجھے آسمان کی کوئی حور معلوم ہو رہی ہو۔"

ہی دلہن کا جوڑا پسند کر لیا گیا۔ لوشیا شادی کے جوڑے کو ڈبے میں بند کروا کر
پس آ گئی۔ پیرس میں انہوں نے جگہ جگہ شاپنگ کی تھی۔ لوشیا نے الفریڈ کو تحفوں سے
یا۔ گرین ہاؤس آ کر اس نے مارتھا کا جوڑا دکھایا تو وہ بے حد خوش ہوئی۔

"بیگم صاحبہ! اس جوڑے کو پہن کر تو آپ کوئی پری معلوم ہوں گی۔"

لوشیا نے ہنس کر کہا:

"الفریڈ نے مجھے اس جوڑے میں دیکھا تو کہنے لگا۔ میں کوئی آسمان کی حور ہوں۔"

مارتھا بولی:

"اس میں کیا شک ہے بیگم صاحبہ! آپ نے تو کبھی اپنا خیال ہی نہیں رکھا۔ نہیں تو آپ
چاہے شادی کر سکتی تھیں۔"

لوشیا گہرا سانس بھر کر بولی:

"نہیں مارتھا! مجھے الفریڈ کا انتظار تھا۔ میں صرف الفریڈ ہی سے شادی کر سکتی تھی۔
ہی میرے خوابوں کا شہزادہ تھا۔"

مارتھا نے دبی زبان میں کہا:

"آپ نے الفریڈ کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا ہے ناں؟ میرا مطلب ہے آج
ے لندن کے آرٹسٹ لوگ ذرا زیادہ ہی آزاد خیال ہوتے ہیں۔"

لوشیا نے مارتھا کی طرف دیکھ کر کہا:

"تمہارا کیا مطلب ہے؟ کیا الفریڈ کسی دوسری لڑکی سے پیار کرتا ہے؟"

"نہیں بیگم صاحبہ! آپ کے ہوتے ہوئے وہ کسی دوسری لڑکی سے پیار کیوں کرے گا۔
طلب یہ تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ آپ کی دولت کی وجہ سے آپ سے شادی
اہو؟"

لوشیا نے مارتھا کو جھڑک دیا:

«تمہیں الفریڈ کے بارے میں ایسی باتیں نہیں سوچنی چاہئیں مارتھا! کل وہ اس گھر کا مالک بن کر آرہا ہے۔ اور پھر الفریڈ ایسا نہیں ہے۔ اسے میری دولت اور میرے کارخانوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ تو صرف مجھ سے اور صرف مجھ سے پیار کرتا ہے۔»

«خدا کرے ایسا ہی ہو بیگم صاحبہ! میں معافی چاہتی ہوں۔»

لوشیا نے مارتھا کو بتایا کہ کل الفریڈ گرین ہاؤس آرہا ہے۔ دوپہر کا کھانا وہ ہمارے ساتھ ہی کھائے گا۔ اگلے روز الفریڈ اپنی گاڑی میں سوار ہو کر دوپہر سے پہلے ہی گرین ہاؤس پہنچ گیا۔ کھانے پر بے حد تکلف کیا گیا تھا۔ لوشیا نے گنجے مائیکل اور کارپوریشن کے میئر کے علاوہ کچھ دوسرے مہمانوں کو بھی کھانے پر بلا رکھا تھا۔ گرین ہاؤس کے ہال کمرے میں بڑی رونق تھی۔ بہترین کپڑوں میں ملبوس مہمان ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور اعلیٰ ترین شرابوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ لوشیا نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ الفریڈ آرٹسٹ سے شادی کر رہی ہے۔ اس نے سارے مہمانوں سے الفریڈ کا تعارف کروایا۔ الفریڈ نے ہر ایک سے ہاتھ ملایا اور مسکرا کر ان کی خیریت پوچھی۔ لوشیا الفریڈ کا تعارف کرواتے ہوئے بڑا فخر محسوس کر رہی تھی۔ اسے خوشی تھی کہ وہ ایک آرٹسٹ سے شادی کر رہی ہے۔ گنجہ مائیکل الفریڈ کے آگے پیچھے پھر رہا تھا۔ سبھی اس نوجوان آرٹسٹ کی قسمت پر رشک کر رہے تھے جو ایک انتہائی مالدار امریکی بیوہ کا خاوند بننے والا ہے۔ مائیکل نے الفریڈ کے گلاس میں برف کا ٹکڑا ڈالتے ہوئے کہا:

«مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کو دلی مبارکباد دے سکوں۔ لوشیا ایک بہترین خاتون ہیں۔ انہیں تصویر کو پسند کرنے اور تصویروں پر باتیں کرنے کا بہترین سلیقہ ہے۔ میرے آباؤ اجداد بھی امریکی تھے ان میں بھی ایک ایسا زبردست مصور ہو گزرا ہے جو بھاگتے ہوئے بھیلنے کی واٹر کلر تصویر بنا دیتا تھا۔ پھر ہم امریکہ سے ہجرت کر کے......»

الفریڈ اس گنجے مائیکل شیخی خورے کلرک کی باتوں سے سخت بور ہو رہا تھا۔ لوشیا نے دور سے دیکھا کہ مائیکل الفریڈ کو بور کر رہا ہے۔ وہ الفریڈ کے پاس آئی اور اسے اپنے ساتھ ایک بحری افسر سے ملانے لے گئی۔

یہ دعوت شام تک جاری رہی۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے مہمان رخصت ہونا شروع ہو گئے۔ الفریڈ لوشیا کا بازو تھامے ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گیا اور سگار سلگا کر دیوار پر لگی ہوئی کیپٹن جارج کی واٹر کلر تصویر کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔

«لوشیا! یہ کس بحری کپتان کی تصویر ہے۔ بڑی عمدہ بنائی ہے کسی آرٹسٹ نے؟ مگر یہ سو سال پرانی لگتی ہے۔»

لوشیا نے کہا: «تم نے بالکل ٹھیک پہچانا۔ یہ تصویر سو سال ہی پرانی ہے جب یہ مکان میں نے خریدا تھا تو یہ اسی جگہ لگی تھی۔ کہتے ہیں یہ تصویر اس کپتان کی ہے جو اس گرین ہاؤس کا کبھی مالک تھا۔»

الفریڈ تصویر کی نیلی آنکھوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ آنکھیں اسے گھور رہی ہیں۔ الفریڈ نے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ اس وقت چھت سے لٹکا ہوا فانوس اپنے آپ ہلنے لگا۔ الفریڈ نے چھت کی طرف دیکھ کر کہا۔

«یہ فانوس کیوں ہلنے لگا لوشیا؟»

لوشیا سمجھ گئی تھی کہ یہ فانوس کیوں ہل رہا ہے مگر وہ ہنس کر بولی:

«میرا خیال ہے روشندان سے ہوا کا جھونکا اسے ہلا کر گزر گیا ہے۔»

وہ ہوا کا جھونکا نہیں تھا بلکہ جارج کی روح تھی جو کھلی کھڑکی میں سے داخل ہو کر بڑی خاموشی سے گزر گئی تھی۔ اس نے کسی سے کوئی بات نہ کی تھی۔ اس نے ہر کسی سے بات کرنی چھوڑ دی تھی۔

«الفریڈ! آؤ سمندر کے کنارے سیر کرتے ہیں۔ یہاں سمندر کا کنارہ بڑا قدرتی ہے بھوری چٹانوں سے جب سمندر کی لہریں آکر ٹکراتی ہیں تو ایک عجیب سی بات سنائی دیتی ہے۔»

الفریڈ لوشیا کے ساتھ سمندر کے کنارے آکر ٹہلنے لگا۔ اس کا دماغ تیزی سے کچھ اور سوچ رہا تھا۔ لوشیا سوچ رہی تھی کہ چار دن بعد اس کی شادی ہو رہی ہے۔ شادی کے بعد وہ ہنی مون منانے ہوائی آئی لینڈ جائیں گے۔ اس نے الفریڈ سے پوچھا کہ وہ کس جگہ ہنی مون منانا چاہتا ہے؟ الفریڈ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ وہ چونک کر بولا:

«ہنی مون! میرا خیال ہے جاپان چل کر ہنی مون منائیں گے۔»

«اونہوں! مجھے جاپان پسند نہیں۔ میں تو ہوائی کے جزیرے میں جانا چاہتی ہوں۔»

«ٹھیک ہے جہاں تم کہتی ہو وہیں چلیں گے۔»

لوشیا نے الفریڈ کا بازو تھام کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر بولی

«کیا بات ہے الفریڈ! تم کچھ پریشان سے دکھائی دیتے ہو؟ میرا خیال ہے، دعوت نے تمہیں تھکا دیا ہے۔»

الفریڈ نے ایک آہ بھر کر کہا:

«دعوت نے مجھے بالکل نہیں تھکایا لوشیا! میں کسی اور بات سے پریشان ہوں؟»

لوشیا فوراً رک گئی۔

«ایسی کون سی بات تمہیں پریشان کر رہی ہے الفریڈ! خدا کے لئے مجھے جلدی بتاؤ۔ میں تمہاری پریشانی دور کرنے کے لئے اپنی جان بھی قربان کر دوں گی۔»

الفریڈ نے لوشیا کی طرف دیکھ کر درد بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

«نہیں نہیں لوشیا! میں اپنی پریشانی تم پر ظاہر کر کے تمہیں بھی پریشان نہیں کرنا چاہتا تم پہلے ہی میری خاطر بہت پریشانیاں اٹھا چکی ہو۔»

لوشیا نے الفریڈ کا بازو تھام کر کہا:

«الفریڈ! کیا تم مجھے غیر سمجھتے ہو؟ کیا تمہارا دکھ۔ اب میرا دکھ نہیں ہے؟ میں تمہاری بیوی بننے والی ہوں۔ دو روز بعد ہماری شادی ہو جائے گی۔ اگر تم نے اپنا غم۔ اپنی پریشانی مجھے بیان نہ کی تو میں ابھی یہاں رونا شروع کر دوں گی۔»

«نہیں نہیں لوشیا! اپنے دماغ پر میری پریشانی کا اتنا اثر نہ ڈالو۔»

«تو پھر مجھے بتا دو تم کیوں اور کس لئے پریشان ہو؟»

الفریڈ ذہنی طور پر لوشیا کو اسی مقام پر لانا چاہتا تھا۔ لوہا خوب گرم ہو گیا تھا۔ اس نے کہا:

«بات یہ ہے لوشیا کہ گاؤں میں ہمارا آبائی مکان ایک ساہوکار کے ہاں گروی پڑا

ہے۔ میں نے ماں کو تار دیا تھا کہ وہ میری شادی پر لندن پہنچ جائے۔ آج صبح اس نے مجھ سے ون پر بات کی اور بتایا کہ جب تک گاؤں والا مکان ساہوکار کے قبضے سے واپس نہیں لو ئے میں شادی میں شرکت نہیں کروں گی۔»

لوشیا نے کہا:

«بس یہی پریشانی ہے یا کوئی اور بات بھی ہے؟»

«نہیں لوشیا اور بات کیا ہو سکتی ہے! بس اسی لئے میں صبح سے پریشان ہوں کہ گاؤں اکر مکان کیسے واگزار کراؤں۔»

لوشیا نے الفریڈ کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا:

«میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہاری ہو گئی ہوں الفریڈ! میری دولت کوئی چیز نہیں۔ تم اگر ہو تو میں تمہارے لئے اپنی جان بھی قربان کر سکتی ہوں۔ تم آج ہی لندن سے گاؤں جاؤ اور وہاں اکر اپنا مکان ساہوکار کے چنگل سے چھڑا کر کل دوپہر تک واپس لندن آ جاؤ۔ ساہوکار کو تنی رقم دینی ہے؟»

الفریڈ نے یونہی جھوٹ موٹ حساب لگانے لگا کہ زمین کا ٹکڑا بھی ساتھ ہی رہن رکھا ہوا ہے کان اور زمین ملا کر کل پچاس ہزار پاؤنڈ کی خطیر اس نے لوشیا کو بتائی۔ لوشیا محبت کی شاہراہ ر دیوانوں کی بھاگی جا رہی تھی۔ اس کے آگے پچاس ہزار پاؤنڈز کی کیا حیثیت تھی۔ ایک لاکھ پاؤنڈ سالانہ کی رائلٹی تو اسے ایک تیل کے کنوئیں ہی سے ملتی تھی۔ لوشیا نے کہا:

«بس! صرف پچاس ہزار پاؤنڈز کے لئے تم اتنے پریشان تھے کہ میری بھی جان نکال دی۔ چلو واپس گھر چلتے ہیں۔ میں تمہیں ابھی چیک لکھ دیتی ہوں۔»

اب الفریڈ نے سوچا کہ اس نے لاکھ پاؤنڈ کیوں نہ بتا دیئے۔ لیکن پچاس ہزار پاؤنڈ بھی ہت تھے گرین ہاؤس واپس آتے ہی لوشیا نے اپنی الماری میں سے چیک بک نکالی اور اسے یز پر رکھ کر الفریڈ کے نام کا پچاس ہزار روپے کا چیک لکھ کر اسے دے دیا۔

«یہ میری طرف سے تمہیں شادی کا ایک حقیر سا تحفہ ہے الفریڈ!»

الفریڈ کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اس نے اپنے نام کا اتنا بڑا چیک زندگی میں کبھی

نہیں دیکھا تھا۔ اس نے لوشیا کا ہاتھ چوم کر کہا:

"میں کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں لوشیا! تم نے ساری زندگی کے لئے مجھے خرید لیا ہے۔"

"ایسی باتیں نہ کرو الفریڈ! ہم ایک دوسرے کے جیون ساتھی ہیں۔ ہمیں دُکھ سکھ میں ایک دوسرے کا ساتھ دینا ہے۔"

شام کو الفریڈ اپنی گاڑی میں سوار ہو کر واپس لندن کی طرف روانہ ہو گیا۔ پچاس ہزار پونڈ کا خطیر چیک اس کے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھا ہوا تھا۔ لندن اپنے فلیٹ میں پہنچ کر اس نے ایک بار پھر جیب سے چیک نکال کر دیکھا۔ اسے غور سے پڑھا۔ لفظوں اور ہندسوں کو بار بار گِنا۔ پورے پچاس ہزار پونڈ لکھے تھے۔ نیچے لوشیا کے دستخط تھے۔ کہیں یہ چیک جھوٹا تو نہیں؟ پھر اسے خیال آیا کہ لوشیا ایک کروڑ پتی بیوہ ہے۔ اس کا چیک کبھی جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ وہ اس سے شادی کر رہی ہے۔ وہ اسے جھوٹا چیک کبھی نہیں دے سکتی۔ اصل میں چیک بالکل اصلی تھا۔ یہ الفریڈ کے وسوسے تھے جو اسے پریشان کر رہے تھے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ صبح جب وہ بنک سے نکل کر واپس اپنی گاڑی میں آئے گا تو اس کے تھیلے میں پچاس ہزار پونڈ کے کرنسی نوٹ رکھے ہوں گے۔

الفریڈ نے رات بڑی مشکل سے کاٹی۔ وہ کئی بار اٹھا اور اس نے بار بار پانی پیا اور گھڑی میں وقت دیکھا۔ کم بخت رات کچھ زیادہ لمبی ہو گئی تھی۔ دن چڑھنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ سورج ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے رات ختم ہوئی۔ دن کا اُجالا چاروں طرف پھیل گیا اور سڑک پر سکول اور کارخانے جانے والی بسوں کا شور سنائی دیا۔ الفریڈ نے جلدی جلدی نشیو کی ناشتا کیا اور بینک کھلنے کے وقت سے ایک گھنٹہ پہلے ہی فلیٹ سے نکل آیا۔ گاڑی میں بیٹھ کر اس نے شہر کی بڑی سڑکوں پر چکر لگانے شروع کر دیئے۔ ایک بار وہ بینک کے آگے سے بھی گزرا جہاں سے اس نے چیک کیش کرانا تھا۔ ابھی بنک کا دروازہ بند تھا۔

الفریڈ ایک پارک میں جا کر بیٹھ گیا۔ مئی کے مہینے کی ٹھنڈی خوشبودار ہوا چل رہی تھی۔ موسم بے حد خوشگوار تھا۔ اس نے سگریٹ نکال کر سلگایا اور آہستہ آہستہ کش لینے لگا۔ اس نے

گھڑی دیکھی۔ ابھی بنک کھلنے میں پورا آدھا گھنٹہ پڑا تھا۔ ایک بوڑھا اس کے پاس ہی بنچ پر آ کر بیٹھ گیا اور اخبار پڑھنے لگا۔ دو ایک بار بوڑھے نے کنکھیوں سے الفریڈ کو دیکھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے بوڑھا اس کے عزائم سے باخبر ہو گیا ہے۔ الفریڈ نے جلدی سے ایک لمبا کش لگا کر سگریٹ پھینکا اور اٹھ کر چل دیا۔ اس نے پارک کا ایک پورا چکر لگایا۔ واپس آ کر گاڑی میں بیٹھا۔ گاڑی سٹارٹ کی اور لندن بُرج کی طرف نکل گیا۔

وہاں ٹریفک بہت زیادہ تھی۔ الفریڈ اس ٹریفک میں پھنسنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ دوسری طرف کو گھوم گیا اور اوپر سے ہو کر چھ سات میل کا چکر لگا کر بینک کے سامنے آ گیا۔ یہ دیکھ کر کہ بینک کھل چکا ہے اس کا دل خوشی اور اندیشے سے دھڑک اُٹھا۔ اسے صرف ایک ہی اندیشہ تھا کہ اگر کسی صورت سے چیک واپس کر دیا گیا تو کیا ہوگا؟ لیکن نہیں ایسا ہو نہیں سکتا۔ لوشیا کوئی غریب عورت نہیں ہے وہ کروڑوں پاؤنڈز کی مالک ہے۔ پچاس ہزار پاؤنڈز اس کے آگے کچھ نہیں ہیں۔ اس نے گاڑی پارکنگ کی جگہ پر کھڑی کر کے گاڑی کو لاک کیا اور بریف کیس ہاتھ میں لے کر بڑی شان اور کاروباری لوگوں ایسے وقار کے ساتھ بنک کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ اس سے پہلے وہ اس بنک میں کبھی نہیں آیا تھا۔ کاؤنٹر کے پیچھے کلرکوں نے کام شروع کر دیا تھا۔

الفریڈ نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کاؤنٹر پر جا کر چیک پیش کیا۔ کلرک نے چیک کو بڑے غور سے جھک کر عینک آگے کھسکا کر دیکھا۔ پھر منہ اُٹھا کر الفریڈ کو دیکھا۔ الفریڈ نے سانس روک لیا۔ کلرک نے مسکرا کر کہا:

"سر! یہاں دستخط کر دیجیے۔"

الفریڈ نے بھی مسکراتے ہوئے قلم نکال کر یوں بے نیازی سے دستخط کئے۔ جیسے وہ اس قسم کے چیک کیش کرانے کا عادی ہے۔ اب وہ ٹوکن لے کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دوسری جگہ کاؤنٹر پر جا کر ٹوکن پیش کیا۔ خزانچی نے ٹوکن لے کر نوٹ گننے شروع کر دیئے۔ الفریڈ نے اطمینان کا سانس لیا۔ جب وہ اپنے بریف کیس میں پچاس ہزار پاؤنڈز کے نئے کرنسی نوٹ بھر کر اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھا تو اسے اپنے آپ پر کسی لارڈ کا گمان ہو رہا تھا

اس نے انجن سٹارٹ کیا اور وہاں سے سیدھا اپنے فلیٹ کی طرف چل گیا۔ فلیٹ پر آ کر اس نے کرنسی نوٹ ایک الماری کے اندر رکھ کر تالا لگا دیا اور گلاس میں برانڈی بھر کر صوفے پر لیٹ گیا اور مزے سے چسکیاں لیتے ہوئے سگریٹ کا دھوآں اڑانے لگا۔ وہ سارا دن اپنے فلیٹ میں بند رہا اور روسٹ مرغ کے ساتھ برانڈی کے جام بھر بھر کر پیتا رہا شام کو اس نے لوشیا کو فون کیا۔ وہ بڑی نیازمندی اور محبت سے اس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ اس نے لوشیا کو بتایا کہ وہ ابھی ابھی اپنی ماں سے مل کر آ رہا ہے۔ انہوں نے اپنا آبائی مکان اور زمین ساہو کار سے واپس لے لی ہے اور اب اس کی ماں خوشی سے اس کی شادی میں شرکت کے لئے لندن آ رہی ہے۔ الفریڈ نے ایک بار پھر لوشیا کا شکریہ ادا کیا۔ لوشیا نے حسب عادت اسے اپنی محبت زندگی کے ہر کٹھن مقام پر الفریڈ کے لئے جان کی قربانی تک پیش کرنے کا یقین دلایا۔

لوشیا سے الفریڈ کے لئے جان کی قربانی تک پیش کرنے کا یقین دلایا۔

لوشیا سے الفریڈ کی یہ آخری ملاقات تھی۔ مگر لوشیا کو معلوم نہ تھا کہ اس کے بعد وہ لوشیا سے کبھی نہیں ملے گا۔ اور اس کے بعد وہ لوشیا سے اتنی دور چلا جائے گا کہ وہ زندگی بھر کبھی اس کی صورت نہ دیکھ سکے گی۔ شادی کا دن اگلے روز تھا۔ فون پر ہی یہ طے ہو گیا کہ صبح ہی صبح شادی کا جوڑا لے کر مارتھا اور گنجے مائیکل کے ساتھ الفریڈ کے فلیٹ میں پہنچ جائے جہاں سے وہ لوگ گرجا روانہ ہو جائیں گے۔ لوشیا نے مائیکل کو اپنے سرپرست کے طور پر چنا

صبح شادی کا دن تھا اور رات کے ٹھیک نو بجے آسٹریلیا جانے والی فلائیٹ لندن ائیرپورٹ پر تیار کھڑی تھی۔ ائیرپورٹ کے لاؤنج میں سپیکر پر اعلان کیا گیا کہ آسٹریلیا جانے والے مسافروں سے درخواست ہے کہ وہ جہاز پر تشریف لے آئیں۔ الفریڈ آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے کوٹ پہنے ہاتھ میں بریف کیس تھامے تیزی سے چلتا ہوا جہاز کی سیڑھیوں تک پہنچا اور جہاز میں سوار ہو گیا۔ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر اس نے بڑے آرام سے اپنا سر پشت سے لگایا اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ تھوڑی دیر میں جہاز کے انجن سٹارٹ ہو گئے اور وہ لندن کے آسمان پر اڑ رہا تھا۔ لوشیا نے رات بڑے سنہری خواب دیکھتے ہوئے بسر کی صبح اس کی شادی ہو رہی تھی۔ اس شخص کے ساتھ جس سے وہ دل و جان سے پیار کرتی تھی۔ منہ اندھیرے اٹھ کر اس نے تیاریاں شروع کر دیں۔ مارتھا بھی جاگ پڑی تھی اور اپنا جوڑا باہر نکال کر اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ دن چڑھا تو مائیکل نے فون کیا کہ وہ آدھ گھنٹے تک پہنچ رہا ہے۔

”خدا کے لئے دیر نہ کرنا مائیکل۔ تم بہت سست الوجود ہو۔“

”ہو ہو ہو۔ کبھی نہیں بیگم صاحبہ! کبھی نہیں۔“

لوشیا نے ہلکا سا ناشتہ کیا۔ خوشی سے اسے بھوک تک نہیں لگ رہی تھی۔ تمام تیاریاں مکمل ہو گئی تھیں۔ شادی کا جوڑا اور دوسرا سامان گاڑی میں رکھ دیا گیا تھا کہ باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ لوشیا کھڑکی میں سے جھانک کر باہر دیکھا۔ یہ کوئی ٹیکسی تھی۔ اس نے سوچا شاید مائیکل کی گاڑی خراب ہو گئی ہے اور وہ ٹیکسی میں آیا ہے۔ دروازے کی گھنٹی بجی۔ مارتھا نے دروازہ کھولا۔ ایک ادھیڑ عمر کی دبلی اور کمزور سی عورت ایک چھوٹے بچے کو ساتھ لئے کھڑی تھی۔ اس نے مارتھا سے پوچھا:

”کیا مسز سمتھ اندر ہیں؟ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔ بہت ضروری کام ہے مجھے ان سے۔“

مارتھا اس عورت کو ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ پھر اس نے لوشیا کو آواز دی کہ کوئی خاتون اس سے ملنے آئی ہے۔ لوشیا خوشی خوشی نیچے آ گئی۔ اس نے نووارد عورت کو سر سے تک غور سے دیکھا وہ بڑے غریب مزدور گھرانے کی خاتون معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے گال اندر کو پچکے ہوئے تھے اور آنکھوں میں ویرانیاں جھانک رہی تھیں۔ لوشیا کا یونہی دل دھڑکنے لگا۔ اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے اس عورت سے پوچھا:

”فرمائیے۔ آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟“

نووارد عورت نے بڑے غور سے لوشیا کو دیکھا اور بولی۔

”آپ ہی مسز سمتھ ہیں؟“

”جی ہاں! میں ہی مسز سمتھ ہوں۔ کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں؟

اس عورت نے کہا

”میں الفریڈ کی بیوی ہوں۔ یہ اس کا بچہ تھا۔ دو بچے گھر پہ ہیں۔“

لوشیا پر جیسے بجلی سی گری پڑی۔ وہ کھڑی گرنے لگی تھی کہ ایک دم سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"یہ آپ ..... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

اس عورت نے آنکھوں میں آنسو لا کر کہا:

"کاش جو کچھ میں آپ سے کہہ رہی ہوں، یہ غلط ہوتا، لیکن مسز سمتھ یہ بالکل صحیح ہے۔ میں ہی اس الفریڈ کی بیوی ہوں جس سے آج آپ شادی کرنے والی ہیں۔ الفریڈ سے میری شادی کو چھ برس ہو گئے ہیں۔ میرے تین بچے ہیں۔ میں گاؤں میں فاقے کر رہی ہوں۔ میں آپ کو صرف یہ بتانے آئی ہوں کہ الفریڈ آپ کو اور مجھ کو اور اپنے بچوں کو چھوڑ کر ساری دولت اپنے ساتھ لے کر لندن سے کسی نامعلوم مقام کو پرواز کر چکا ہے کہ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو لندن جا کر اس کے خالی فلیٹ کو دیکھ آئیں۔ وہ میری زندگی سے بھی نکل گیا ہے اور آپ کی زندگی میں بھی کبھی نہیں آئے گا۔ اس نے ہم سب سے دھوکا کیا ہے، مجھ سے، آپ سے اور اپنے معصوم بچوں سے۔ وہ ظالم ہے۔ قاتل ہے۔ خونی ہے اجازت دیجئے۔ خدا حافظ!"

الفریڈ کی بیوی اپنے بچے کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر واپس چلی گئی۔ لوشیا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے جاتے دیکھتی رہی۔ مارتھا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔ لوشیا نے سفید سفید آنکھوں سے مارتھا کی طرف دیکھا اور بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

لوشیا شام تک بے ہوش رہی۔ تمام لوگوں کو یہی بتایا گیا کہ لوشیا کی طبیعت اچانک خراب ہو جانے کی وجہ سے شادی ملتوی کر دی گئی ہے۔ ڈاکٹر لوشیا کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتے رہے۔ رات کو اسے ہوش آیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر بے ہوش ہو گئی۔ لوشیا تین روز تک زندگی اور موت کے درمیان لٹکتی رہی۔ چوتھے روز اس نے مارتھا کو آواز دے کر کہا کہ اسے کافی کی ایک پیالی لا دے۔ مارتھا دوڑی دوڑی نیچے گئی اور جلدی سے کافی کی کر اسے پیش کی اور اس کا سر دبانے لگی۔ لوشیا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے سر دبانے سے کر دیا۔ اس نے کافی کا ایک گھونٹ پیا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ کتنی دیر تک روتی رہی، ہچکیاں لے لے کر اس کا سارا بدن دکھنے لگا۔ مارتھا اسے حوصلہ دیتی رہی اور روتی رہی۔

"وہ ایک دھوکے باز تھا بیگم صاحبہ! اسے بھول جائیں۔ مجھے افسوس ہے، آپ کو

ں قدر صدمہ ہوا۔"

لوشیا نے ہاتھ کے اشارے سے مارتھا کو روک دیا اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ روتے روتے اسے نیند آ گئی اور شاید وہ سو گئی۔ ڈاکٹروں نے آ کر اسے سوتے میں ہی ٹیکہ لگایا اور مارتھا کو ہدایت کی کہ اسے ہرگز ہرگز نہ جگایا جائے۔ اس کے لئے نیند سب سے بہتر علاج ہے۔ ساری رات لوشیا سوئی رہی۔ صبح اٹھی تو اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔ وہ بڑی کمزور ہو گئی تھی۔ اس کا سرخ رنگ زرد ہو گیا تھا۔ مارتھا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اس کے بعد لوشیا نے اپنے آپ کو گرین ہاؤس کی چار دیواری میں بند کر لیا۔ گاؤں والوں نے اس کے بعد لوشیا کو کبھی نہ دیکھا۔ اس کی زندگی ایک پراسرار زندگی بن کر رہ گئی۔ اس کے بعد لوشیا کی حیاتِ فانی کا ایک نیا باب شروع ہو گیا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس کی موت کا پہلا باب شروع ہوا۔ اس نے زینہ بہ زینہ موت کی طرف چلنا شروع کر دیا وہ سارا سارا دن اپنے بیڈ روم کے بستر پر چپ چاپ لیٹی رہتی۔ تھوڑا بہت کھانا زہر مار کرتی اور پھر بستر پر پڑ جاتی۔ شروع شروع میں گاؤں کے لوگ اور رائیکل اس کی مزاج پرسی کو آئے۔ پھر انہوں نے بھی آنا بند کر دیا تھا۔ اس نے مارتھا کو سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ کوئی شخص اس سے ملاقات کرنے نہ آئے۔ پہلے گرین ہاؤس کے گیٹ پر باہر تالا پڑا رہتا تھا۔ اب گرین ہاؤس کے گیٹ پر باہر تالا پڑا رہتا تھا۔ اب گرین ہاؤس کے گیٹ پر اندر بھی تالا پڑ گیا اور اس تالے کو بھی آہستہ آہستہ زنگ لگنا شروع ہو گیا۔

ہفتے میں ایک روز کسی وقت شام کے جھٹپٹے میں مارتھا ٹوکری لے کر ضرورت کی چیزیں خریدنے قصبے میں جاتی اور کسی نیم روشن سٹور سے سامان خرید کر واپس آ جاتی۔ اگر کوئی اس سے مسز سمتھ کے بارے میں پوچھتا تو وہ کوئی جواب نہ دیتی۔ لوگوں نے آہستہ آہستہ پوچھنا بھی چھوڑ دیا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ لوشیا کو شادی کا گہرا صدمہ ہوا ہے اور اس نے صدمے کو سینے سے لگا لیا ہے۔ وہ مارتھا سے بھی کوئی بات نہ کرتی تھی۔ بہت شدید ضرورت کے وقت وہ اسے اشارے سے بلاتی۔ دو لفظوں میں بات کرتی اور اسے اپنے بیڈ روم سے رخصت کر دیتی۔ شاید اب لوشیا کے ذہن میں کیپٹن جارج کا خیال چھا گیا تھا۔ شاید اب وہ اس محبت

جوگن بن گئی تھی جو زندگی کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے اور موت کے بعد شروع ہوتی ہے اس ر
آدھی رات کی ویران خاموشیوں میں بیڈ روم کے اندھیروں میں جارج کو آوازیں دیں۔ لیکن کم
نے اس کی پکار کا کوئی جواب نہ دیا۔ گرین ہاؤس کے ذرّے ذرّے پر گہری آسیبی خاموشیوں
اپنی مہر ثبت کر دی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہاں صدیوں سے کوئی نہیں رہ رہا۔ نہ لوش
نہ مارتھا، اور نہ جارج کی روح ...... یہ گھر پہلے سے زیادہ اُجڑ گیا تھا۔ پہلے جارج کی رو
جارج کا بھوت رہتا تھا تو لوگوں کو کبھی کبھی یہاں راتوں کو روشنی دکھائی دے جاتی تھی او
طوفانی راتوں کو بحری کپتان کی آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔ لیکن اب جب کہ دو زندہ عو
گرین ہاؤس میں رہتی تھیں تو وہاں موت سے بھی زیادہ بھیانک خاموشی اور تاریکی چھا گئی تھ
وقت گذرتا چلا گیا۔ لوشیا کے سرخ بالوں نے سفید ہونا شروع کر دیا۔ وہ کمزور ہوتی
چلی گئی۔ وقت سے پہلے بوڑھی ہوتی چلی گئی۔ مارتھا برابر اس کی خدمت میں لگی ہوئی تھی۔ اپنی ما
کے ساتھ وفادار حبشی خادمہ نے بھی ڈھلنا شروع کر دیا تھا۔ ایک رات جب کہ بڑے زور
بارش ہو رہی تھی۔ بجلی چمک رہی تھی۔ بادل گرج رہے تھے۔ سمندر شور مچا رہا تھا کہ لوشیا ب
سے اپنے بستر پر سے اٹھی اور نیچے اتر کر ڈرائنگ روم میں آگئی۔ کارنس پر ایک دھیمی سی مو
جل رہی تھی۔ وہ کیپٹن جارج کی تصویر کو مسلسل تکے جا رہی تھی۔ پھر اس کی آنکھوں سے گرم
آنسو ڈھلک پڑے۔ وہ خاموشی سے دروازہ کھول کر باہر باغ میں آگئی، تیز ہوا اور بار
میں گنجان درخت دہرے ہو رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ لوشیا نے سمندر کی طرف چلنا
کر دیا۔ بارش میں وہ ساری بھیگ گئی۔ لیکن وہ چلتی چلی گئی۔ بھوری چٹانوں کے ساتھ ٹکرا
کا شور اتنا خوفناک تھا کہ انسان کا دل دہل جائے۔ مگر لوشیا پر جیسے کسی خوف کسی شور کسی
کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ایک چٹان کے ہمراہ جا کر کھڑی ہو گئی اور خاموش، ساکت
سے اندھیرے میں سمندر کی طرف سے آتی بڑی بڑی لہروں کو دیکھنے لگی۔ وہ آگے کو جھکی۔
موجیں چٹان سے ٹکرا کر سفید خوفناک جھاگ اڑا رہی تھیں پھر جیسے وہ آگے کو گری اور کسی نے
اٹھا کر واپس ریت پر لٹا دیا۔

لوشیا کو ہوش آیا تو بارش کی پھوار اس کے بھیگے ہوئے جسم پر پڑ رہی تھی۔ رات

تھی۔ سمندر کا طوفان تھم گیا تھا اور وہ اپنے باغ کے ایک بنچ پر پڑی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔
سردی سے ٹھٹھر رہی تھی۔ اس کے کپڑے بھیگ کر اس کے بدن سے چپک گئے تھے وہ باغ میں
گزر کر مکان کے اندر آگئی اور پھر خاموشی سے اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔ دوسرے دن اسے شدید
ہو گیا۔ مارتھا نے مجبور ہو کر ڈاکٹر کو فون کیا اور اسے بتایا کہ لوشیا کو تیز بخار ہے۔ بوڑھا ڈاکٹر
وقت اپنی کار میں بیٹھ کر گرین ہاؤس پہنچ گیا۔ لوشیا کو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر اسے دیکھنے آیا ہے۔
اس نے ملنے سے انکار کر دیا۔ مارتھا نے آکر ڈاکٹر سے کہا:

"بیگم صاحبہ ضد کر رہی ہیں ڈاکٹر! خدا کے لئے انہیں کسی طرح ٹھیک کر دیں۔ انہیں بڑا
بخار ہے؟"

ڈاکٹر نے کہا:

"مسز سمتھ کے بیڈ روم کو کون سی سیڑھیاں جاتی ہیں؟"

مارتھا ڈاکٹر کو ساتھ لے کر لوشیا کے بیڈ روم میں آگئی، ڈاکٹر کو دیکھ کر لوشیا نے اپنا منہ
بالیا۔ ڈاکٹر نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار سے کہا:

"بیٹی! میں ڈاکٹر ہوں۔ میرا فرض ہے کہ میں تمہاری جان بچاؤں۔"

اور پھر ڈاکٹر نے لوشیا کو انجکشن دے کر اُسے لٹا دیا اور مارتھا سے کہا کہ وہ لوشیا
ماتھے پر گیلی پٹیاں رکھے۔ ڈاکٹر چلا گیا۔ مارتھا نے لوشیا کے ماتھے پر گیلی پٹیاں رکھے۔ ڈاکٹر
گیا۔ مارتھا نے لوشیا کے ماتھے پر گیلی پٹیاں بدلنا شروع کر دیں۔ لوشیا کو بخار ہو گیا اور
نے بے ہوشی میں بولنا شروع کر دیا:

"جارج! جارج! دیکھو آسمان کتنا چمکیلا ہے۔ دیکھو! سنہری دھوپ گلاب کے پھولوں
یک رہی ہے۔ سنو! میں نے گلاب کے یہ پھول تمہارے لئے منگوائے ہیں۔"

مارتھا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس سے اپنی مالکن کی یہ حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ اسی
ج بولتے بولتے لوشیا کو نیند آگئی۔ یا وہ بے ہوش ہو گئی۔ مارتھا اس کی پٹیاں بدلتی رہی
کے وقت ڈاکٹر پھر آیا۔ اس نے نبض دیکھی۔ بخار ٹوٹ چکا تھا۔ رات کو بخار اتر گیا۔ لوشیا
آنکھیں کھول دیں مگر اس نے مارتھا سے کوئی بات نہ کی۔ بس خاموش نگاہوں سے اسے تکتی

رہی۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد گرین ہاؤس پر ایک بار پھر اسرار اور گہری خاموشی کا بھاری پردہ گر گیا۔ وقت کا رتھ ازل سے ابد کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ ایک سال، دو سال، دس سال، بیس سال بیت گئے۔ لوشیا کے سر کے بال آدھے سفید ہو گئے۔ وہ سوکھ کر کانٹا بن گئی۔ نہ اس نے کسی کو اپنے دل کا حال سنایا، نہ کسی نے اس کے دل کا حال پوچھا۔ وہاں اس کا دکھ سننے والی صرف اس کی پرانی خادمہ مارتھا ہی تھی۔ لوشیا نے مارتھا سے کبھی کوئی بات نہ کی تھی۔ جس نے اس کا حال پوچھنا تھا، وہ کبھی اسے راتوں کی تنہائیوں میں آواز نہ دیتا تھا۔ لوشیا نے رو رو کر جارج کی روح کو پکارا مگر جارج نے کوئی آواز نہ دی۔ لوشیا نے سسکیاں بھرتے ہوئے راتوں کو بستر پر لیٹے لیٹے جارج کی روح کو یاد کر کے کہا:

"جارج! مجھے معاف کر دو۔ جارج! ایک بار میرے کانوں کے پاس آکر کہہ دو کہ تم نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ تم کہاں ہو جارج! تم آواز کیوں نہیں دیتے۔ مرنے والے نہیں بولا کرتے۔ لیکن تم تو کبھی نہیں مر سکتے۔ پھر تم آواز کیوں نہیں دیتے؟ دیکھو جارج! میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ میرے سر کے بال سفید ہو گئے ہیں۔ کیا اب بھی تم مجھ سے پیار کرتے ہو؟"

لوشیا نے جارج کی روح کو کئی بار پکارا مگر جارج کی روح کو ایسی مہر خاموشی لگی تھی کہ اس نے پھر کبھی اس کی پکار کا جواب نہ دیا۔ کبھی اس کے کان کے پاس آکر سرگوشی کر کے نہ کہا کہ لوشیا! میں تمہارے پاس ہوں۔ گھبراؤ نہیں۔ میں آج بھی تم سے اسی طرح پیار کرتا ہوں۔ وقت کا رتھ ازل سے ابد کی طرف اڑتا چلا گیا۔ پچاس برس بیت گئے۔ گاؤں کے پرانے لوگ مر گئے۔ نئے لوگ جوان ہو گئے۔ مارتھا بھی ایک روز خاموشی سے چل بسی۔ اب لوشیا گرین ہاؤس میں اکیلی رہ گئی۔ وہ اس قدر بوڑھی ضعیف ہو گئی تھی کہ بڑی مشکل سے اٹھ کر کہیں جا سکتی تھی۔ اس کے سر کے بال سفید ہو کر گرنے لگے تھے۔ اس کے سارے دانت جھڑ گئے تھے۔ اس کا حسن خاک میں مل گیا تھا۔ وہ سمندر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے سامنے آرام کرسی پر سر جھکائے اونگھتی رہتی تھی۔ ایک روز اونگھتے ہوئے وہ کرسی سے گر پڑی اور اس کی روح پرواز کر گئی۔

ٹھیک اس وقت جارج کی روح نہایت خوب صورت لباس میں نمودار ہوئی۔ اس نے

دونوں ہاتھ بڑھا کر لوشیا کی بوڑھی لاش کو آواز دی:

"لوشیا! آؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

اور لوشیا کی بوڑھی ضعیف لاش میں سے وہی پچاس سال پہلے کی سرخ بالوں اور گداز جسم والی حسین لوشیا کی روح مسکراتی ہوئی اٹھی اور اس نے اپنے ہاتھ جارج کی روح کی طرف بڑھا دیئے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر کھلی کھڑکی کی طرف بڑھے اور مسکراتے ہوئے بیکراں سمندر کی طرف پرواز کر گئے۔

رابنسن کروسو

اس نے اپنی زندگی کے پچیس سال ویران جزیرے میں گذار دیئے۔ اُسے قدم قدم پر حادثات سے دوچار ہونا پڑا۔ موت کئی بار آکر اُس کے قریب سے گذر گئی —— حیرت انگیز واقعات پر مبنی پُراسرار آپ بیتی۔

ترجمہ

اے حمید

اِس کتاب کی کہانی

ناول "رابنسن کروسو" میں نے بہت بعد میں پڑھا۔

اس سے پہلے مجھے ایک ویران اور تقریباً غیر آباد جزیرے میں جانے کا حادثہ پیش آگیا۔ یہ ایک حادثہ ہی تھا۔ ہوا یوں کہ جون جولائی کے دن تھے۔ ان دنوں بحیرہ عرب اور خلیج بنگال کے سمندر چڑھے ہوتے ہیں۔ اگر آپ ان مہینوں میں ان سمندروں کا سفر کریں تو جہاز پر اتنی رولنگ ہوتی ہے کہ آپ اسے برداشت نہیں کر سکیں گے۔ یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ میں جہاز پر سوار ہوگیا۔ جہاز رات کے وقت کھلے سمندر میں پہنچ گیا۔ دن چڑھا تو سارے کا سارا جہاز بُری طرح رولنگ کر رہا تھا۔ جہاز کا ایک پہلو اوپر اُٹھ کر پھر نیچے آجاتا۔ چکروں نے بُرا حال کر دیا۔ شام تک ان چکروں کا عادی ہوگیا۔ لیکن مصیبت اس وقت شروع ہوئی جب سمندر میں زبردست طوفان آگیا۔ بادلوں کی گرج، تیز بارش اور طوفانی ہوا نے جہاز کو بپھرے ہوئے سمندر میں کھلونے کی طرح اُچھالنا شروع کر دیا۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ رات کو سارے جہاز پر مکمل بلیک آؤٹ ہوتا تھا۔ دن کو بھی جاپانی آبدوزوں کا خطرہ ہر وقت سروں پر منڈلاتا رہتا تھا۔

طوفان کی شدت زیادہ ہو تو سارے جہاز پر خطرے کا الارم بجا دیا گیا۔ مسافر پریشان ہوگئے۔ بچوں اور عورتوں نے رونا شروع کر دیا۔ طوفان تھمنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ سمندر کی پہاڑ پہاڑ جتنی لہریں دور دور سے آکر جہاز سے ٹکرا رہی تھی اور اُسے اچھال رہی تھیں۔ جہاز کا کپتان ایک تجربہ کار انگریز تھا۔ اس نے خود مسافروں کے پاس

لوئیر ڈیک پر آکر انہیں تسلّی دی اور کہا کہ ہم جہاز کو یہاں سے ساٹھ میل دور ایک جزیرے پر لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ طوفان گذر گئے تو پھر سفر شروع کیا جائے۔ میں پریشان تو بہت تھا۔ جان کے لالے بھی پڑے تھے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ جان کر خوشی بھی ہوئی کہ ہمارا جہاز کسی ویران جزیرے کی طرف جا رہا ہے۔ مجھے بحری ڈاکوؤں کی کہانیاں یاد آگئیں جن میں ڈاکو تجارتی جہازوں کا سامان لوٹ کر اسے ویران جزیروں میں دبا دیا کرتے تھے۔

اور پھر کچھ دیر بعد دور سے ناریل کے درختوں کے جھنڈ دکھائی دینے لگے۔
یہی وہ ویران جزیرہ تھا جہاں ہمارا جہاز لنگر انداز ہونے والا تھا۔ کپتان نے بڑی مہارت سے جہاز کو ایک جگہ لنگر انداز کر دیا۔ مسافروں کو جزیرے تک پہنچانے کے لئے کشتیوں میں سوار کروایا اور ساحل پر پہنچا دیا۔ میں بھی ایک کشتی میں سوار ہو کر جزیرے پر آگیا۔ یہ واقعی ایک ویران اور غیر آباد جزیرہ تھا۔ نہ آدم نہ آدم زاد۔ اور ناریل کے درختوں کے جھنڈ ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ دور تک چلے گئے تھے۔ جزیرے کا کنارہ آگے جاکر بائیں طرف کو گھوم گیا تھا۔ لوگوں نے زمین پر پہنچ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ ریت پر ادھر ادھر لیٹ کر آرام کرنے لگے۔

میرے دل میں خیال آیا کہ جزیرے کی سیر کرنی چاہیئے، چنانچہ میں ایک طرف سے درختوں کے اندر داخل ہوگیا۔ یہاں جھاڑیاں ہی جھاڑیاں اُگی تھیں۔ ان میں ایسے ایسے ٹروپیکل پھول کھلے تھے کہ ایسے رنگ میں نے آج تک نہیں دیکھے تھے۔ گھنے درختوں کے تنوں پر عجیب و غریب پتوں اور رنگوں کی پھولدار بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ میں جزیرے میں آگے نکل گیا۔ درختوں پر رنگ برنگ پرندے بول رہے تھے۔

ایک بھاری بھرکم کچھوا رینگتا ہوا سمندر کی طرف چلا جا رہا تھا۔ ایک درخت کی ٹہنی پر زرد پروں اور لال چونچ والا طوطا بیٹھا تھا۔ اس نے گردن جھکا کر مجھے غور سے دیکھا۔ گردن کی کلغی کھڑی کی اور جیسے زور سے قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ میں

بھی ہنس دیا۔ اور آگے گیا تو ایک درخت پر سبز رنگ کا باریک سانپ لٹکا ہوا تھا۔ بس اُسے دیکھ کر میں ڈر گیا اور واپس بھاگا۔ یہ رات جزیرے پر ہی بسر ہوئی ایسی خاموشی میں نے دیکھی۔ مجھے اپنے سانس لینے کی بھی آواز آرہی تھی۔ سمندر ایک دم سے بے حد پُرسکون ہوگیا تھا۔ صبح صبح مسافروں نے جہاز پر بیٹھنے کی تیاری شروع کر دی۔ میں جزیرے کی آخری سیر کے لئے چل پڑا۔ جب واپس آیا تو آخری کشتی جہاز کی طرف جا رہی تھی۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ اگر میں جزیرے پر اکیلا رہ جاتا تو کیا ہوتا؟

پھر جب میں نے ڈینیئل ڈیفو کا ناول رابنسن کروسو پڑھا تو مجھے وہ جزیرے کی رات یاد آگئی۔ اس انگریز لڑکے نے جس اذیت اور کرب کے ساتھ ایک اجاڑ بیابان جزیرے پر اپنی جوانی کے ۲۵ برس گذارے، یہ اسی کی ہمت اور عظمت تھی۔ رابنسن کروسو کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔ آپ اسے پڑھ کر خود اندازہ لگا لیں گے۔ کہ اس ناول کا ہیرو تنہائی کے کس شدید کرب میں سے گذرا ہے۔ مصنف نے یہ ایک ایسے شخص کی کہانی سن کر ناول لکھا تھا۔ جو بحراوقیانوس کے ایک اجاڑ جزیرے میں کسی حادثے کے بعد تنہا رہ گیا تھا۔ اور پھر اس نے وہاں اکیلے ہی زندگی کے پچیس برس گذار دیئے۔ پچیس برس کے بعد جب اس نے پہلی بار ایک جہاز کو جزیرے کی طرف آتے دیکھا تو اس کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو رواں ہوگئے اور وہ ریت پر بیٹھ کر بچوں کی طرح سسکیاں بھر بھر کر رونے لگا۔ یہ ایک سچی اور انسانی کردار کی عظمت کی بے مثال کہانی ہے۔ جس کا پورا مکمل ترجمہ پہلی بار پیش کیا جا رہا ہے۔

اے حمید

تاریک رات میں بجلی کے کڑاکے، بادلوں کی گھن گرج اور موسلا دھار بارش! قیامت خیز
ندری طوفان میں ہمارا ایک سو بیس ٹن وزنی جہاز کھلونے کی طرح ہچکولے کھاتا اپنی قسمت
لکھی المناک تباہی کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ تیز ہواؤں میں شور میں کان پڑی آواز سنائی
دیتی تھی۔ ہمارا جہاز برازیل کی طرف جا رہا تھا۔ یہ کافی بڑا جہاز تھا اور اس پر چھ توپیں لگی
ئی تھیں جہاز پر پچیس کے قریب آدمی کام کرتے تھے۔ جہاز کپاس اور گرم مصالحے لے کر برازیل
بندرگاہ کی طرف جا رہا تھا۔ اس پر میرا تجارتی سامان بھی لدا ہوا تھا۔ میں یہاں آپ سے اپنا
ارف کروا دوں۔ میں جزائر برطانیہ کے یارک شائر کے علاقے کا رہنے والا ہوں۔ میرا نام
بنسن کروسو ہے۔ اس وقت میری عمر بیس بائیس سال کی تھی۔ میرے باپ نے مجھے ہمیشہ سمندری
فر سے منع کیا تھا۔ لیکن میرے دل میں سمندر میں سفر کر کے اپنی روزی کمانے کا بے حد شوق
ا۔ چنانچہ پہلی بار جبکہ میری عمر اٹھارہ برس تھی، میں نے کچھ کھلونے، چاقو اور ریشمی کپڑا خریدا
ر لندن کی بندرگاہ سے ایک تجارتی جہاز پر سوار ہو کر گنی کی طرف روانہ ہو گیا۔ مگر میری
قسمتی کہ ہمارے جہاز پر بیچ سمندر میں بحری قزاقوں نے قبضہ کر لیا اور سارے مسافروں کو
لام بنا کر فروخت کر دیا۔

مجھے ایک ترک امیر نے خرید لیا۔ میں دو برس اس ترک امیر کا غلام رہا۔ ایک روز میں
ے اپنے ایک ساتھی غلام سازبازی اور فرار کا منصوبہ بنایا۔ ہم ایک روز اپنے آقا کے لئے سمندر
ں ایک کشتی لے کر مچھلیاں پکڑنے نکلے۔ ہم کشتی کو کھلے سمندر میں لے گئے اور پھر وہاں سے جنوب کی
ف اپنے فرار اور آزادی کا سفر شروع کر دیا۔ راستے میں میرا ساتھی سمندر میں گر گیا۔ میں کوشش کے باوجود

اس کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ سمندر کی ایک اُونچی لہر میری آنکھوں کے سامنے اُسے بہا کر دو
لے گئی۔ اس کے بعد میں اُسے کبھی نہ دیکھ سکا۔ ایک دن اور ایک رات کشتی میں سفر کرنے کے
بعد میں ایک ایسے ساحل پر پہنچا جہاں گھنا جنگل تھا۔ یہاں جنگل میں شیر چیتے بہت پائے جاتے
تھے۔ میں ڈرتے ڈرتے جنگل میں داخل ہوا۔ جنگلی درندوں کی آواز دن کے وقت بھی سنائی
دے رہی تھیں یہاں مجھے ایک حبشی قبیلے کے لوگ مل گئے جنہوں نے میرے ساتھ دوستی اور
شفقت کا سلوک کیا۔ اس حبشی قبیلے کی عورتیں اور مرد مادر زاد برہنہ چلتے پھرتے تھے۔

اس جنگل میں میں نے گیارہ دن گذار دیئے۔ بارھویں روز اتفاق سے ایک تجارتی جہاز کا ادھر
سے گذر ہوا۔ ہم نے آگ جلا کر اس کے دھوئیں سے جہازیوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ ایک
پرتگالی جہاز تھا۔ جہاز ساحل سے کچھ دُور آ کر رک گیا۔ حبشی قبیلے کے لوگوں نے مجھے ایک چھوٹی
سی کشتی پر بٹھا کر جہاز پر سوار کر دیا۔ انہوں نے مجھے پھلوں کے تحفے بھی دیئے جو میں نے جہاز
کے خلاصیوں میں تقسیم کر دیئے۔ جہاز کا کپتان بڑا زندہ دل آدمی تھا۔ میں نے اُس سے کہا کہ
میرے پاس ایک پیسہ بھی کرائے کے لئے نہیں ہے۔ کپتان نے ہاں کر لی۔

"کوئی بات نہیں سنو انگلش۔ میں تمہیں مفت اپنے جہاز پر لے چلوں گا۔"

جہاز نے مجھے برازیل پہنچا دیا۔ یہاں میں نے چھ ماہ تک محنت مزدوری کر کے کچھ پیسے کمائے
اور ان کا کچھ سامان خرید کر واپس لندن لا کر فروخت کر دیا۔ لندن سے کھلونے اور دوسری چیزیں
خرید کر میں اس دفعہ ایک بار پھر برازیل کی طرف جا رہا تھا۔ کہ راستے میں طوفان نے ہمیں گھیر لیا
پورا ایک ہفتہ ہمارا جہاز طوفانی سمندر میں ہچکولے کھاتا رہا۔ تجربہ کار کپتان جہاز کو طوفان سے
نکال لے جانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ مگر تیز ہواؤں کے سامنے اس کی پیش نہیں جارہی
تھی۔ سمندر کی بڑی بڑی لہریں اُٹھ اُٹھ کر جہاز سے ٹکراتی رہی تھی۔ جہاز کبھی ایک طرف
کو جھک جاتا۔ دوسری طرف سے سمندر کی موج پیندے سے ٹکراتی تو دوسری طرف کو جھک
جاتا۔ بارش اور بادلوں کے شور میں کپتان جہاز کے عرشے پر کھڑا ملاحوں کو چیخ چیخ کر اِدھر اُدھر
کام کرنے کو کہہ رہا تھا

لیکن آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ جہاز سمندر میں ابھری ہوئی چٹانوں کی طرف

بڑھ رہا تھا۔ کپتان نے لنگر ڈالنے کی کوشش کی مگر طوفان کے زور سے لنگر ٹوٹ گیا۔ جہاز راستے
سے بھٹک چکا تھا۔ کپتان کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ کہ وہ کس طرف کو جا رہا ہے اور کس سمندر میں
نکل آیا ہے۔ سامنے بڑی بڑی ابھری ہوئی نوکیلی چٹانیں آگئیں۔ کپتان نے جہاز کو بچانے کی ہر ممکن
کوشش کی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ جہاز کو ایک مہیب لہر نے اٹھا کر چٹان پر دے مارا
چٹان کے ساتھ ایک زبردست دھماکے کے ساتھ ٹکرانے کے بعد جہاز کے دو ٹکڑے ہو گئے۔

مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں دو چٹانوں کے درمیان کھولتے، بپھرتے سمندر کی موجوں میں
تیر رہا تھا۔ میں بڑا اچھا تیراک ہوں۔ لیکن سمندر کی شوریدہ سر جھاگ اڑاتیں موجیں مجھے
سانس لینے کی بھی مہلت نہیں دے رہی تھیں۔ پھر بھی چونکہ میں جوان تھا۔ جسم میں گرم خون گردش
کر رہا تھا۔ اسی لئے کسی نہ کسی طرح تیرتا ہوا چٹانوں سے نکل کر باہر آگیا۔ یہاں میں نے
کپتان کی لاش دیکھی۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ اور وہ اوندھے منہ سمندر کی لہروں پر بہتا چلا
جا رہا تھا۔ اسی طرح میرے قریب سے جہاز کے دوسرے چار خلاصیوں کی لاشیں گذریں۔ اب
ایک چھوٹی سی ٹوٹی پھوٹی کشتی میرے قریب آگئی۔ میں بڑی مشکل سے تیرتا سمندر کی موجوں سے
لڑتا ہوا کشتی پر جا پہنچا۔

کشتی میں اپنے آپ کو گرا کر میں نیم بے ہوش سا ہو گیا۔ میں کشتی میں اوندھے منہ لیٹ
گیا میری ایک ٹانگ ابھی تک پانی میں تھی۔ میرے پیٹ سمندر کا کڑوا پانی بھر گیا تھا۔ جو
اب وقفوں وقفوں کے بعد نکل رہا تھا۔ طوفان کا زور اب کم ہو گیا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ طوفان
کا سارا زور صرف جہاز کو ڈبونے اور کپتان کو ہلاک کرنے تک ہی تھا۔ پھر میں کشتی میں سیدھا ہو
کر بیٹھ گیا۔ میں نے ارد گرد دیکھا۔ بارش ہلکی ہو گئی تھی۔ ہوا کی تیزی بھی جاتی رہی تھی۔ جہاز
قریب ہی دو ٹکڑے ہو کر چٹانوں میں پھنسا ہوا تھا۔ میری کشتی کے عقب میں کسی جزیرے کا
ساحل اپنے عجیب و غریب قسم کے اُونچے اُونچے سیاہ درختوں کے ساتھ اُبھر آتا تھا۔

ایک لہر نے میری کشتی کو اُچھال کر ساحل کی ریت پر پھینک دیا۔ کشتی بھی ساحل کی ریت
پر چڑھ آئی تھی۔ میں دیر تک ریت پر لیٹا رہا اور میرے منہ پر ہلکی ہلکی بارش کی بوندیں پڑتی
رہیں۔ پھر میں آہستہ سے اٹھا اور میں نے ریت پر دونوں ہتھیلیاں ٹیک دیں میں نے بڑے

غور سے گردن گھما کر جزیرے کی طرف دیکھا۔ یہ مجھے کچھ عجیب سا جزیرہ لگ رہا تھا۔ کیونکہ عام جزیروں کی طرح اس پر درخت بہت کم تھے۔ یا شائد ساحل کے پاس درخت کم تھے۔ اُونچی چٹانیں تھیں جن پر سبز رنگ کی کائی سی جمی ہوئی تھی۔ سمندر کی لہریں میرے پاؤں تک ہو کر واپس جا رہی تھیں۔

کوئی دو ڈھائی فرلانگ سمندر کے اندر نوکیلی چٹانوں کے بیچ میں ہمارا پرتگالی جہاز دو ٹکڑے ہو کر پڑا تھا۔ جس کشتی نے مجھے ساحل پر لا کر پھینکا تھا۔ اُس کے ایک پہلو کے تختے ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ سب سے پہلے تو میں نے خداوند کریم کا شکر ادا کیا۔ کہ جس نے اس خوفناک طوفان میں سے میری جان بچائی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ جہاز کے سارے کے سارے ملاح مارے جا چکے ہیں۔ کپتان سمیت کچھ ملاحوں کی لاشیں تو میں نے خود دیکھی تھی۔ باقیوں کے بارے میں یہی قیاس اغلب تھا کہ وہ زندہ نہیں بچے۔ نہیں تو وہ ضرور کسی نہ کسی تختے پر بیٹھ کر ساحل تک پہنچ گئے ہوتے۔ میں نے دل ہی دل میں اُن کی مغفرت کے لئے دُعا کی۔ اس کے بعد زندگی بھر میں اُن میں سے کسی کی بھی شکل نہ دیکھ سکا۔ وہ سارے کے سارے سمندری طوفان کی نذر ہو چکے تھے۔ تھوڑی دیر میں نے دیکھا کہ دو تین ملاحوں کی سمندری ٹوپیاں اور جوتے تیرتے ہوئے آ رہے ہیں۔ لہروں نے انہیں اُچھال کر ریت پر لا ڈالا۔ میں نے اُٹھ کر سرخ رنگ کی ایک ٹوپی اٹھائی۔ اُسے نچوڑا اور پھر جھاڑ کر سر پر پہن لی۔ اسی طرح سے ایک جوڑا بوٹ اٹھائے۔ اُن میں سے سمندر کا پانی باہر نکالا اور انہیں بھی پہن لیا۔

میری موٹے کپڑے کی نیلے رنگ کی پتلون گیلی ہو گئی تھی۔ اور قمیص کہنیوں پر سے پھٹ گئی تھی۔ اب بادل چھٹ گئے تھے اور چبھنے والی تیز دھوپ نکل آئی تھی۔ میں نے سب سے پہلی حقیقت کو محسوس کیا، وہ یہ تھی کہ زندگی کے آرام و آسائش بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اور میرے پاس نہ کچھ کھانے کو ہے اور نہ پینے کو میں دن بھر کا پیاسا مرنے کے لئے اس ویران اور بھیانک جزیرے پر تنہا چھوڑ دیا گیا تھا۔ میری جیب میں کسی طرح سے لکڑی کا تمباکو پینے والا پائپ اور تمباکو کا چمڑے کا تھیلا بچا رہ گیا تھا۔ میں نے تھیلا نکالا۔ سارا تمباکو گیلا ہو چکا تھا۔ میں نے اُسے کھول کر دھوپ میں ڈال دیا۔ دھوپ ڈھل رہی تھی۔

ام کی سردی چلنے لگی تھی۔ میرے پاس دیا سلائی نہیں تھی جس کو جلا کر میں تمباکو پی سکتا ا۔

میں خاموش ریت پر بیٹھا سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا ہوگا۔ مجھے بہت سخت پیاس ہوئی تھی۔ میں اٹھ کر کوئی ایک فرلانگ تک سمندر کے کنارے کنارے چلا ہوں گا کہ ایک جگہ میں گڑھا پڑا ہُوا تھا۔ جس میں بارش کا پانی جمع تھا۔ میں نے جھک کر اوک سے یہ میٹھا پانی ر اپنی پیاس بجھائی اور خدا کا شکر ادا کیا۔ اب میری بھوک بھی چمک اٹھی۔ لیکن وہاں کھانے کچھ نہیں تھا۔ درخت ایسے تھے کہ ان پر کوئی پھل لگا ہوا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے سوچا رات کسی درخت پر چڑھ کر گذارنی چاہیئے۔ کیونکہ کوئی خبر نہیں، رات کو جنگل میں سے درندے ل کر ہڑپ کر جائیں۔ میں نے ایک درخت کو رات بسر کرنے کے لئے چن لیا۔ میں بہت تھک تھا اور جزیرے پر رات کے سائے منڈلانے لگے تھے۔ ابھی تک مجھے اس جزیرے کے ے میں کچھ علم نہیں تھا۔ اور نہ میرے اندر اتنی ہمت تھی۔ کہ میں جزیرے کی سیاحت کر تا۔ میں تھکن اور بھوک سے چور تھا۔ میں درخت کے اُوپر چڑھ کر سو گیا۔

میری آنکھ اس وقت کھلی جب دن نکل آیا تھا۔ چاروں طرف دھوپ چمک رہی تھی اور توں پر پرندے شور مچا رہے تھے۔ میں درخت پر سے نیچے اتر آیا۔ میں نے دیکھا کہ سمندر ن ہو چکا تھا اور دھوپ میں ہمارے تباہ شدہ جہاز کا ڈھانچہ دور سمندری چٹانوں میں نسا چکا تھا۔ اپنے ساتھیوں کی موت کا خیال کر کے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تقدیر میں لکھا تھا۔ میں نے جہاز پر واپس جانے کا دل میں پکا ارادہ کر لیا۔ کیونکہ اس طرح سے میں جہاز ے کچھ کھانے پینے کی ضروری چیزیں حاصل کر سکتا تھا۔ میں اپنی ٹوٹی پھوٹی کشتی کے پاس آیا ن کے کنارے ٹوٹ گئے تھے۔ مگر اس کا پیندا ابھی تک سلامت تھا۔ چپو خدا جانے طوفان کہاں گر گئے تھے۔ میں کشتی کو کھینچ کر سمندر میں لے گیا اور پھر اس پر سوار ہو گیا۔ سمندر کی ایک اسے اپنے ساتھ لے کر واپس لے گئی۔ میں نے ہاتھوں کی مدد سے کشتی کو چٹانوں کی طرف نا شروع کر دیا۔

بڑی مشکل سے میری کشتی چٹانوں میں اس جگہ پہنچ گئی۔ جہاں جہاز کا آدھا ڈھانچہ پھنسا

ہوا تھا۔ باقی آدھا حصہ سمندر میں ڈوب چکا تھا۔ یہ جہاز کا پچھلا آدھا حصہ تھا۔ مجھے معلو
تھا کہ اس حصے میں سوائے کپاس کی گانٹھوں اور باورچی خانے کے اور کچھ نہیں تھا۔ ظاہر
ہے۔ باورچی خانے کا سارا سامان برباد ہو گیا ہو گا۔ پھر بھی دل میں اُمید لیے میں کشتی پر سے
اُترا کشتی کو کھینچ کر ایک چٹان کے کنارے سے باندھا اور رسے کی مدد سے جہاز کے اوپر آگیا
جہاز تباہی کا بھیانک نقشہ پیش کر رہا تھا۔ آدھا حصہ یوں ٹوٹ کر الگ ہو چکا تھا جیسے کسی
نے کیک کو چاقو سے کاٹ دیا ہو۔ یہ حصہ جو باقی بچا تھا آگے کو جھک گیا تھا اور چٹانوں کی وجہ
سے وہاں اٹکا رہ گیا تھا۔

میں جہاز کے باورچی خانے کے پاس آیا۔ اس کا دروازہ ٹوٹ چکا تھا۔ اور دور گرا
تھا۔ اندر باورچی خانے کی دیوار میں ایک چٹان کی نوک نے گھس کر بہت بڑا شگاف پیدا کر
دیا تھا۔ جس میں سے باورچی خانے کا سارا سامان لڑھک کر سمندر کی تہہ میں غرق ہو چکا تھا
میں دیوار کو پکڑ پکڑ کر اس جگہ گیا۔ جہاں پکانے کے تیل کے کنستر پڑے رہتے تھے۔ ان میں
سے کوئی بھی کنستر وہاں نہ تھا۔ فرش پر ایک طرف کلہاڑی پڑی تھی۔ وہ میں نے اٹھالی۔ کچن
کی ایک الماری ابھی تک بند تھی۔ میں نے کلہاڑی سے الماری توڑ ڈالا۔ اس الماری میں ایک
لکڑی کا بڑا سا ڈبہ سالم کا سالم مل گیا۔ اس میں بکری کے گوشت کے کچھ خشک ٹکڑے تھے۔ کچھ
چاول تھے کچھ پیاز تھا۔ ایک تھیلا تھا جس میں ترکھانوں کے سارے اوزار موجود تھے، ایک
تھیلی میں بارود چھرے بھرے ہوئے تھے۔ ایک بندوق بھی وہاں سے مل گئی۔ ایک پستول بھی
وہیں سے دستیاب ہوا۔

میں نے سارا سامان ایک بوری میں ڈال کر کندھے پر اٹھا کر کشتی میں رکھا اور کشتی کو لے کر
واپس جزیرے میں آگیا۔ جزیرے پر آتے ہی میں نے سامان کی بوری اسی درخت کے ساتھ لگا
دی جس کے اوپر چڑھ کر میں نے رات بسر کی تھی۔ میں نے بوری کھول کر تھوڑا سا پیاز اور
بکری کا خشک گوشت نکال کر کھایا۔ دیا سلائی سے آگ جلا کر کپڑے خشک کئے۔ پائپ میں
تمباکو بھر کر سلگایا۔ پستول میں بارود بھرا اور اس خیال سے جزیرے کا چکر لگانے چل کھڑا ہوا
کہ ذرا دیکھوں تو یہ کس قسم کا جزیرہ ہے اور اس پر کہیں آدم خور وحشی قبیلے تو آباد نہیں ہیں۔

ونکہ لندن میں، میں نے سن رکھا تھا کہ ساحل برازیل کے آس پاس پرتگالی سمندروں میں
ے جزیرے بھی ہیں جن میں آدم خور وحشی رہتے ہیں۔
میں یہ بھی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ سمندر کے جس ساحل پر میں اترا ہوں، وہ کسی جزیرے
ساحل ہے۔ یا کسی براعظم کا ساحل ہے۔ کیونکہ ہو سکتا تھا کہ میں نے کولمبس کی طرح کسی نئے
عظم کو دریافت کر لیا ہو۔ میں ایک قریب پہاڑی ٹیلے پر چڑھ گیا اور میں نے ارد گرد نگاہ
ڑائی۔ یہ بھی میری بدقسمتی تھی کہ میں ایک چھوٹے سے جزیرے میں آگیا تھا۔ جس کو چاروں
ف سے سمندر نے گھیر رکھا تھا۔ حدِ نظر سوائے سمندری لہروں کے اور کچھ نہ تھا۔ میں پہاڑی
سے نیچے اُتر آیا، اور درخت کے سائے میں بیٹھ گیا۔ شام کے سائے گہرے ہونا شروع ہو گئے
نے کلہاڑی سے درختوں کی ٹہنیاں کاٹیں۔ انہیں اس خیال سے اپنے ارد گرد گاڑ کر ایک پنجرہ
ا بنا لیا کہ رات کو کوئی جنگلی جانور حملہ نہ کر دے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔
ونکہ اس ویران جزیرے میں سوائے میرے اور کوئی انسان یا حیوان نہیں تھا۔
دوسرے روز میں پھر کشتی میں بیٹھ کر جہاز کے ٹوٹے ہوئے حصے پر گیا۔ تاکہ جو کچھ وہاں
، لا سکتا ہوں، بچا کر لے آؤں۔ خدا خانے اب اس جزیرے پر کتنی دیر زندہ رہنا پڑے کیونکہ
جزیرہ عام سمندر کے تجارتی راستوں سے ہٹ کر تھا۔ ویسے بھی ادھر جگہ جگہ سمندر کے اندر
ر باہر نوکیلی چٹانیں ابھری ہوئی تھیں۔ جس کی وجہ سے کوئی جہاز ادھر ہمت نہیں کر
تا تھا اس علاقے میں تو کوئی طوفان کی وجہ سے بھولا بھٹکا جہاز تباہ ہونے کے لئے ہی آ
تا تھا۔ دوسرے پھیرے میں، میں نے جہاز کے ڈھانچے سے جو کچھ حاصل کیا، وہ یہ تھا۔
ملاحوں کے آٹھ جوڑے قمیص پتلون ..... چھتیس پونڈ سونے کے۔
گندم کی ایک تھیلی ..... رسی کا ایک بنڈل ..... دیا سلائی کا بڑا بکس ..... چقماق
پتھر ..... دُوربین۔
پانی پینے کا مگ اور کیتلی اور تھالیاں۔
میں نے یہ ساری چیزیں لا کر درخت کے نیچے لکڑی کے پنجرے میں رکھ دیں اور اوپر ترپال
ل دی۔ یہ رات بھی میں نے درخت کے نیچے ہی بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ پچھلی رات کسی

درندے کی آواز نہ آئی تھی۔ ایسے لگتا تھا۔ جیسے جزیرے میں کوئی بلی تک نہیں ہے۔ صرف درختوں پر کہیں سے کچھ پرندے آ کر رات کو بسیرا کرتے تھے اور صبح کو اڑ جاتے تھے۔ شام کو سمندر کی طرف سے تیز ہوا چلنے لگی جو ساری رات چلتی رہی۔ صبح اٹھ کر جو میں نے دیکھا تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ جہاز کی آخری نشانی اس کا چٹانوں میں پھنسا ہوا آدھا ڈھانچہ بھی غائب ہو چکا تھا۔ اسے ہوا نے اچھال کر سمندر میں پھینک دیا تھا۔ اور لہروں نے اسے گہرے پانیوں میں غرق کر دیا تھا۔ اس وقت مجھے شدید تنہائی کا احساس ہوا۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ میں جزیرے پر تنہا رہ گیا ہوں۔ ایک بات کی مجھے بڑی تسلی ہوئی کہ میں نے جہاز کے غرق ہونے سے پہلے پہلے اس میں سے ضروری چیزیں نکال لی تھیں۔

اب میں نے کسی ایسی جگہ کی تلاش شروع کر دی جہاں میں اپنے رہنے کے لئے چھوٹی سی محفوظ جگہ بناؤں۔ یہ جگہ مجھے پہاڑی کے دامن میں مل گئی جہاں چٹان کے اندر ایک گڑھا سا بنا ہوا تھا میں نے جہاز میں سے لائے ہوئے لکڑی کے تختوں کو جوڑ کر اس چٹان کے ساتھ نصف دائرے کی شکل میں ایک دیوار کھڑی کر دی۔ رسی سے ڈنڈے جوڑ کر میں نے ایک سیڑھی بنالی، دیوار کوئی ڈیڑھ گز اونچی تھی۔ سیڑھی کو میں نے ایک لکڑی کے گھر کے اندر آ کر اوپر کھینچ لیتا۔ یوں اس چھوٹے سے قلعے میں محفوظ ہو جاتا۔ جنگلی جانوروں کا خیال میرے دماغ سے نکل گیا تھا اگر کوئی خطرہ تھا تو آدم خور وحشی لوگوں کی طرف سے تھا جن کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ لوگ شاید اس جزیرے پر آباد ہوں۔

چوتھے روز میں جزیرے کے جنگل میں سے گذر رہا تھا کہ میں نے ایک جنگلی بکری کو دیکھا جو چھوٹی تھی اور بہت تیز بھاگتی تھی۔ میں اس کے پیچھے بھاگا۔ مگر وہ میرے ہاتھ نہ لگی۔ میں نے بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ کافی دور جنگل میں جا کر میں نے دو تین بکریوں کو دیکھا۔ اب میں نے بندوق چلا دی۔ ایک بکری زخمی ہو کر گر پڑی۔ میں اسے اٹھا کر اپنے کیبن میں لے آیا۔ اسے کاٹ کر اس کے گوشت کے پارچے بنائے اور انہیں دھوپ میں سکھانے کے لئے رکھ دیا اس کی کھال بھی سکھانے کے لئے لکڑی کی دیوار پر ڈال دی۔ ایک ہفتے میں، میں نے تین جنگلی بکریوں کا شکار کیا۔ ان کا گوشت ذرا ذرا نمکین تھا۔ میرے پاس نمک بھی تھا اور ایک چمڑے کی مشک

میٹھے پانی سے بھی بھری ہوئی جہاز پر سے ملی تھی۔

ایک ہفتے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ آج دن کون سا ہے؟ اور تاریخ کیا ہے۔ اس طرح سے تو میں اتوار کا دن بھی بھول جایا کروں گا۔ جس روز کم از کم مجھے خدا کی عبادت ضرور کرنی چاہیئے۔ میں نے اس کا ایک حل تلاش کر لیا۔ میں نے ایک تختے کو کاٹ کر اس کی ایک لمبی صلیب بنائی اور صلیب کو کیبن کے سامنے سمندر کے کنارے ریت میں اندر تک گاڑ دیا۔ اس صلیب پر میں نے چاقو سے یہ کھود دیا۔"

"میں اس ساحل پر ۳۰ ستمبر ۱۶۵۹ء کو اترا...... رابنسن کروسو۔"

صلیب کے لمبے ڈنڈے پر میں نے چاقو سے سات لکیریں کھرچ دیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے اس جزیرے پر آئے ہوئے سات دن ہو گئے ہیں۔ بس اب یہ میرا کیلنڈر تیار ہو گیا تھا۔ اب میں دن اور تاریخ یاد رکھ سکتا تھا۔ میں نے اپنے چھوٹے سے نصف دائرے میں بنے ہوئے کیبن کو جنگلی درندوں اور وحشی آدم خوروں سے کافی حد تک محفوظ کر لیا تھا۔ اب میرا خیال دوسرے آرام کی چھوٹی چھوٹی ضروری چیزوں کی طرف آیا۔ میں نے ایک درخت کو آری سے کاٹ کر زمین پر گرا دیا اور کلہاڑی سے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ پھر اس کے تختے بنائے اور اپنے لئے ایک میز، ایک بھاری قسم کی کرسی اور ایک تخت تیار کیا یہ تخت چھوٹا تھا۔ میں نے ان چیزوں کو اپنے لکڑی کی اونچی دیوار والے کیبن کے اندر لا کر رکھ دیا۔ میں نے ایک ڈائری پر جو کہ مجھے جہاز پر سے ملی تھی، روز کے واقعات لکھنے شروع کر دیئے یہ ایک یادداشت تھی۔ میں اتنی دیر تک اسے لکھتا رہا جب تک کہ سیاہی نہ ختم ہو گئی۔ کبھی کبھی میں پہاڑی کی چوٹی پر جا کر کھڑا ہو جاتا اور لٹکی ہوئی تباہ شدہ جہاز کے کپتان کی دوربین آنکھوں پر لگا کر سمندر کی طرف دیکھتا۔

مجھے یوں لگتا جیسے میں نے دور کسی جہاز کے بادبان کو دیکھ لیا ہے۔ میں خوشی سے ناچنے لگتا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا کہ میں اپنے آپ کو دھوکا دے رہا تھا۔ پھر میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے اور میں اپنے کیبن میں بچھے ہوئے تخت پوش پر آ کر گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ جاتا۔ ایک روز میں سمندر کے کنارے گھوم رہا تھا۔ کہ میں نے ایک جگہ پتھروں

میں پھنسے ہوئے کچھوے کو دیکھا۔ وہ باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر پتھروں کی نوکیں اسے روکے ہوئے تھیں۔ میں نے کچھوے کو پکڑ لیا۔ اس روز میں نے کچھوا پکا کر کھایا۔ اس کا گوشت کھٹا تھا۔ لیکن میں نے تین روز سے سوائے بکری کے سوکھے گوشت کے ایک دو ٹکڑوں کے اور کچھ نہیں کھایا تھا۔ جنگلی بکریاں میری بندوق کی آواز سن کر شاید وہاں سے جا چکی تھی۔ ہفتے بھر کی دربدری کے بعد بھی میں کسی بکری کا شکار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

جہاز پر سے گندم کی جو تھیلی میں بچا کر لے آیا تھا۔ اس کے دانے میں نے اپنے کیبن سے باہر زمین پر بکھیر دیئے تھے اب بارشوں کا موسم شروع ہو گیا تھا اور سردی بھی پڑنے لگی تھی ایک رات بارش شروع ہو گئی مجھے بڑا تیز بخار ہو گیا۔ میں اپنے چھوٹے سے کیبن میں چھ روز تک بخار میں پڑا ہونکتا رہا۔ مشک میں سے تھوڑا سا پانی پی کر تخت پوش پر لیٹ رہتا۔ مجھے رات کو بھیانک خواب آتے۔ میں ڈر کر اُٹھ بیٹھتا اور کیبن سے باہر ہونے والی شدید جزیرائی بارش کا شور سنتا رہتا۔

ساتویں روز بخار کا زور ٹوٹ گیا۔ دوپہر کے وقت بارش رک گئی۔ میں رسی کی سیڑھی لگا کر اپنے کیبن کی دیوار سے نیچے اتر آیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جو گندم کے دانے میں نے زمین پر بکھیرے تھے وہ پھوٹ پڑے تھے اور ان میں سے خوشے نکل کر لہرا رہے تھے۔ مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میں اپنا بخار بھول گیا اور مسرت سے ناچنے لگا۔ میں نے سوچا کہ اسی طرح ضروری تھا کہ کھیت کو وافر مقدار میں پانی ملتا رہے۔ میں نے جزیرے کا ایک بار پھر تفصیلی جائزے کا فیصلہ کیا اور چکر لگانے شروع کر دیئے۔ ایک جگہ مجھے ایک چشمہ مل گیا۔ اس کا پانی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ یہاں جنگلی انگور کی بیلیں بھی تھیں اور جنگلی تمباکو کی جھاڑیاں بھی اُگی ہوئی تھیں۔ میں اس چشمے پر سے پانی کی مشک بھر کر لے آیا۔ انگور کے گچھے توڑ کر میں نے اپنے کیبن کے اوپر والے درخت کی ٹہنیوں پر سکھانے کو ڈال دیئے تاکہ ان کا منقہ بنا کر رکھا جائے۔

میں نے چھوٹی سی جگہ پر گندم بو دی جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھنے لگی۔ مجھے اس گمنام جزیرے پر آئے دس مہینے ہو گئے تھے۔ دس مہینے کی مدت مجھے اس صلیبی کیلنڈر نے بتائی

ن پر میں ہر روز چاقو سے ایک لکیر کھرچ دیتا تھا۔ انہی دنوں ایک کتا کہیں سے میرے کیبن کے باہر آ کر بیٹھ گیا۔ پہلے تو مجھ سے خوف کھاتا تھا۔ پھر میں نے اسے بکری کا خشک ت ڈالا تو وہ میرے قریب آ گیا۔ میں نے اسے پیار کیا تو وہ میرے پاؤں میں لوٹنے لگا۔ دس ن کے بعد پیار اور شفقت کا یہ ایک پہلا تجربہ تھا۔ وہ کتا میرے پاس ہی رہنے لگا۔ میں جنگل میں سے کچھ طوطے پکڑ کر پنجرے میں بند کر رکھے تھے۔ کچھ طوطے مر گئے۔ باقیوں کو میں نے ر دیا۔ صرف ایک سرخ رنگ کا بڑا سا طوطا میرے پاس رہا۔

جب میں بندوق ہاتھ میں لے کر ملاحوں کی سرخ ٹوپی سر پر رکھے جنگل میں پانی لینے یا ی کے شکار کو جاتا تو یہ طوطا میرے کندھے پر بیٹھا ہوتا تھا۔ میں نے کئی مہینوں سے بندوق چلائی تھی۔ اس کی وجہ سے جنگل میں بکریاں پھر واپس آ گئی تھیں۔ میں نے دو بکریوں پکڑ لیا۔ اور انہیں کیبن کے اندر لا کر باندھ دیا۔ ایک عرصے کے بعد بکری کا دودھ پیا مجھے اپنے جسم میں ایک نئی طاقت پیدا ہوتی محسوس ہوئی۔ میرا گذارہ چشمے کے پانی اور ری کے دودھ اور گوشت پر تھا۔ گندم کو پتھروں پر پیس کر میں اس کا آٹا گوندھ کر اسے م پتھر پر لگا کر موٹی سی روٹی بنا لیا کرتا۔ یوں میری صحت بحال ہوتی گئی۔ میرے پاس صرف بھی تھیلی بارود رہ گیا تھا۔ جس کو میں نے بڑا سنبھال کر اس وقت کے لئے رکھ لیا تھا ب آدم خور وحشی مجھ پر حملہ کر دیں گے۔

آدم خور وحشیوں کا خیال نہ جانے کیوں میرے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ یہاں تک کہ ل گیارہ مہینے گذر گئے تھے اور کسی بھی آدم خور نے میرے کیبن کا رخ نہ کیا تھا۔ اگر وہ اس یرے پر ہوتے تو ضرور میرے کیبن پر حملہ کرتے۔ پھر بھی مجھے وہم ہو گیا تھا کہ وہ اس یرے پر چھپے ہوئے ہیں اور موقع کی تلاش میں ہیں۔ میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس تھی کہ میری نفسیات میں کچھ تبدیلیاں رونما ہونے لگی ہیں۔ مثلاً میں کسی خیال کو ذہن میں تا تو وہ دیر تک میرے دماغ میں رہتا۔ میں اس خیال میں ڈوب جاتا۔ پھر وہ خیال جیسے ے اپنی جگہ پر پتھر سا بنا دیتا۔ دوسری تبدیلی یہ آئی تھی کہ میری طبیعت وہمی ہو گئی تھی ں وہم کرنے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آدم خوروں کے بارے میں میں اپنے ذہن کو صاف

نہ کر سکا تھا۔

میں ہر روز صبح اٹھ کر اپنے خدا کو یاد کرتا اور بائبل کے یہ الفاظ دہراتا۔ "اے خ
میں تیرا شکر گذار ہوں کہ تو نے مجھے ہر طرح کی نعمت دی، ہر روز دعا کے بعد مجھے محسو
ہوتا کہ سچ مچ مجھے دنیا کی ہر ایک نعمت میسر ہے اور جتنا خوش میں اس گمنام تنہا جزیر
پر ہوں شاید دنیا کے کسی بھی خطے میں اتنا نہ خوش رہ سکتا۔ اس کے باوجود شدید تنہا
کا احساس سایہ بن کر میرے ساتھ ساتھ لگا رہتا تھا۔ میں جب تنہائی سے گھبرا جاتا تو وہ ا
کتے اور طوطے سے باتیں شروع کر دیتا۔ وہ میری باتوں کا جواب تو نہ دے سکتے تھے۔ لیک
مجھے گمان ہونے لگا کہ میں اُن کی زبان سمجھنے لگا ہوں۔ مثلاً طوطا جب دو بار ٹیں ٹیں کرتا
اس کا مطلب تھا کہ وہ بھوکا ہے۔ تین بار ٹیں ٹیں کر کے پروں کو پھڑپھڑاتا تو اس کا مطلب
کہ وہ جنگل کی سیر کو جانا چاہتا ہے۔ چنانچہ میں اس کے پاؤں کی رسی کھول کر اسے اپنے کند
پر سے اڑا دیتا۔

گھنٹہ دو گھنٹے وہ جنگل میں گھوم پھر کر اپنا پیٹ بھر کر واپس کیبن میں آکر میرے کند
پر بیٹھ جاتا۔ رات کو وہ میرے کیبن کے درخت پر سوتا تھا۔ ایک رات مجھے کیبن کے باہر ایک
آواز سی سنائی دی۔ جیسے کوئی پتوں پر چل رہا ہے۔ میں چوکنا ہو گیا۔ جلدی سے رسی کی سیڑھ
پر چل کر لکڑی کی دیوار سے دوسری طرف جھانک کر دیکھا۔ جنگل میں چاندنی پھیلی ہوئی تھی
درختوں پہ گہری خاموشی طاری تھی۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ پھر ایک بلی بھاگ کر گذر گئ
میں سیڑھی پر سے اتر کر اپنے تخت پوش پر آکر بکری کی کھال کا کمبل اوڑھ کر اکڑوں بیٹھ گیا۔
اب ایک بار پھر آدم خور وحشیوں کے خیال نے میرے دماغ میں چکر لگانے شروع کر دیئے۔

میں نے سوچا کہ مجھے ایک کشتی بنانی چاہیئے۔ کیونکہ پرانی کشتی جگہ جگہ سے اس قدر ٹوٹ
پھوٹ گئی تھی کہ اس کی دوبارہ مرمت ناممکن ہو گئی تھی۔ میں نے کلہاڑی سے ایک درخت
کو کاٹ کر زمین پر گرا دیا اور کلہاڑے اور چھینی کی مدد سے اس کو ایک طرف سے کھوکھلا کرنا
شروع کر دیا۔ میں اس درخت کو کھوکھلا کر کے اس کی کشتی بنانا چاہتا تھا۔ جس طرح کہ وحشی
لوگوں کی کشتیاں ہوتی ہیں۔ کوئی ایک مہینے کی عرق ریز محنت کے بعد میں نے درخت کے

ب طرف سے پورے کا پورا کھوکھلا کر دیا۔ کشتی بن کر تیار ہو گئی تھی۔ اب مجھ پر اس
ناک حقیقت کا انکشاف ہوا کہ وہ کشتی اتنی بھاری تھی کہ میں اسے اپنی جگہ سے ایک
یں ہلا سکتا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میری ساری جاں سوز محنت ضائع ہو گئی
ل میں مجھے یہ پہلے سوچ لینا چاہیئے تھا کہ جس درخت کو میں کشتی بنانے کے لئے کھوکھلا کر
کیا میں اسے گھسیٹ کر سمندر کے اندر بھی لے جا سکوں گا کہ نہیں؟

ں نے ہمت نہ ہاری اور ایک چھوٹے درخت کا تنا کاٹ کر اسے ریت پر گرا دیا۔ اور
وڑی اور چھینی سے کھوکھلا کرنا شروع کر دیا۔ ایک مہینے کی محنت کے بعد کھوکھلی کشتی
ار ہو گئی۔ میں اسے دھکیلتا ہوا سمندر میں لے گیا۔ اس کشتی پر سوار ہو کر میں نے جزیرے
رد ایک چکر لگایا۔ جزیرے کا جنوبی کنارا بھی ایسا ہی تھا۔ جیسا کہ شمال اور مشرقی کنارا
ی ہری بھوری کائی لگی چٹانیں تھیں اور ساحل کے ساتھ ساتھ گھنے درخت اُگے
ھے۔ میں کنارے کے ساتھ ساتھ ہی کشتی کھیتا رہا۔ بڑی سمندری لہروں کے خطرے کی
میں سمندر میں آگے نہ گیا۔

ھے اس ویران اور بے آباد جزیرے پر رہتے ہوئے چار سال کا عرصہ گذر گیا تھا۔ یہ طویل دن
راتیں تھیں۔ یہ عرصہ گویا ایک عمر قید عرصہ تھا۔ جب میں نے کسی انسان سے بات نہ کی تھی
سان کی شکل نہ دیکھی تھی۔ اس ڈر سے کہ میں اپنی زبان نہ بھول جاؤں۔ میں اپنے کتے اور طوطے
یزی میں باتیں کیا کرتا تھا۔ لیکن کچھ عرصہ گذر جانے پر جانوروں کی زبان کا زیادہ اثر ہونا
ع ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں، میں اپنی زبان بھولنے لگا اور زیادہ تر یا تو خاموش رہتا اور
اروں اور مختلف آوازوں سے جانوروں کے ساتھ بات کرتا۔ یہ چار سال کی لمبی مدت میں
ہذب دنیا سے ہزاروں میل دور ایک بے آباد ویران جزیرے پر ایک طوطے اور ایک
کے ساتھ گذار دی تھی۔ مجھے لندن میں رہتے ہوئے اپنے بچپن کے ساتھیوں کی صورتیں بہت
آتیں۔ مجھے کبھی کبھی ایسے لگتا جیسے میرا باپ میرے سامنے آکر درختوں کے نیچے کھڑا ہے۔
رمجھے اشارے سے بلا رہا ہے۔ میں لپک کر ڈیڈی کہہ کر اس کی طرف بڑھتا اور وہ غائب
باتا گیا مجھے اپنے باپ کی نصیحت پر عمل کر کے سمندری سفر نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن نہیں

ایسا نہیں تھا۔ اگر میں یہ سفر نہ کرتا تو مجھے اپنی زندگی کے سب سے زیادہ قیمتی اور بھیانک تجربے
دوچار نہ ہونا پڑتا اور ابھی کوئی پتا نہیں تھا۔ کہ کیسے کیسے تجربات میری زندگی کی سطح سے اُبھ
والے تھے!

میں نے اب جزیرے میں باقاعدہ رہنا شروع کر دیا تھا۔ میرے کھیت میں گندم کی فص
تھی۔ میں اس کا آٹا پیس کر رکھ دیتا اور اس کی روٹی پکا کر بکری کے گوشت سے کھاتا۔ دیاسلا
کی ختم ہو گئی تھی۔ میں چقماق کے پتھر سے آگ جلاتا تھا۔ بکری کی کھال کی میں نے ایک جیکٹ
تھیلا سی پتلون بنا کر پہن لی تھی۔ اب میں سمندر سے مچھلیاں بھی پکڑ لیتا تھا۔ تمباکو مجھے جزیرے
جنگلی کھیتوں سے مل جاتا تھا۔ اس طرح میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ یہ ایک آزاد قیدی کی زندگ
ایک ایسے انسان کی زندگی تھی۔ جسے قسمت اور ایک سمندری طوفان نے انسانوں کی دنی
ہزاروں میل دور ایک گمنام اکیلے اور بے آباد جزیرے میں لا کر پھینک دیا تھا۔ میری عمر اب
چوبیس برس کی ہو گئی تھی۔ میرا صلیبی کیلنڈر مجھے بتا رہا تھا کہ مجھے چار سال جزیرے پر آئے ہو
گئے تھے۔ کیلنڈر کی لکڑی پر اب مزید دنوں کی لکیریں ڈالنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ چنا
نے اس کے ساتھ ہی ایک اور لکڑی کا کھم گاڑ دیا تھا۔

میری پہلی بحری سرخ ٹوپی پھٹ گئی تھی۔ جوتے بھی ختم ہو چکے تھے۔ میں نے بکری کی کھال
اور ٹوپی بنالی تھی۔ میرے ڈاڑھی اور سر کے بال بے تحاشا بڑھ گئے تھے۔ ناخن میں ایک جہاز
سے تراش لیا کرتا۔ کبھی کبھی اس چھری سے ڈاڑھی اور سر کے بال بھی کاٹ کر پھینک دیا کر
پھر میں تنگ آگیا اور میں نے بالوں کو بڑھنے دیا۔ بکری کی کھال ہی کی میں نے ایک چھتری
لی۔ جب میں کیبن سے باہر بارش یا دھوپ میں جاتا تو چھتری تان لیتا۔ میرا حلیہ یہ ہوتا۔ ک
پر لال طوطا بیٹھا ہے۔ بغل میں توڑے والی بندوق دبا رکھی ہے۔ گلے میں دوربین لٹک رہ
سر پر بکری کی کھال کی ٹوپی ہے۔ ڈاڑھی اور سر کے بال جھول رہے ہیں۔ اگر میں اپنے آپ
سامنے کھڑے ہو کر دیکھتا تو مجھے یقیناً ایسے لگتا جیسے کوئی زمانہ قبل از تاریخ کا آدمی بندوق ب
میں دبائے چھتری کھولے غار سے نکل کر باہر آگیا ہے۔ اب میں نے اپنے آپ کو قسمت کے
کر دیا تھا۔ میں اپنی تقدیر میں لکھے ہر حادثے کے لئے تیار تھا۔ میں روزانہ صبح شام پہاڑی

کر دوربین سے سمندر کو دور تک ایک نظر ضرور دیکھا کرتا۔ اس خیال سے کہ شاید
ے بادبان نظر آجائیں اور میں آگ جلا کر دھوئیں سے اسے اپنی طرف متوجہ کر
چار سالوں سے میں ناامید چلا آرہا تھا۔ ادھر سے کبھی کوئی جہاز نہ گذرا تھا۔
نے لکڑی کی ایک میز بنالی تھی۔ جس پر بیٹھ کر میں کھانا کھاتا۔ میں خود ہی کھانا تیار
ہی میز پر لگاتا پھر خود ہی ایک جلاوطن بادشاہ کی طرح بیٹھ کر کھاتا۔ میرے دائیں
لا تا اور دو بلیاں بھی کرسی پر بیٹھی ہوتیں جنہیں میں اپنے ساتھ کھانے میں سے پورا پورا حصہ
تا اب بہت بوڑھا ہو گیا تھا۔ کسی وقت وہ جھنجھلا جاتا اور زور زور سے بھونکتا
دائرے میں دوڑنا شروع کر دیتا۔ جیسے اپنی دم کا پیچھا کر رہا ہو۔ طوطے کی گردن
ی بال جھڑ گئے تھے۔ مگر یہ کسی ایسی نسل کا طوطا تھا کہ پرانے بالوں کے جھڑتے ہی نئے
اتے تھے۔ پھر بھی بڑھاپے نے اس پر اثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ میری جلد کا رنگ گہرا
ہو کر سیاہ ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس حالت میں اگر لندن میں میرا باپ مجھے دیکھ لیتا
پہچان سکتا کہ میں اس کا بیٹا ہوں مجھے انگریزی زبان کے، اپنی زبان کے کئی لفظ بھول
بھی کوئی لفظ یاد آتا تو اس کا مفہوم بھول جاتا۔ مفہوم یاد آتا تو لفظ کی شکل ذہن
جاتی۔

سی طرح شدید تنہائی میں انسانوں سے دور اس غیر آباد ظالم جزیرے پر رہتے ہوئے مجھے
سال گزر گئے۔ میری عمر چونتیس برس کی ہو گئی۔ میرے سر اور داڑھی کے بالوں میں سفید
لگے تھے۔ میں نے چشمے کے پانی میں ایک روز اپنا عکس دیکھا تو میری آنکھوں میں آنسو
مجھے اپنی مرحوم ماں اور باپ یاد آگیا۔ میں دیر تک بچوں کی طرح زار و قطار روتا رہا۔
لی بندھ گئی۔ یوں لگا۔ جیسے دس سال کے آنسو ایک گھنٹے میں میری آنکھوں سے بہہ
ہیں۔ دس سال زندگی کا ایک لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ میری جوانی کا سورج اسی بدقسمت
رے میں غروب ہونے لگا تھا۔ مجھے خیال آتا کہ میری جدائی میں میرے باپ کی کیا حالت
ا؟ وہ تو یہی سمجھ رہا ہوگا۔ کہ جہاز طوفان میں غرق ہو گیا اور میں بھی دوسرے ملاحوں
اتھ ڈوب گیا۔ اسے کیا خبر تھی کہ اس کا بدنصیب بیٹا لندن سے دور..... بہت دور...

......ایک ویران بے آباد جزیرے پر زندگی کے بدترین، تاریک ترین بہت روز گذار رہا ہے
مجھے جزیرے پر آئے پندرہ برس ہو گئے تھے کہ ایک روز عجیب اتفاق ہوا۔ میں صبح
وقت اپنے کیبن میں سے نکل کر کشتی کی طرف جا رہا تھا۔ بندوق میری بغل میں تھی۔ طوطا میر
کندھے پر تھا۔ کھلی چھتری میرے سر پر تھی۔ دوربین میرے گلے میں لٹک رہی تھی۔ میری داڑ
اور سر کے لمبے اور سیاہ سفید بال جزیرے میں سمندر کی طرف سے آنے والی ہوا میں لہرا ر
تھے کہ اچانک میں بھونچکا ہو کر رہ گیا۔ میں ریت پر کسی انسان کے ننگے پاؤں کے نشان دیکھ
رہا تھا۔

سب سے پہلے مجھے ایک آدمی کے پاؤں کے نشان نظر آئے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا
وہاں تین چار آدمیوں کے پیروں کے نشان تھے۔ سالہا سال کے بعد میں اجاڑ جزیرے پر پہلی
کسی انسان کے پاؤں کے نشان دیکھ رہا تھا۔ میں انہیں دیکھتا ہی رہ گیا۔ مجھے خوشی بھی ہو ر
تھی اور حیرانی بھی۔ سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ یہ نشان تازہ تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے
لوگ ابھی ابھی وہاں سے گذرے ہیں۔ میں نشانوں کے ساتھ ساتھ آگے چل پڑا۔ کوئی ایک فرلا
چلنے کے بعد یہ نشان ایک چھوٹے سے ٹیلے پر چڑھ کر دوسری طرف نیچے اتر گئے۔ میں ٹیلے
اوپر جھاڑیوں کے عقب میں کھڑا ہو گیا۔ مجھے دور ساحل سمندر کے پاس ریت پر کچھ لوگ نظ
آئے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟ ایک کشتی بھی دکھائی دی
سمندر کے کنارے ریت پر کھڑی تھی۔

میں نے دوربین لگا کر دیکھا تو میری حیرانی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ دور سمندر کے کنار
ریت پر چھ سات نیم عریاں وحشی آدم خوروں نے ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکے کو پکڑ رکھا تھا
اور اس کے ہاتھ پاؤں باندھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پاس ہی دو وحشی آگ جلا رہے تھے
میرا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ لوگ اس لڑکے کو کھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک
وحشی قریب ہی چھرا لئے کھڑا تھا جیسے وہ بدقسمت لڑکے کے ٹکڑے کرنے کے لئے اشارے
کا منتظر ہو۔ میں یہ سارا خوفناک کھیل ٹیلے پر جھاڑیوں کے پیچھے کھڑا دیکھتا رہا۔ اتنی مدت بعد
انسانوں کی شکل دیکھ کر مجھے ایک عجیب سی خوشی ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ لوگ آدم خور تھے۔

ں وہ انسانوں کی شکل و صورت والے تھے اور میرے لئے یہ بات بڑی مسرت انگیز تھی
تھے ہوئی کہ یہ آدم خور وحشی تو اس بدقسمت لڑکے کو کھا جائیں گے۔ تو کیا مجھے مداخلت
چاہیئے۔

وہ آدم خور وحشی مجھے ساری انسانیت کے دشمن نظر آنے لگے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ قیدی
ان کے چنگل سے بچ نکلنے کی پوری پوری جدوجہد کر رہا ہے۔ لیکن وہ چھ سات آدم خوروں
غے میں تھا جو اس سے زیادہ طاقتور تھے۔ میں آج اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ کئی سالوں
سانوں کو دیکھ کر میں دم بخود سا ہو کر رہ گیا تھا۔ اور میری سوچنے اور فیصلہ کرنے کی طاقت
وج سی ہو گئی تھی۔ میں فوری طور پر کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ ابھی میں شش و پنج میں ہی تھا۔
نے دوربین سے دیکھا کہ قیدی لڑکا ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ ان آدم خوروں کے چنگل
زاد ہو گیا اور اس نے میرے ٹیلے کی جانب بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا۔ میں اسے دوربین
پنے قریب آتے دیکھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے آدم خور پاگلوں کی طرح بھاگے۔

لڑکا دبلا پتلا اور پھرتیلا تھا۔ وہ کسی ہرن کی طرح کلانچیں بھرتا بھاگا چلا آ رہا تھا۔ آدم خور
اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ اور اسے پکڑنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ اچانک
ی پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرا۔ آدم خور اس پر درندوں کی طرح جھپٹے۔ لیکن لڑکا ایک بار پھر
ے ہاتھوں سے نکل گیا۔ اب وہ میرے قریب آ گیا تھا۔ اور دوربین میں مجھے اس کی پسینے
ز آلود شکل صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ گہرے سانولے رنگ کا بھولے بھولے چہرے والا لڑکا
اس کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا۔ موت کے درندے اس کا پوری دیوانوں کی طرح
چلا آ رہا تھا۔ موت کے درندے اس کا برابر تعاقب کر رہے تھے۔ لڑکا ننگا تھا۔ اس کے
ہوا میں اڑ رہے تھے۔ اس نے صرف ایک لنگوٹ باندھ رکھا تھا۔

اچانک جیسے مجھ میں ایک تبدیلی سی رونما ہوئی۔ میں ہوش میں آ گیا۔ میرے دل میں اس
کے وحشی آدم خوروں سے بچانے کی آرزو نے ہلچل مچا دی۔ میں نے جھٹ سے بندوق
ور لڑکے کے پیچھے آنے والے ایک آدم خور وحشی کے سینے کا نشانہ باندھ کر گولی چلا
۔ دھائیں کی آواز سے جزیرے کا ساحل گونج اٹھا۔ درختوں پر سے پرندے شور مچاتے

اڑ گئے۔ دوسرے لمحے ریت پر آدم خور وحشی کی لاش خون میں لت پت پڑی تڑپ رہی تھی۔ اپنے ایک ساتھی کو مرتے دیکھ کر دوسرے آدم خور ایک دم سے رک گئے۔ لڑکا اب بھاگ کر میرے پاس آگیا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہانپتا ہوا کبھی تعجب سے مجھے دیکھتا اور کبھی ریت پر تڑپنے والی لاش کو تک رہا تھا۔ دوسرا آدم خور وحشی آگے بڑھا تو میں نے اس پر پستول سے فائر کر دیا۔ میرا نشانہ اتنے سالوں کے بعد بھی اتنا اچھا تھا کہ میں حیران رہ گیا۔ گولی دوسرے آدم خور وحشی کے ماتھے پر لگی۔ اور وہ بھی خون آلود ہو کر ریت پر گر پڑا۔ اس کی لاش کو دیکھ کر وحشی آدم خور الٹے پاؤں بھاگ اٹھے۔ میں نے ان پر ایک اور فائر کر دیا۔ یہ نشانہ خطا گیا۔ لیکن آدم خور اس قدر خوف زدہ ہو گئے تھے کہ انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ وہ بگٹٹ بھاگتے ہوئے کشتی میں سوار ہوئے اور اسے تیزی سے چلاتے ہوئے کھلے سمندر میں نکل گئے۔

وحشی لڑکا اسی طرح جھاڑیوں میں کھڑا میری طرف حیرانی سے تک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تشکر اور ممنونیت کے جذبات تھے۔ اس کی سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہ آ رہی تھی۔ کہ میں نے اس کی جان کیوں بچائی اور میرے پاس ایسا کون سا آلہ ہے جس کی مدد سے میں نے اتنی دور سے دو آدمیوں کو مار ڈالا تھا۔ میں بھی ایک طویل مدت کے بعد اپنے سامنے انسان کے بچے کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ اپنی جگہ سہما ہوا سا کھڑا تھا۔ میں اس کے پاس آگیا۔ میں نے اسے جھک کر اس طرح دیکھا۔ جیسے کسی عجیب مخلوق کو دیکھ رہا ہوں۔ ایک انسان کو دیکھ کر میرے دل کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ خوشی سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے میں نے اس لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے انگریزی میں کہا۔

"میں تمہارا دوست! تم میرے دوست!"

لڑکا کچھ نہ سمجھ سکا۔ وہ ابھی تک سہما ہوا تھا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر زور سے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم میرے بچے۔ تم انگریزی نہیں سمجھتے؟"

میری زبان لڑکے کی سمجھ سے باہر تھی۔ لیکن وہ میرے چہرے کے تاثرات اور میری دوستانہ

یات سے ذہنی طور پر میرے قریب آچکا ہے۔ وہ سمجھ گیا تھا۔ کہ میں اس کا ہمدرد ہوں۔ اسی
ِ میں نے آدم خوروں سے اس کی جان بچائی ہے۔ میں نے دوربین لگا کر سمندر میں دیکھا۔ آدم خوروں
کشتی بہت دور ایک دھبے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ میں حیران ہوا کہ یہ لوگ آخر کس طرف سے
ئے ہیں۔ اور کس طرف کو چلے جا رہے ہیں۔ کم از کم ایک بات تو ظاہر تھی۔ کہ اس جزیرے کے قریب
کوئی دوسرا جزیرہ بھی ہے۔ جہاں آدم خور وحشی قبیلہ آباد ہے۔

وحشی لڑکے کو میں نے ایک بار پھر سر سے پاؤں تک دیکھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے لڑکا ایک دم
میرے پاؤں پر گر پڑا۔ اور اپنی زبان میں میرے احسان کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ وہ میرے
ں چوم رہا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا اور اسے اپنے ساتھ ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ وحشی لڑکا
ے پیچھے چل پڑا۔ میں اسے لے کر اپنے کیبن کے باہر آگیا۔ رسی کی سیڑھی ابھی تک لکڑی کی نیم مدور
ار سے نیچے لٹک رہی تھی۔ میں سیڑھی چڑھ کر اوپر آگیا اور لڑکے کو بھی اوپر آنے کا اشارہ کیا
، تو وہ ذرا جھجکا۔ لیکن میرے اشارے پر وہ خوشی خوشی کیبن میں آگیا۔ میرا کتا اسے دیکھ کر
ر زور سے بھونکنے لگا۔ میں نے کتے کو چپ رہنے کے لئے کہا۔ پھر لڑکے کو لکڑی کی پلیٹ
پھیکا دلیا ڈال کر کھلایا۔ پہلے تو اس نے دلیے کو غور سے دیکھا۔ پھر چکھا اور شوق سے
ری پلیٹ کھا گیا۔

میری یہ کوشش تھی کہ میں اس سے پوچھوں وہ کون ہے۔ اور یہ آدم خور اسے لقمہ اجل بنانے
لئے کہاں سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ مصیبت یہ تھی کہ میں اس کی زبان نہیں جانتا تھا اور وہ
ی زبان نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے اشاروں اشاروں میں اس سے پوچھنے کی کوشش کی کہ وہ کون
۔ اور کہاں سے آیا ہے۔ ایک مدت سے اس بے آباد جزیرے پر انسانوں کی صحبت سے محروم
رہنے کی وجہ سے میں اشاروں کی زبان بہت حد تک سمجھنے لگا تھا۔ وحشی لڑکے نے اشاروں
ثوں غاں سے مجھے جو کچھ بتایا اس سے میں اتنا ہی سمجھ سکا کہ وہ اس جزیرے سے قریب ہی
جزیرے میں اپنے باپ کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کا باپ جزیرے کے قبیلے کا سردار ہے۔
ن قبیلے نے ان کے قبیلے پر حملہ کر کے سارے لوگوں کو قتل کر دیا اور اب اس کو گرفتار کر کے
بے آباد جزیرے پر لائے تھے تاکہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بھون کر کھایا جائے۔

یہ کافی رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانی تھی۔ میں خود آدم خور وحشیوں سے بہت دنوں تک خوف زدہ رہا تھا۔ سالہا سال تک جزیرے پر زندہ رہنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہاں کوئی آدم خور نہیں ہے۔ لیکن اب پتا چلا کہ جزیرے پر تو کوئی آدم خور وحشی قبیلہ نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ہی ایک جزیرہ ہے۔ جہاں یہ عالم درندے آباد ہیں۔ ان آدم خور وحشیوں کا ہمارے جزیرے پر دوسری بار حملہ یقینی تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ پہلی وجہ یہ تھی۔ کہ ان کے دشمن نے یہاں کے میرے پاس پناہ لے رکھی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میں نے ان کے دو آدمیوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ جن کی لاشیں ابھی تک سمندر کے کنارے ریت پر پڑی تھیں میں نے حفظ تقدم کے طور پر آدم خور وحشیوں سے بچنے کے لئے پوری تیاریاں شروع کر دیں۔ سب سے پہلے تو میں نے وحشی لڑکے کو پستول چلانی سکھائی۔ میں نے اس لڑکے کا نام فرائی ڈے رکھ دیا تھا۔ کیونکہ جس روز وہ میرے جزیرے پر مجھ سے ملا وہ جمعے یعنی فرائی ڈے کا دن تھا۔ دو چار روز کی کوشش کے بعد فرائی ڈے نے پستول چلانا سیکھ لیا۔ وہ اچھا نشانہ تو نہیں لگا سکتا تھا لیکن اپنے سامنے آئے ہوئے دشمن کو گولی چلا کر ہلاک ضرور کر سکتا تھا۔ میں نے لکڑی کی دیوار میں چھ جگہوں سے چھوٹے چھوٹے سوراخ بنا دیئے تاکہ اگر دشمن حملہ کرے تو اس پر گولی چلائی جا سکے۔ بارود میرے پاس بہت تھا۔ اور لوہے کے چھرے بھی تھیلی میں بھرے پڑے تھے۔

لکڑی کی دیوار کے اُوپر میں نے جنگل سے لمبے لمبے کانٹوں والی جھاڑیاں توڑ کر اس طرح سے بچھا دیں کہ اندر آنے میں رکاوٹ پیدا ہو سکے۔ وحشی لڑکا فرائی ڈے تیر کمان چلانے میں بڑا ماہر تھا۔ میں نے اسے درخت کی ایک مضبوط شاخ کاٹ کر کمان بنا دی اور لکڑی کے نوکیلے تیر بھی بنا کر دے دیئے۔ اب وہ میری طرح سے مکمل طور پر مسلح ہو چکا تھا۔ فرائی ڈے نے بھی اشاروں میں مجھے خبردار کر دیا تھا۔ کہ دشمن حملہ کر کے اسے حاصل کرنے اور اپنے مرے ہوئے ساتھیوں کا بدلہ لینے کسی نہ کسی وقت جزیرے پر ضرور آئیں گے۔ میں پوری طرح چوکس تھا میں صبح شام دوربین ہاتھ میں لئے جزیرے کے مغربی ساحل کا چکر کاٹ کر پہرے داری کرتا۔ اور دوربین لگا کر دیکھ لیتا تھا۔ کہ کہیں دشمن چوری چھپے جزیرے میں داخل تو نہیں ہو گیا۔ اس واقعے کو ایک ہفتہ گذر گیا۔ آدم خور وحشیوں نے جزیرے میں داخل تو نہیں ہو گیا۔ اس واقعے

کو ایک ہفتہ گذر گیا۔ آدم خور وحشیوں نے جزیرے کا ابھی تک رخ نہ کیا تھا۔ اس عرصے میں فرائی ڈے میرے ساتھ کافی گھل مل گیا تھا۔ اس نے مجھ سے انگریزی کے چند موٹے موٹے ضروری لفظ بھی سیکھ لئے تھے۔ وہ کتے کو انگریزی میں COME کہہ کر بلاتا تھا۔ مجھے ماسٹر کہنے لگا تھا۔ ایک روز وہ بڑے تعجب کے ساتھ مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں اس آدم خور جزیرے پر کیسے آ گیا میرا کیبن، میرا حلیہ اور میرے بڑھے ہوئے بال دیکھ کر اسے یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ میں ایک عرصے سے اس جزیرے پر پڑا ہوں۔

میں نے اشاروں اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اسے بتایا کہ مجھے اس جزیرے پر آئے ایک عمر ہو گئی ہے اور میرا جہاز چٹانوں سے ٹکرا کر غرق ہو گیا تھا۔ پھر میں نے اسے اوپر پہاڑی پر لے جا کر وہ صلیب دکھائی جس پر میں نے اس جزیرے میں وارد ہونے کی تاریخ اور دن لکھا تھا۔ دنوں کے شمار کی لکڑی کو گھن کھا گیا تھا۔ میں نے بھی چار پانچ سال گذرنے کے بعد اس پر دنوں کا شمار کرنا چھوڑ دیا تھا۔ فرائی ڈے میری ایک ایک شے کو حیرانی اور تعجب سے دیکھتا اور سنتا رہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سب کچھ سمجھ رہا ہے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں میری بہادری اور ہمت کی داد دے رہا ہے۔ فرائی ڈے میرے بڑے کام کرتا۔ وہ زمین پر اُگی ہوئی گندم کاٹ کر اسے جھاڑ کر گیہوں الگ کرتا۔ پھر گیہوں کو پتھر کے سل بٹے پر پیستا۔ اسے گوندھ کر روٹی پکاتا۔ سمندر پر جا کر کتے کو نہلاتا۔ جنگل میں جا کر انگور کے گچھے توڑ کر لاتا اور انہیں خشک کرنے کے لئے درختوں کی ٹہنیوں پر ڈال دیتا۔ ایک روز وہ تیر کمان لے کر جنگل میں گیا اور واپسی پر دو بکریوں کا شکار کر کے لایا۔ اس روز ہم نے بکریوں کا گوشت بھون کر کھایا۔ میں نے محسوس کیا کہ فرائی ڈے کو بکری کے گوشت کا مزہ نہیں آ رہا۔ میں نے ذرا گھبرا کر اس اس سے اشاروں میں پوچھا کہ کیا۔ اسے بھی انسانوں کا گوشت کھانے کی عادت ہے؟

اس پر وہ شرما گیا اور گردن کو اِدھر اُدھر ہلا کر اشاروں میں بتانے لگا کہ اس نے انسانوں کا بہت گوشت کھایا ہے اس لئے اس بکری کے گوشت کا مزہ نہیں آ رہا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ اب بھی انسانوں کا گوشت کھانا چاہتا ہے؟ اس نے سر کو نفی میں ہلا کر کہا کہ انہیں اب وہ انسان کا گوشت نہیں کھانا چاہتا۔ اسے بکری کا گوشت ہی بہت پسند ہے۔ فرائی ڈے

کو میرے پاس رہتے ہوئے ایک مہینہ گذر گیا۔ اس دوران میں اس نے انگریزی کے بہت سے لفظ سمجھ لئے تھے اور وہ ٹوٹے پھوٹے لفظ بول کر اپنا مطلب ادا کر دیتا تھا۔ میری صحبت نے اس کا جنگلی پن کسی حد تک دور کر دیا تھا۔ میں اسے قصداً بکری کا گوشت کم دیتا تھا۔ اسے زیادہ تر روٹی اور انگور کھانے کو دیتا تھا کہ اس کے گوشت کھانے کی عادت بالکل چھوٹ جائے۔

ایک مہینے بعد کا ذکر ہے کہ ایک رات میں حسب عادت اپنی بندوق صاف کر رہا تھا۔ پستول صاف کر کے میں نے تخت پر رکھا ہوا تھا۔ ان کی صفائی میں بلا ناغہ کیا کرتا تھا۔ فرائی ڈے پتھر کی سل پر گیہوں کے دانے رکھے پیس رہا تھا۔ کیبن کے اندر اندھیرا تھا۔ صرف ایک طرف پتھروں کے بنے ہوئے چولہے میں آگ جل رہی تھیں۔ جس کی روشنی میں گیہوں پیستے ہوئے فرائی ڈے کا سایہ دیوار پر آگے پیچھے ہو رہا تھا۔ آج میں نے اپنی کشتی میں بیٹھ کر سمندر میں کنارے کنارے گشت کی تھی اور سارے جزیرے کا چکر لگایا تھا۔ صبح اور شام کو اپنی روز کی عادت کے مطابق اونچے ٹیلے پر چڑھ کر دوربین سے دیر تک سمندر میں دیکھتا رہا تھا کہ کہیں کوئی بھولا بھٹکا جہاز تو ادھر سے نہیں گزر رہا۔ اور حسب عادت ناامید ہو کر واپس آ گیا تھا۔ تھکن اور ناامیدی نے میرے اعصاب شل کر دیئے تھے۔ رات کو تھوڑا بہت کھانا کھاتے ہی مجھے نیند آنے لگی۔ میں نے فرائی ڈے کو سمجھایا کہ میں سو رہا ہوں۔ وہ کچھ دیر پہرہ دے اور پھر خود بھی سو جائے۔ میں تخت پر ہی ٹانگیں پھیلا کر سو گیا۔

آدھی رات کو فرائی ڈے نے مجھے اچانک جگا دیا۔ وہ میرے کندھے کو زور زور سے ہلا رہا تھا۔ میں نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں اور پوچھا "کیا بات ہے۔ فرائی ڈے؟"

اس نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں سمجھایا کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی کیبن کے باہر پھر رہا ہے۔ میں فوراً اٹھ بیٹھا۔ ایک دم سے چوکس ہو گیا۔ پستول فرائی ڈے کو دے کر دیوار کی سوراخ کے مورچے پر بیٹھا دیا۔ خود رائفل لے کر دوسرے سوراخ کے مورچے پر بیٹھ گیا۔ دیوار کے اوپر کانٹے دار جھاڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے سب سے پہلے جزیرے کی آدھی رات کی خاموشی پر کان لگا دیئے۔ صرف سمندر کی طرف سے لہروں کے ہلکے شور کی آواز کے علاوہ اور کوئی آواز نہیں تھی۔ پھر میں نے سوراخ میں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ کسی

کے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ نہ کوئی پتوں پر چلتا محسوس ہوتا تھا۔ میں نے خاص طور پر کیبن کی دیوار کے باہر خشک پتے بکھیر دیئے تھے تاکہ اگر کوئی رات کو حملہ کرنے کی نیت سے آئے تو ہمیں اس کے پاؤں کی چاپ سنائی دے جائے۔

میں نے فرائی ڈے کی طرف دیکھ کر سرگوشی میں لیا۔

"فرائی ڈے۔ کون؟ کہاں؟"

فرائی ڈے نے ایک ہاتھ اپنے کان پر رکھ کر منہ سے کسی جانور کی ہلکی سی آواز نکالی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دشمن کا کوئی آدم خور اس جزیرے پر آیا ہے۔ اور اس نے جانور کی خاص آواز نکال کر اپنے دوسرے ساتھی کو خبردار کیا تھا۔ ان آوازوں کو چونکہ فرائی ڈے سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ ہوشیار ہو گیا۔ اور اس نے مجھے جگا دیا۔ ہم دونوں اپنے اپنے مورچوں میں ڈٹے ہوئے تھے۔ ایک سوراخ میں پستول کی نالی اور بندوق کی نالی رکھی تھی اور دوسرے سوراخوں سے ہم باہر اندھیرے میں جھانک رہے تھے۔ اب میرے لئے رات کا اندھیرا، اندھیرا نہیں رہا تھا۔ میں اندھیرے میں بھی اس طرح صاف دیکھ لیتا تھا۔ کہ جس طرح روشنی میں کبھی دیکھا کرتا تھا۔ پندرہ برس سے میں اس جزیرے پر راتوں کے اندھیرے میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ میں تو الو کی طرح اب رات کے اندھیرے میں بھی دیکھنے لگا تھا۔

ویسے آسمان کے ستاروں کی بھی ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ باہر سوائے سمندر کی طرف سے آنے والی لہروں کی ہلکی ہلکی آواز کے اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ جنگل کی طرف بھی گہری خاموشی تھی۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ فطرت کی گود میں پرورش پانے والے لڑکے فرائی ڈے کے کان جھوٹ نہیں بول سکتے۔ اس نے اگر سچ مچ کوئی آواز سنی ہے۔ تو پھر اس آواز میں ضرور کوئی حقیقت ہو گی۔ یہی وجہ تھی کہ میں پوری طرح دشمن کے حملے کا جواب دینے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ میرے پاس گھڑی تو کوئی نہیں تھی۔ میں وقت کا اندازہ آسمان کی طرف دیکھ کر اندازہ لگایا کہ ستاروں کا جھومر مغرب کی طرف زیادہ جھک گیا ہے۔ اس لئے رات آدھی سے زیادہ گذر چکی ہے۔ میں نے بارود کی تھیلی۔ لوہے کے چھروں کی تھیلی، بندوق صاف کرنے والی نالی اور اسی طرح فرائی ڈے کی پستول کا سامان بھی اس کے پاس تخت پر رکھ دیا تھا۔ فرائی ڈے

اپنا بنایا ہوا تیر کمان بھی لئے ہوئے تھا۔

ہم ہمہ تن گوش ہو کر اس دشمن کے حملے کا انتظار کر رہے تھے جس کی نشان دہی فرائی ڈے نے کی تھی۔ ہماری آنکھیں اور کان باہر لگے ہوئے تھے۔ باہر سوائے خاموشی کے اور کچھ بھی نہیں تھا اب میں نے فیصلہ کیا کہ باہر نکل کر دشمن کا سراغ لینا چاہیئے کہ وہ کہاں ہے میں جزیرے کے سارے جنگل کے ایک ایک چپے سے واقف تھا میرے لئے چھپ کر دشمن کو تلاش کرنا کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ میں نے فرائی ڈے کو سرگوشی میں سمجھایا کہ میں دیکھ بھال کے لئے باہر جا رہا ہوں لہٰذا وہ اندر چوکس رہے۔ میں جس سیڑھی سے اتر کر باہر جاؤں گا۔ وہ اسے میرے باہر اترتے ہی اوپر کھینچ لے اور جب میں سیٹی بجاؤں تو فوراً سیڑھی باہر پھینک دے۔ میری سیٹی کا مطلب یہ ہو گا کہ میں باہر آ گیا ہوں۔ اور اوپر آنا چاہتا ہوں۔ فرائی ڈے اگرچہ ایک آدم خور وحشی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن وہ بڑا ذہین نوجوان تھا۔ وہ میرے اشاروں اور انگریزی کے بعض الفاظ کو پورے مفہوم کے ساتھ سمجھ جاتا تھا۔ اس نے ذرا سا مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا اور میں نے آہستہ سے رسی کی سیڑھی باہر لٹکا دی۔

بڑی خاموشی سے بندوق ہاتھ میں لئے میں کیبن سے باہر آ گیا۔ بندوق بھری ہوئی میرے ہاتھ میں تھی۔ ایک چھرا بھی میں نے دوسرے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ کم بخت اس وقت میرا کیبن کے اندر سویا ہوا طوطا جاگ کر ٹیں ٹیں کر کے بول اٹھا۔ شاید وہ بھی اپنی عادت کے مطابق میرے ساتھ جانا چاہتا تھا۔ اس وقت طوطے کی آواز مجھے بہت بری لگی۔ کیونکہ اسے بولتا ہوا سن کر کسی درخت پر سے الو نے بھی اپنی ہو ہو شروع کر دی۔ فرائی ڈے نے میری ہدایت کے مطابق اسی وقت سیڑھی اوپر کھینچ لی۔ میں کچھ دیر ایک درخت کی اوٹ میں دم سادھے کھڑا رہا۔ خدا کا شکر ہوا۔ کہ طوطا اس کے بعد بالکل نہیں بولا۔ الو بھی خاموش ہو گیا۔ پھر میں درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے سے ہوتا ہوا اس ٹیلے کی طرف بڑھنے لگا۔ جہاں سے میں نے دوربین کے ساتھ پہلی بار آدم خور وحشیوں کو دیکھا تھا۔ مجھے یقین تھا۔ کہ اگر آدم خور اس جزیرے پر حملے کے لئے اترے ہیں تو ان کی کشتی ضرور سمندر کے کنارے کھڑی ہو گی۔ جو مجھے اندھیری رات میں بھی نظر آ جائے گی۔

میں بڑی احتیاط کے ساتھ پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ میں اس ہوشیاری سے چل رہا تھا کہ میرے قدموں کی آواز بھی پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ چلتے چلتے میں ٹیلے پر آ گیا۔ دوربین کا رات کو کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے جھاڑیوں میں جھانک کر سمندر کی طرف دیکھا تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ایک کشتی واقعی دور کنارے پر کھڑی تھی۔ فرائی ڈے کا اندازہ درست تھا۔ دشمن ہمارے جزیرے پر اتر چکا تھا۔ میں چوکنا ہو گیا۔ ظاہر ہے اس کشتی میں چار پانچ آدم خور ضرور آئے ہوں گے۔ اب میں تیزی سے واپس مڑا اور جھاڑیوں اور درختوں کی اوٹ میں چھپتا چھپاتا واپس اپنے کیبن کی طرف چل پڑا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں آدم خوروں نے میری عدم موجودگی میں کیبن پر حملہ نہ کر دیا ہو۔ اگر فرائی ڈے کے پاس پستول اور تیر کمان بھی تھا لیکن وہ اکیلا چار پانچ آدم خور وحشیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

ٹھیک اس وقت کیبن کی طرف سے فرائی ڈے کے پستول چلانے کی آواز سے جنگل گونج اٹھا۔ درختوں پر پرندوں نے شور مچا دیا۔ میں کیبن کی طرف بھاگنے لگا۔ اب مجھے آدم خور وحشیوں کی چیخوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ میں بھاگ کر کیبن کے پاس آیا اور ایک بڑے سے درخت کے تنے کے پیچھے ہو کر چھپ گیا اور دیکھنے لگا کہ آدم خور کہاں ہیں۔ میں نے دیکھا کہ دو آدم خور کیبن کی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ فرائی ڈے دیوار کی سوراخ میں سے تھوڑی دیر کے بعد پستول کا فائر داغ دیتا تھا۔ دو ننگ دھڑنگ آدم خور کیبن پر تیروں کی بارش کر رہے تھے میں نے درخت کے پیچھے کھڑے کھڑے بندوق سے ایک آدم خور کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ دھماکے کی آواز کے ساتھ گولی چلی اور وہ آدم خور چیخ مار کر اچھلا اور زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ میں نے دوسری گولی بھی چلا دی۔ یہ گولی دوسرے آدم خور کو لگی اور وہ لنگڑاتا ہوا ایک طرف کو بھاگا۔ اب فرائی ڈے بھی شیر ہو گیا تھا۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ میں مقابلے پر آ چکا ہوں اس نے بھی اندر سے دھڑا دھڑ پستول کے فائر کرنا شروع کر دیئے۔ اگرچہ اس کی ایک بھی گولی نشانے پر نہیں لگ رہی تھی۔ تاہم پستول کے دھماکوں نے آدم خور وحشیوں کو بوکھلا دیا اور وہ بھاگ گئے۔

میری بندوق میں اب بارود نہیں تھا۔ لہٰذا میں اب کوئی فائر نہیں کر سکتا تھا۔ اس

لئے واپس کیبن میں جانے کو بے تاب تھا۔ چھرا ضرور میرے ہاتھ تھا۔ مگر آدم خور وحشیوں کے تیروں کے آگے یہ چھرا کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ میدان خالی ہے۔ تو میں نے ہلکی سی سیٹی بجائی۔ فرائی ڈے نے کیبن کی دیوار سے ایک طرف رسی کی سیڑھی لٹکا دی۔ میں بھاگ کر سیڑھی سمیٹ کر اندر پھینک دی۔ فرائی ڈے کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ اور اس کا چہرہ پسینے میں شرابور تھا۔ میں نے جلدی سے اپنی بندوق میں بارود بھرا اور دیوار کی سوراخ میں اس کی نالی رکھ کر دوسرے سوراخ میں سے باہر کے حالات کا جائزہ لینے لگا۔

آدم خور اپنے ساتھی کی لاش گھسیٹ کر ساتھ لے گئے تھے۔ باہر مکمل خاموشی تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ دشمن پسپا ہو کر بھاگ چکا تھا۔ پھر بھی کوئی خبر نہیں تھی کہ کس طرف سے کوئی تیر آ جائے یا کوئی آدم خور درخت کے اُوپر چڑھ کر کیبن کے اندر چھلانگ لگا دے۔ اگرچہ میں نے ٹھیک کیبن کے اُوپر سے درخت کی شاخوں کو کاٹ تراش دیا تھا۔ ہم کتنی دیر تک اپنے اپنے مورچوں میں ڈٹے رہے۔ لیکن کوئی آدم خور وحشی پھر نہ آیا۔ اب رات ڈھلنی شروع ہو گئی تھی۔ آسمان پر صبح کی آمد آمد کی نیلی روشنی نے نمودار ہونا شروع کر دیا تھا۔ میں نے فرائی ڈے سے اشاروں میں کہا کہ وہ سو جائے میں پہرہ دوں گا۔ فرائی ڈے نے نفی میں سر ہلایا اور کہا کہ میں آرام کروں۔ مگر وہ آرام کا وقت نہیں تھا کیونکہ دشمن کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ کہ وہ کہیں پاس ہی چھپا ہوا ہو اور ہمیں غافل پا کر پھر سے حملہ کر دے۔

جب مشرق میں صبح کا اُجالا پھیلنے لگا تو میں نے فرائی ڈے کو کیبن میں رہنے کے لئے کہا اور خود کیبن سے باہر آ کر پیچھے سے ہو کر ٹیلے پر آ گیا۔ میں نے سمندر کی طرف دیکھا۔ دن کی روشنی سمندر کے کنارے پر پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں آدم خوروں کی کوئی کشتی نہ تھی۔ دشمن واپس بھاگ گیا تھا میں جلدی جلدی اپنے کیبن میں واپس آیا اور فرائی ڈے کو آواز دے کر بتایا کہ آدم خور جا چکے ہیں وہ بھی کیبن سے باہر آ گیا۔ ہم خوش خوش ساحل سمندر کی طرف چلے ہی تھے۔ کہ اچانک ایک طرف سے سن کر کے ایک تیر آیا اور فرائی ڈے کی گردن کے بالکل قریب سے نکل کر ایک درخت میں گڑ گیا۔ ہم بھاگ کر ایک درخت کے تنے کی اوٹ میں ہو گئے۔ دشمن کا کوئی آدمی وہاں موجود تھا تاکہ چھپ کر حملہ کر سکے۔ یہ تیر ایک درخت کی سمت سے آیا تھا۔ اور نشانہ فرائی ڈے کی گردن

وہ فرائی ڈے کو ہر قیمت پر ہلاک کرنا چاہتے تھے۔ شاید انہوں نے ایک آدمی کو جزیرے سی لئے چھوڑ دیا تھا کہ جب ہم مطمئن ہو کر کیبن سے باہر نکلیں تو اپنی جان پر کھیل کر فرائی ڈے ک کر دیا جائے۔

میں نے اوپر درختوں کا جائزہ لیا۔ اب دن کا اجالا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ گھنی شاخوں چھپا ہوا آدم خور مشکل ہی سے نظر آ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ننگے ہوتے ہیں۔ اور ان کے جسم کا رنگ ی مائل سیاہ ہوتا ہے۔ جو شاخوں کے پتوں کے ساتھ گھل مل جاتا ہے۔ پھر بھی اندازے کے مطابق درخت کی طرف سے تیر آیا تھا۔ میں نے اس طرف بندوق کا فائر داغ دیا۔ فرائی ڈے نے بھی لی چلا دی۔ ہم کم از کم دشمن کی گولیوں سے دھماکوں سے خوف زدہ ضرور کرنا چاہتے تھے ہم تک درخت کی اوٹ میں چھپے رہے۔ میری پیٹھ فرائی ڈے کی طرف تھی اور فرائی ڈے نے پشت میرے ساتھ لگا رکھی تھی۔ ہم نے پستول اور بندوق ایک اور فائر داغ دیا۔ اس کے یں نے بھی ہوا میں ایک فائر کر دیا۔ اس کے بعد میں نے بھی ہوا میں ایک فائر کر دیا۔ بارود دھماکوں نے سارے جنگل کے پرندوں کو بیدار کر دیا۔ وہ شور مچاتے آسمان کی طرف رواز کر گئے۔

پھر ہم نے بڑی چوکسی سے چل پھر کر دشمن کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ فرائی ڈے نے اشاروں ں مجھے بتایا کہ ان کے قبیلے میں بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ جنہیں جانباز کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ اپنی جان قبیلے کی آن پر نچھاور کر دیتے ہیں۔ چنانچہ آدم خور وحشی جاتے جاتے پیچھے اپنے قبیلے کے ایک جانباز کو چھوڑ گئے تھے۔ اس آدم خور جانباز کا کام یہ تھا۔ کہ اپنی جان پر کھیل کر کسی طرح سے فرائی ڈے کو قتل کر دے۔ یہ شخص سر پر کفن باندھ کر آیا تھا۔ اسے تو اپنی جان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ بس اس سے اپنی جان کا بچاؤ بہت ضروری بھی تھا۔ اور ہوشیاری بھی چاہتا تھا۔ اب آدم خور جانباز کو ہلاک کرنا ہمارے لئے بھی ضروری ہو گیا تھا۔ کیونکہ یہ پاگل کسی وقت بھی تے آ کر فرائی ڈے پر یا مجھ پر تیر چلا سکتا تھا۔

ہم نے لک چھپ کر جزیرے کا کونہ کونہ چھان مارا۔ مگر یہ دیوانہ آدم خور ہمیں کہیں نظر نہ ظاہر ہے۔ وہ اسی جزیرے میں کسی جگہ چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ اور موقع کا انتظار کر رہا تھا

یا پھر وہ ہمارا تعاقب کر رہا تھا۔ میں نے فرائی ڈے سے کہا۔

"فرائی ڈے..... واپس کیبن میں چلو۔"

میں نے یہی فیصلہ کیا کہ فرائی ڈے کو کیبن سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ کیونکہ بنیادی طو
پر آدم خور فرائی ڈے کو ہی ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ میرے تو وہ اس لئے دشمن ہو گئے تھے کہ میں نے
فرائی ڈے کو پناہ دی تھی اور ان کے کچھ لوگوں کو اپنی بندوق سے مار ڈالا تھا۔ وہ میرے مجبور کر
پر کیبن کے اندر چلا گیا۔ میں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ آدم خور وحشی کی تلاش شروع کر دی۔ میں جھاڑ
اور درختوں کی اوٹ میں چھپ چھپ کر آگے بڑھ رہا تھا۔ میں اگر اس جزیرے کے چپے چپے سے
واقف تھا تو وہ آدم خور وحشی بھی جنگل کا باشندہ تھا۔ اس کے لئے درختوں یا جھاڑیوں میں بندر کی
طرح چڑھنا اور چڑھ کر چھپ جانا کوئی مشکل اور وقت طلب کام نہیں تھا۔ میں جزیرے کے مشر
ساحل کی طرف نکل آیا۔ میری آنکھیں اِدھر اُدھر جھاڑیوں اور درختوں کی اوٹ کو بڑے غور
سے دیکھ رہی تھیں۔ میں ذرا ذرا سی آہٹ سن رہا تھا۔ اور معمولی سی آہٹ پر ہوشیار ہو جا
تھا۔

یکایک ایک تیر سن کر کے میرے بازو کے بالکل قریب سے گزر کر سامنے ایک پتھر کو جا لگا۔
میں جلدی سے زمین پر بیٹھ اور کسی جنگلی بلے کی طرح گھٹنوں کے بل دوڑتا ہوا ایک چٹان کے عقب
میں چھپ گیا۔ میں نے بے سوچے سمجھے جس طرف سے تیر آیا تھا ادھر بندوق کا فائر داغ دیا۔ اس کا
نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ کیونکہ خدا جانے وہ جنگلی وحشی کہاں اور کس درخت کی گھنی جھاڑیوں میں چھپا ہو
تھا۔ اور کیا خبر وہ میری ساری نقل و حرکت کی نگرانی بھی کر رہا ہو۔ میں ابھی دوسری بار بند
چلانے کے لئے اس میں بارود بھر ہی رہا تھا کہ ایک اور تیر میرے سر کے اوپر سے گزر کر چٹا
سے ٹکرا کر دور جا گرا۔ میں نے فوراً دوسرا فائر بھی جھونک دیا۔ اس فائر کا بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہ
چاہیئے تو یہ تھا کہ گولی درخت میں چھپے ہوئے وحشی کو لگتی اور وہ ایک چیخ کے ساتھ زمین
گر پڑتا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ میرے فائر کے دھماکے سے صرف درختوں کے پرندے شور مچا
ہوئے اڑ گئے۔ مجھے ایک ڈر تھا کہ کہیں فرائی ڈے میرے فائروں کی آواز سن کر کیبن سے با
نہ نکل آئے۔ اس کا باہر آنا خطرناک ہو سکتا تھا۔

میں تیسری بار بندوق میں بارود بھر کر حملے کے لئے تیار ہو چکا تھا کہ اچانک آدم خور وحشی کی
خوفناک چیخ فضا میں بلند ہوئی اور پھر کسی شے کے درخت سے دھم کے ساتھ گرنے کی آواز
میں جلدی سے بھاگ کر وہاں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آدم خور وحشی کی گردن میں ایک تیر
ت ہے اور اس کے خون سے زمین لالہ زار ہو رہی ہے۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ یہ تیر
ں سے آیا کہ درخت کے پیچھے سے فرائی ڈے مسکراتا ہوا نمودار ہوا۔ یہ اس کا کارنامہ تھا
رے پہلے فائر کی آواز سن کر وہ اپنے آپ کو کیبن کے اندر قید نہ رکھ سکا اور سیڑھی لگا کر باہر
ل آیا اور پستول کی بجائے کمان پر تیر چڑھا کر وحشی کی تلاش شروع کر دی۔ وہ آدم خور
یوں کی چالاکیوں سے خوب واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کس جگہ چھپ کر حملہ کر سکتا ہے
نچہ اس کی چیتے ایسی تیز آنکھوں نے ایک درخت کی شاخوں میں وحشی کو چھپے ہوئے دیکھ لیا بس
یا تھا۔ فرائی ڈے نے سن سے تیر چلا دیا۔ فرائی ڈے کا تیر کا نشانہ کبھی خطا نہیں جا سکتا تھا

آدم خور وحشی زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا کہ فرائی ڈے نے اپنے لنگوٹ کے ساتھ اڑسا ہوا
اقو نکال کر میرے دیکھتے دیکھتے بڑی بے دردی سے اس کا پیٹ چاک کر دیا اور پھر اس کا کلیجہ
کال کر اسے چبانے لگا۔ میں نے کراہت سے منہ دوسری طرف کر لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں فرائی
ے کو اس انتقامی کارروائی سے نہ روک سکوں گا۔ کیونکہ یہ وہ آدم خور وحشی تھا۔ جس کے
ساتھیوں نے اس کے خاندان کے ایک ایک فرد کو قتل کر کے بھون کر کھا لیا تھا۔ فرائی ڈے کے
ہاتھ اور منہ خون آلود تھے۔ وہ میری طرف دیکھ کر ادب سے جھکا اور انگریزی کے دو لفظو
میں صرف اتنا کہا۔

"ماسٹر! اینی می ماسٹر! بائی ماما! کل ماسٹر!......"

میں سمجھ گیا وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ اس نے آدم خور کا کلیجہ چبا کر وحشیوں کی قدیم رسومات
اور روایات کے مطابق اس سے اپنے خاندان کے قتل عام کا بدلہ لیا تھا۔ ہم نے وحشی کی لاش
کو گڑھا کھود کر دبا دیا تاکہ جنگل میں بدبو نہ پھیلے۔ اب ہم بے فکر ہو گئے تھے۔ کیبن میں واپس
آنے سے پہلے فرائی ڈے اور میں، ہم دونوں سمندر کے کنارے گئے۔ وہاں جا کر پانی میں
جی بھر کر غسل کیا اور واپس آ گئے۔ سمندر پر کوئی کشتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

میں واپسی پر اپنی روز کی عادت کے مطابق پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر گیا اور دوربین لگا کر
سمندر کی طرف دیکھنے لگا کہ شاید کوئی جہاز دکھائی دیئے جائے۔ مگر بیس برس سے مجھے کوئی جہا
دکھائی نہیں دیا تھا۔ میری آنکھیں دور سے جہاز کے پھولے ہوئے بادبانوں کو دیکھنے کو ترس
گئی تھی سمندر کا سینہ دھوپ میں حد نظر تک ویران تھا۔ چھوٹی چھوٹی لہریں دور دور سے آ
کر سمندر میں نکلی ہوئی ان چٹانوں سے ٹکرا کر واپس چلی جاتی تھیں۔ جنہوں نے میرے جہاز کو بیس
بائیس برس پہلے دو ٹکڑے کر کے سمندر میں ڈبو دیا تھا۔ یہ چٹانیں میری تباہی کی نشانی بن کر ہر روز
میرا منہ چڑایا کرتی تھیں۔ میں ناامیدی سے سر جھکائے واپس کیبن میں آگیا۔ فرائی ڈے نے ناشتہ
تیار کر رکھا تھا۔ ناشتا کیا تھا۔ بس پھیکا دلیہ خشک انگور اور پتھر پر پکائی ہوئی موٹی روٹی کے
ٹکڑے نتھے۔ ناشتا کرتے ہوئے میں نے فرائی ڈے سے اشاروں اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں پوچھا
کہ اس کا دشمنوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا وہ یہ سمجھتا ہے۔ کہ وہ دوبارہ جزیرے پر حملہ
کریں گے؟

فرائی ڈے نے بھی ٹوٹے پھوٹے لفظوں اور اشاروں میں بتایا کہ جب تک اس آدم خور
وحشی قبیلے کا ایک فرد بھی زندہ ہے، وہ مجھ سے انتقام لینے ضرور آتا رہے گا۔ اس کا مطلب یہ تھا
کہ اب اس جزیرے پر ہماری زندگی ایک مسلسل خطرے میں تھی۔ ہمیں ہر وقت چوکس رہنے کی
ضرورت تھی۔ اس خطرے کے احساس نے میرے اندر زندگی کا ایک بھرپور جذبہ پیدا کر دیا۔
مجھے محسوس ہوا کہ میں کسی مقصد کے لئے زندہ ہوں۔ اور کچھ نہیں تو دشمن سے مقابلہ کرنے کے
لئے ہی سہی۔ ناشتے کے بعد میں نے فرائی ڈے سے کہا کہ وہ خشک انگوروں کو خوشوں سے اچھی
طرح توڑ کر لکڑی کے بکس میں جمع کرے اور میں کشتی میں بیٹھ کر جزیرے کے ساحل کی گشت کے لئے
باہر آگیا۔ میری کشتی ایک طرف سمندر میں چٹان کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ میں اس میں سوار
ہو گیا اور چپو چلاتا اسے لے کر جزیرے کے ساحل کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ جزیرے کی گشت
بھی میرے روز کے معمولات میں سے تھے۔ میں مغربی کنارے سے نکل کر جزیرے کے مشرقی کنارے
پر آگیا۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ یہ جزیرہ اتنا بڑا جزیرہ نہیں تھا۔ میں بڑے مزے سے چپو
چلاتا کنارے کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ آسمان صاف تھا۔ اور

خوب چمک رہی تھی۔ فضا میں سردی ختم ہو رہی تھی۔ دھوپ بڑی بھلی لگتی تھی۔ سمندر کا
ھنے درختوں سے اٹا پڑا تھا۔ ان درختوں پر سرخ اور نیلے رنگ کے پھولوں والی بے شمار
ڑھی ہوئی تھیں ان پھولوں کی مہک دل کو بڑی اچھی لگتی تھی۔
یں بڑی نرم روی سے کشتی چلاتا چلا جا رہا تھا کہ میری کشتی کو ایک دھچکا لگا۔ دھچکا
ندید تھا۔ کہ میں گرتے گرتے بچا۔ کشتی گھوم گئی۔ میں بھونچکا رہ گیا کہ یا خدا یہ کیا نئی مصیبت
یں ابھی سنبھلا ہی تھا۔ کہ کیا دیکھتا ہوں کہ کشتی کے نیچے سے ایک شارک مچھلی کا باہر
ا ہوا بلیڈ سمندر کی لہروں میں ایک طرف کو جا رہا ہے۔ تو گویا یہ بلائے ناگہانی شارک
اس سمندر میں پہلے بھی میں نے بڑی بڑی شارک مچھلیاں دیکھی تھیں۔ مگر یہ اُن سب
ڑی تھی۔ شارک عام طور پر میری کشتی کے قریب سے ہو کر گزر جایا کرتی تھیں۔ لیکن اس
ملہ کر دیا تھا اس کا مطلب یہ تھا۔ کہ کوئی آدم خور شارک تھی۔ جس کو انسان کے خون کی چاٹ
ی تھی۔ اور جو انسان کے جسم کی بو میلوں سے محسوس کر لیتی تھی۔ شارک کے آگے جا کر مڑی
ر بڑی تیزی سے کشتی پر حملہ کرنے کے لئے کشتی کی طرف آئی۔ میں ہوشیار ہو گیا تھا۔ میرے پاس
ری ہوئی بندوق تیار تھی۔ میں نے شارک کے سر کا نشانہ باندھ لیا۔ شارک کے سر کا بلیڈ
ہر نکلا ہوا تھا۔ جونہی اس کا سر کشتی کے قریب آیا۔ میں نے گولی داغ دی۔ دھماکہ ہوا اور
ارک اچھل کر سمندر میں اتر گئی۔ میں نے سوچا کہ گولی ٹھیک نشانے پر لگی اور شارک مر گئی۔
یکن وہ مری نہیں تھی، شدید زخمی ہوئی تھی۔ اس نے آخری بار کشتی کو اس زور کی ٹکر ماری
ہ کشتی سمندر میں الٹ گئی اور پانی میں گر پڑا۔ خدا کا شکر تھا کہ شدید زخمی ہونے کی وجہ سے
شارک میں اب اتنی ہمت نہیں رہی تھی۔ کہ حملہ کر کے میرے جسم کو دو ٹکڑے کر سکتی۔ میں سمندر
یں تیرنے لگا۔ شارک سمندر کی تہہ میں نہ جانے کدھر گم ہو گئی تھی۔ میں تیرتے تیرتے کشتی تک
پہنچا۔ اسے اپنی طرف کھینچتا ہوا کنارے پر لے آیا۔
کنارے پر لا کر میں نے اسے بڑی مشکل سے سیدھا کیا۔ اس پر سوار ہوا اور دوبارہ کنارے
کی گشت لگاتا واپس اپنے کنارے والی چٹانوں کے پاس آگیا۔ فرائی ڈے نے میری بندوق
چلنے کی آواز سن لی تھی اور کیبن سے باہر نکل کر جھاڑیوں میں چھپا سمندر کی طرف تشویش بھری

نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ جب میں اسے نظر آیا تو وہ بھاگتا ہوا میرے پاس پہنچا۔

"ماسٹر! ماسٹر!"

میں نے اسے بتایا کہ سمندر میں ایک شارک نے حملہ کر دیا تھا۔ میں نے اس پر گو
چلائی تھی۔ اس کی جان میں جان آئی اور اس نے جلدی سے کشتی کنارے پر کھینچ کر چٹان کے
ساتھ باندھ دی۔ کیبن میں آ کر میں نے بندوق صاف کر کے رکھ دی۔ اب میرے پاس بارو
صاف کر کے رکھ دی۔ اب میرے پاس بارود کی صرف دو تھیلیاں رہ گئی تھیں۔ چونکہ
مجھے آدم خور وحشیوں کے حملے کا ڈر تھا، اس لئے میں نے فرائی ڈے سے کہا کہ ہم آئندہ سے
بندوق اور پستول استعمال نہیں کریں گے۔ اس کی جگہ ہم تیر کمان سے کام لیں گے چنانچ
ہم نے ایک درخت کو کلہاڑے سے گرا دیا اور اس کی شاخوں سے تیر کمان بنانے لگے۔
دو دن کی محنت کے بعد ہم نے ہزاروں تیر بنا لئے۔ یہ تیر اس قدر نوکیلے تھے کہ ہاتھی کے
جسم سے بھی پار ہو سکتے تھے۔ ان تیروں کو فرائی ڈے نے اپنے خاص انداز میں بنایا تھا۔
اور وہ لوہے کی انی والے تیروں سے زیادہ مہلک ہو گئے تھے۔ اب ہم دن کو جنگل میں گھو
کر بڑے مزے سے اڑتی مرغابیوں اور پرندوں کا شکار کرتے۔ ہفتے میں دو ایک بار
کوئی نہ کوئی جنگلی بکری بھی ہاتھ لگ جاتی۔ کسی روز سمندر میں کانٹا ڈال کر اکڑوں میں بیٹھ
جاتا اور مچھلی کا شکار کرتا...... اسی طرح تین مہینے گذر گئے۔ آدم خور وحشیوں نے پھر کوئی حملہ
نہ کیا تھا۔ فرائی ڈے کا خیال تھا کہ وہ لوگ اسے ہرگز نہیں بھولے اور ضرور حملہ کریں گے
میرا خیال تھا کہ وہ میری بندوق کے دھماکوں سے خوف زدہ ہو گئے ہیں۔ اور اب کبھی
ادھر کا رخ نہ کریں گے۔

ایک روز بڑا اندوہناک حادثہ ہوا۔

میں صبح کے وقت عادت کے مطابق پہاڑی کی چوٹی پر دوربین لئے کھڑا سمندر میں
دیکھ رہا تھا۔ کہ میں نے جو کچھ دیکھا اس پر مجھے یقین نہ آیا۔ میں نے دوربین آنکھوں سے
ہٹا کر زور زور سے آنکھیں ملیں اور پھر سے دیکھا۔ دور سمندر سے میری آنکھوں کے
سامنے سے ایک سفید رنگ کا بادبانی جہاز گذر رہا تھا۔ خوشی سے میرا دل سینے سے

ر باہر کو آنے لگا۔ میں نے دوربین ہٹا کر زور زور سے اچھل اچھل کر چلانا شروع کر دیا۔

"مدد! مدد! مدد!"

میری آواز سن کر فرائی ڈے بھی بھاگتا ہوا آ گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ جہاز ہے۔ آگ جلاؤ۔
ے لکڑیوں کا ایک گٹھا خشک جھاڑیوں سمیت وہاں اس وقت کے لئے تیار رکھا تھا۔ اسی
آگ جلا کر دھواں کر دیا گیا۔ میں نے اپنی بکری کی کھال کی جیکٹ اتار دی۔ اور اس سے
زور سے ہوا دیتے ہوئے دھوئیں کے مرغولے ہوا میں اڑانے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ اتنے
ل عرصے بعد جو یہ جہاز ادھر آیا ہے۔ تو وہ ضرور دھواں اٹھتا دیکھ کر جزیرے کی طرف
ے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ میں نے دوبارہ دوربین لگا کر دیکھا تو جہاز دور ہٹتا جا رہا تھا۔
یا اس نے میری پہاڑی کے دھوئیں کو نہیں دیکھا تھا یا اگر دیکھا بھی تھا تو کوئی اہمیت نہیں
ی تھی۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر اچھل اچھل کر جہاز والوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن
ازوالوں نے کوئی توجہ نہ دی۔ وہ جزیرے سے دور ہوتے چلے گئے۔ میں نے دوربین لگا کر
ھا تو میرا دل ڈوب سا گیا۔ جہاز سمندر کی لہروں سے اوٹ میں گم ہوتے ہوئے نگاہوں سے
جھل ہو رہا تھا۔ اور پھر وہ غائب ہو گیا۔

میرا دل ٹوٹ گیا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بائیس برس کے بعد زندگی میں آزادی اور
رقید سے رہائی کی ایک ہلکی سی امید کی کرن چمکی تھی۔ اور وہ بھی بجھ گئی۔ اس کا مطلب یہ تھا
کہ خدا نے میری قسمت میں اس سنگ دل جزیرے کی عمر قید لکھ دی ہے۔ میری تقدیر میں ہی
یہی لکھا ہے۔ کہ میں ساری باقی عمر اسی جزیرے پر بسر کروں اور میری قبر اسی اجاڑ گمنام جزیرے
پر رہنے۔ میں پہاڑی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے گھٹنوں میں سر دے لیا اور بچوں کی طرح پھوٹ
پھوٹ کر رونے لگا۔ فرائی ڈے بہت پریشان ہو گیا۔ وہ بھی زمین پر ایک طرف بیٹھ کر رونے لگا
کیبن سے میرا کتا بھاگتا ہوا میرے پاس آ گیا تھا۔ اور وہ میری گردن پر پیار کر رہا تھا۔ میرا
پالتو طوطا میرے کندھے پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اور بار بار "ٹیں" کر رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔
کہ مالک ہمت نہ ہارو۔ حوصلہ کرو۔ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ وہ ایک نہ ایک روز
ضرور کوئی ایسا سبب پیدا کر دے گا کہ تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس جہنم سے نجات مل جائے

گی۔

فرائی ڈے نے آکر بڑی محبت سے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے آنسوؤں سے بھیگی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو چھلک رہے تھے۔ اس نے کپکپاتے ہونٹوں سے کہا۔

”ماسٹر! ماسٹر!“

اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا اور اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ میرا کتا بھی میری طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ طوطا میری گردن پر بیٹھا بار بار اپنی گردن گھما رہا تھا۔ میں نے سر جھکا لیا۔ جیکٹ کی آستینوں سے اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں پونچھیں اور اٹھ کر سر جھکائے پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔ منزل مجھ سے دو قدم دور رہ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ ایک عمر گذر گئی تھی۔ مجھے اس جہنمی جزیرے پر انیس برس کا لڑکا تھا۔ کہ اس جزیرے پر آیا تھا۔ اب چونتیس پینتیس برس کا ہو گیا۔ بالوں میں سفیدی آ گئی تھی۔ کبھی کسی بادبانی جہاز نے ادھر کا رخ نہ کیا تھا آج ایک طویل مدت گذر جانے پر جہاز نظر بھی آیا تو وہ بے رخی سے منہ موڑ کر چل دیا۔ میرے خدا! ابھی میری قسمت میں اور کتنی مصیبتیں برداشت کرنی لکھی ہیں؟

وہ رات میں نے تھوڑی تھوڑی دیر روتے گذار دی۔ میری آنکھوں میں اپنے آپ آنسو آ جاتے تھے۔ مجھے اپنے باپ کا خیال آ جاتا تھا۔ اس کی شکل آنکھوں میں گھومنے لگتی۔ وہ اگر زندہ ہوا تو بہت بوڑھا ہو گیا ہو گا۔ اگر میں اس حلیے میں اس کے سامنے چلا جاؤں تو وہ مجھے کبھی نہ پہچان سکے۔ شاید اب میں بھی اسے نہ پہچان سکوں۔ وقت نے ہمارے ساتھ بہت بڑی زیادتی کی تھی۔ خدا جانے مجھے میری کس خطا کی اتنی شدید سزا مل رہی تھی۔ رات میں بالکل نہ سکا۔ صبح اٹھ کر میں سمندر کی گشت پر بھی نہ جا سکا اور کیبن میں ہی پڑا رہا۔ بے چارہ فرائی ڈے بھی میرے ساتھ پریشان تھا۔ لیکن میں نے اسے کہہ دیا کہ وہ پریشان نہ ہوا اور باہر جا کر کھیت میں اپنا کام کرے۔ وہ بادل نخواستہ باہر چلا گیا اور میں تخت پوش پر لیٹ کر سو گیا۔

میں شام تک سویا رہا۔ میری آنکھ کھلی تو شام ہو رہی تھی۔ فرائی ڈے نے آگ جلا رکھی تھی اور اس پر بکری کے سوکھے گوشت کے ٹکڑے بھون رہا تھا۔ ایک دم سے بجلی چمکی اور بادل

با..... میں نے تعجب سے فرائی ڈے کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کیا بادل آ گئے ہوئے ہیں؟“

” YES ماسٹر! YES“

وہ خوش ہو کر بولا۔ اب میرے دل سے کل کے دردناک حادثے کا بوجھ کم ہو گیا تھا۔ مجھے صبر آ گیا تھا۔ فضا میں خنکی ہونے لگی تھی۔ شاید اس لئے بھی کہ سمندر کی طرف سے ٹھنڈی ہوائیں لنے لگی تھیں۔ میرا طوطا زور زور سے بول رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر اسے پنجرے میں بند کر دیا۔ کم بخت بوں شور مچا رہے ہو؟“ کتا فضا میں کسی شے کی جیسے بو سونگھ کر اچھل کود مچا رہا تھا۔ میں نے ں کو بھی سرزنش کی۔ بے چارہ مالک کی ڈانٹ ڈپٹ سن کر خاموش ہو گیا۔ بجلی ایک بار پھر چمکی در بادل پہلے سے بھی زوردار کڑاکے کے ساتھ گرجا.... پھر ایک دم سے بارش شروع ہو گئی... رائی ڈے نے لکڑی کی دیوار کے سوراخ سے باہر دیکھ کر کہا۔

”ماسٹر! ہوا بڑی تیز ہے۔“

یہ جملہ اس نے ٹوٹے پھوٹے دو تین لفظوں میں ادا کیا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ فکر نہ کرے۔ ایسی تیز ہوائیں چلا ہی کرتی ہیں۔ بارش بڑے زور سے شروع ہو گئی تھی۔ اور اس کی ترچھی بوچھاڑ کیبن کی لکڑی کی دیواروں پر بڑے شور کے ساتھ پڑ رہی تھی۔ کیبن کی چھت ہم نے درخت کی موٹی شاخیں ڈال کر اوپر لکڑی کے تختے جڑ کر بنائی تھی۔ اس پر بھی بارش کا شور اٹھ رہا تھا۔ ہم اس قسم کے شور کے عادی ہو گئے تھے۔ اور یہ شور نہ ہمیں پریشان کرتا تھا اور نہ ہماری باتوں میں حارج ہوتا تھا۔ ہم ویسے بھی زبان سے بہت ہی کم باتیں کرتے تھے۔ زیادہ گفتگو اشاروں کنایوں میں ہوتی تھی۔

جوں جوں رات آ رہی تھی۔ ہوا کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اب سمندر کی طرف سے شوریدہ سر موجوں کا چٹانوں سے ٹکرانے کا شور بھی آ رہا تھا۔ فرائی ڈے نے لکڑی کی پلیٹ یں بکری کے گوشت کے بھنے ہوئے قتلے ڈال کر میرے آگے رکھے۔ میں نے دو تین قتلے کھائے اور اپنے گھٹنے پر بکری کی چربی کا تیل ملنے لگا۔ میرے گھٹنے کو اس وقت چوٹ لگ گئی تھی جب کشتی کو شارک مچھلی نے ٹکر ماری تھی۔ فرائی ڈے نے آگ کے آگے پتھر کی سل رکھ دی کیونکہ کیبن

کے اندر تیز ہوا کے جھونکے شعلوں کو پریشان کر رہے تھے۔ اور آگ لگ جانے کا خطرہ تھا۔ ہواؤں نے کیبن سے باہر تیز چلنا شروع کر دیا تھا۔ گھنے درخت زور زور سے آواز پیدا کر کے جھول رہے تھے۔ بادل یوں گرج رہے تھے۔ جیسے ابھی آسمان پھٹ پڑے گا۔ بجلی چمکتی تو سارے جزیرے پر ایک پل کے لئے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی ہو جاتی۔ بارش کے قطرے ایک آبشار کی طرح گر رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد کیبن کی چھت ٹپکنے لگی۔ فرائی ڈے نے لکڑی کی ایک کھپچی اٹھائی۔ اور اسے اندر سے چھت کے سوراخ کے اُوپر جا کر جڑ دیا۔

اس سے ٹپکا تو بند ہو گیا۔ مگر اب نئی مصیبت پیدا ہو گئی۔ ہوا نے طوفان کی شکل اختیار کر لی تھی اور وہ ہمارے کیبن کو تھپیڑے مار رہی تھی۔ چونکہ میرا کیبن ایک طرف سے چٹان کے سوراخ میں پھنسا ہُوا تھا، اس لئے اس کے ٹوٹنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ مگر یہ اندیشہ ضرور تھا کہ وہ ہوا میں اڑ نہ جائے۔ کیونکہ زمین میں اس کی دیواروں کی بنیاد زیادہ گہری نہیں تھی۔ ابھی میں یہ سوچ رہا تھا۔ کہ طوفان کے ایک زوردار جھکڑ نے دیوار کی لکڑی اوپر اٹھی۔ ہم نے اٹھ کر اسی وقت دیوار کے ساتھ تخت پوش کو درخت کی ایک ٹوٹی ہوئی شاخ کو یوں لگا دیا کہ سارا زور ان پر ہی پڑے۔ طوفان بڑے زور کا تھا۔ ہواؤں اور بارش نے سارے جزیرے کو ہلا کر رکھ دیا تھا سمندر کی بھری ہوئی موجیں ساحل کے اندر تک گھس آئی تھی۔ اور کئی درختوں کو انہوں نے جڑوں سے اکھاڑ کر پھینک دیا تھا۔

ہمیں یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں ہمارے اوپر والا گھنا درخت کیبن کی چھت پر ٹوٹ کر نہ گر پڑے کیونکہ ایسی صورت میں کیبن کا پاش پاش ہو جانا یقینی تھا۔ پھر ہماری زندگیوں کو بھی خطرہ تھا۔ فرائی ڈے نے میرے حکم پر آگ بجھا دی۔ میں نے سیڑھی کی مدد سے دیوار کے اوپر چڑھ کر درخت کو دیکھا۔ وہ کسی پاگل آدمی کی طرح زور زور سے تیز ہوا میں جھول رہا تھا۔ درخت کافی بڑا اور مضبوط تھا۔ اس لئے میرے خیال کے مطابق اس کے ٹوٹنے کا اندیشہ کچھ کم ہی تھا۔ اس وقت کوئی تدبیر بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اب تو ہم صرف خدا کے رحم و کرم پر تھے۔ اگر درخت ٹوٹ کر کیبن کی چھت پر گر بھی پڑتا۔ تو ہم اسے روک نہیں سکتے تھے۔ میں اس لئے بھی زیادہ نہیں گھبرا رہا تھا۔ کہ اس قسم کے سمندری طوفان میں اس جزیرے پر جب سے آیا تھا۔ بہت دیکھ

[چکا] تھا۔ تاہم اس طوفان کے تیور کچھ بگڑے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ہم نے وہ تمام چیزیں [جن] کے بھیگنے کا خطرہ تھا۔ چٹان کی کھوہ کے اندر چھپا دی تھیں رات کافی گذر گئی تھی۔ سمندری [ط]وفان ایک ہی رفتار سے چل رہا تھا۔ درخت جھوم رہے تھے تیز بارش کی بوچھاڑیں چھت اور [د]یواروں سے ٹکرا رہی تھی۔ بجلی رہ رہ کر کوند رہی تھی۔ بادل زور زور سے گرج رہے تھے [س]مندر کی طرف سے بپھری ہوئی لہروں کا چٹانوں سے ٹکرانے کا ہیبت ناک شور بلند ہو رہا تھا۔ نیند ہم میں سے کسی کو نہیں آ رہی تھی۔

فرائی ڈے نے مجھے کہا۔

"ماسٹر! سو جاؤ! میں پہرہ دیتا ہوں۔"

مگر میں نے کہا۔

"نہیں فرائی ڈے۔ مجھے نیند نہیں ہے۔"

آدھی رات کو طوفان کا زور کم ہو گیا۔ فرائی ڈے گہری نیند سو چکا تھا اور ہلکے ہلکے خراٹے لے رہا تھا۔ میں بھی اب اونگھنے لگا تھا۔ پھر مجھے بھی نیند آ گئی اور میں سو گیا۔ میری آنکھ کھلی تو دن چڑھ آیا تھا۔ صبح کی دھندلی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ کیونکہ آسمان ابھی تک بادلوں میں گھرا ہوا تھا۔ لیکن بارش اور ہواؤں کا شور تھم چکا تھا۔

میں نے فرائی ڈے کو جگایا۔

"اٹھو! طوفان گذر گیا۔"

فرائی ڈے نے آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اور پھر خوش ہو کر بولا۔

"گڈ مارننگ"

یہ صبح شام کی سلام میں نے فرائی ڈے کو سکھا رکھی تھی۔ وہ ناشتہ تیار کرنے لگا اور میں کیبن سے باہر نکل آیا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ رات کے طوفان نے جزیرے پر کیا تباہی مچائی ہے۔ میں نے دیکھا کہ کئی درخت ٹوٹ کر گر پڑے تھے۔ سمندر میں سے لاتعداد سیب اور گھونگھے ریت پر بکھرے پڑے تھے۔ چٹانوں کے پاس میں نے دو تین شارک مچھلیوں کو دیکھا جو ریت پر مردہ پڑی تھیں۔ رات کا طوفان کافی زبردست تھا۔ اس نے سارے جزیرے

کوایک بار تو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ واپس آیا تو فرائی ڈے نے ناشتا تیار کر رکھا تھا۔ ناشتے کے بعد ہم نے کیبن کی ضروری مرمت شروع کر دی۔ دیوار دو تین جگہوں پر سے ہل گئی تھی۔ وہاں نئے لکڑی کے تختے کاٹ کر پھنسا دیئے تھے۔ چھت پر چڑھ کر اس کی چھوٹی موٹی مرمت کی گئی۔ شام تک ہم یہی کام کرتے رہے۔ شام کا کھانا ہم نے کیبن کے اندر بیٹھ کر کھایا۔ اس کے بعد میں پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گیا اور ڈوبتے سورج کی سنہری روشنی میں دور سمندر کو تکنے لگا سمندر کی لہروں میں رات کے طوفان کے بعد اب سکون آ گیا تھا۔ سونے کی ایک شاہراہ جزیرے سے ڈوبتے سورج تک پھیل گئی تھی۔

جس جہاز کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے میں چوٹی پر چڑھا کرتا تھا۔ وہ مجھے کہیں نظر آ رہا تھا۔ خدا جانے وہ کون سا بادبانی جہاز تھا۔ جو ایک روز پہلے مجھے دکھائی دیا تھا کیونکہ یہ جزیرہ کسی بھی سمندری تجارتی شاہراہ پر واقع نہیں تھا۔ ادھر سے کسی جہاز کے گذرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ویسے بھی اس جزیرے کے ارد گرد سمندر میں بے شمار چٹانیں ابھری ہوئی تھیں جو جہاز کے لئے بے حد خطرناک تھیں۔ تو پھر وہ بادبانی جہاز کہاں سے آ کر کدھر جا رہا تھا کیا وہ میرا وہم تو نہیں تھا؟ کیا میری تشنہ اُمیدوں نے ایک جہاز کو مجسم کر کے میری آنکھوں کے سامنے سمندر میں تو لا کر کھڑا نہیں کر دیا تھا؟ ضرور ایسا ہی ہوا ہو گا۔ کیونکہ ادھر کوئی جہاز کبھی نہیں آیا تھا۔ سالہا سال سے تو میں نے اِدھر سے کسی جہاز کو گذرتے نہیں دیکھا تھا۔ میں بوجھل دل لئے واپس کیبن میں آ گیا۔

تین برس مزید گذر گئے۔ اب مجھے اس جزیرے پر آئے ہوئے تیس برس ہو گئے تھے۔

میں اب لندن کے گلی کوچوں اور اپنے باپ کی شکل کو کچھ کچھ بھولتا جا رہا تھا۔ یہ شکلیں آنکھوں کے آگے مدھم ہوتی جا رہی تھیں۔ فرائی ڈے کو اب میں نے اتنی انگریزی سکھا دی تھی۔ کہ وہ مجھ سے اپنا مطلب اور مفہوم بیان کر دیتا تھا۔ میں نے بھی اس کی وحشی زبان کچھ کچھ سیکھ لی تھی۔ اس کی زبانی مجھے اتنا معلوم ہو چکا تھا۔ کہ یہ جزیرہ ٹرینی ڈاڈ کی خلیج اور نوکو میں واقع ہے۔ فرائی ڈے نے انگریزی زبان سیکھنے کے بعد مجھے بتایا کہ ان کے قبیلے کا جزیرہ وہاں سے تھوڑی دور رہی ہے۔

"ماسٹر! ہمارا قبیلہ ایک پرانا آدم خور قبیلہ ہے۔ ہم لوگ باہر سے آنے والے کسی انسانی کو زندہ نہیں چھوڑتے۔ گوری چمڑی والے کو بڑے شوق سے کھاتے ہیں ایک بار کوئی جہاز طوفان میں راستہ بھول کر ہمارے جزیرے پر آ لگا۔ میں ان دنوں چھوٹا تھا۔ ہمارے قبیلے والوں نے جہاز کے سارے عملے کو پکڑ لیا۔ پھر ایک آدمی کو روزانہ قتل کر کے آگ پر بھون کر کھایا جاتا۔ اس طرح کوئی پندرہ بیس روز تک یہ تقریب جاری رہی۔"

میں نے فرائی ڈے سے پوچھا کہ کیا اس نے بھی کبھی کسی انسان کا گوشت کھایا ہے؟ اس نے کچھ شرما کر کہا

"ماسٹر! میں نے ایک دو بار ہی انسان کا بھنا ہوا گوشت کھایا ہے۔ یا پھر اس روز اپنے دشمن کا کلیجہ چبایا تھا۔ لیکن شوق سے نہیں۔ بلکہ انتقام کے جوش میں۔ مجھے اور میرے باپ کو شروع ہی سے انسانی گوشت سے نفرت رہی ہے یہی وجہ تھی کہ قبیلے کے دوسرے لوگ میرے باپ کے دشمن بن گئے وہ انہیں انسانوں کو قتل کر کے ان کا گوشت کھانے سے منع کرتا تھا۔ آدم خوروں نے دوسرے قبیلے کے سردار سے ساز باز کر کے میرے باپ کو قتل کر کے ہڑپ کر لیا اور مجھے گرفتار کر کے اس جزیرے پر بھون کر کھانے کے لئے لائے تھے کہ تم نے مجھے بچا لیا۔"

ں نے پوچھا۔

"وہ لوگ تمہیں اس جزیرے پر کیوں لائے تھے؟"

رائی ڈے کہنے لگا۔

"ہمارے قبیلے میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو میرے باپ کے وفادار تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میرے باپ کو بھون کر کھایا جائے۔ لیکن باغی سردار ایسا کر گذرا۔ اب وہ چاہتے تھے کہ مجھے بھون کھانے کی بجائے کسی کشتی میں بٹھا کر کھلے سمندر میں چھوڑ دیا جائے۔ باغی سردار یہ نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اپنے خاص آدمیوں سے ساز باز کی کہ وہ مجھے ساتھ والے جزیرے میں سے جا کر بھون کر کھا جائیں اور قبیلے میں یہی

مشہور کر دیا جائے کہ مجھے کھلے سمندر میں جلاوطن کر دیا گیا ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"تمہارا کوئی اور بھائی زندہ ہے؟"

"نہیں ماسٹر۔" فرائی ڈے نے کہا۔ "میرے سارے خاندان کو مار کر آدم خور وحشی ہڑپ کر گئے ہیں۔ جزیرے پر سرداری کا اصل حق میرا ہے۔ مگر میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا اگرچہ جزیرے پر میرے کچھ وفادار لوگ موجود ہیں۔ لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔"

میں نے فرائی ڈے سے کہا کہ اگر ہمارے پاس بہت سی طاقت جمع ہو گئی تو فکر نہ کرو۔ ایک دن فوج لے کر تمہارے جزیرے پر حملہ کریں گے اور جزیرہ فتح کر کے تمہیں وہاں کا سردار بنا دیں گے۔ فرائی ڈے زور سے ہنس پڑا۔

"نہیں ماسٹر! یہ خواب کی بات ہے۔ ایسا بھلا کہاں ہو سکتا ہے۔"

پھر وہ حیران ہو کر بولا۔ "ماسٹر! تم بڑے بہادر ہو۔ تم نے زندگی کے تیس برس اس ویران جزیرے پر بسر کر دیئے ہیں۔ اگر کوئی تمہاری جگہ دوسرا ہوتا تو اپنے آپ کو سمندر میں گرا کر ہلاک کر چکا ہوتا۔"

میں نے تمباکو کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"فرائی ڈے! میرے بھائی! میں سمجھ گیا تھا۔ کہ اب باقی ساری زندگی اسی جزیرے پر بسر ہو گی۔ کیونکہ ادھر کبھی کوئی جہاز نہیں آئے گا۔ اس فیصلے نے میرے اندر زندگی کی آخری گھڑیوں تک زندہ سلامت رہنے کی طاقت پیدا کر دی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ میں نے دل میں شمع امید روشن رکھی ہے۔ مجھے یقین تھا ایک نہ ایک روز کوئی نہ کوئی بادبانی جہاز اس جزیرے کی طرف سے بھی گذرے گا جو مجھ جلاوطن کو اٹھا کر واپس انگلستان لے جائے گا۔ مگر ایسا تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس جزیرے پر زندگی کے تیس برس گذر جائیں گے۔ اور کوئی جہاز اس طرف سے نہیں گزرے گا۔ خدا جانے وہ بادبانی جہاز ادھر کیسے

نکل آیا تھا۔ جس نے ہماری طرف کوئی توجہ نہ دی اور دور ہی سے گذر گیا۔"

میں نے فرائی ڈے سے پوچھا کہ کیا وہ اپنے جزیرے میں واپس جانا چاہتا ہے؟ اس نے سوچ کر سر جھکا لیا۔ پھر سر اٹھا کر بولا۔

"ماسٹر اب میرا اس جزیرے پر کوئی نہیں ہے۔ نہ ماں نہ باپ۔ نہ بھائی نہ بہن۔ سب مر کھپ گئے۔ دشمنوں نے انہیں ختم کر دیا۔ ہاں کچھ وفادار ساتھی ضرور ہیں۔ مگر وہ بے اثر ہیں۔ ان کی کوئی آواز نہیں ہے۔ اب میں واپس جزیرے میں جا کر کیا کروں گا؟ ہاں ایک جذبہ، ایک خیال دل میں ضرور ہے کہ اپنے دشمنوں سے بدلہ لے سکوں۔ کسی روز ایک فوج لے کر وہاں جاؤں اور سردار کو قتل کر کے اپنے ماں باپ بہن بھائیوں کے قتل کا انتقام لے سکوں۔"

میں نے کہا۔ "فرائی ڈے! اگر ہم ایک بڑی سی کشتی بنا کر اس جزیرے سے خدا کا نام لے کر چل پڑیں تو کسی نہ کسی روز ٹرینی دار کے ساحل پر ضرور جا لگیں گے۔ تم ساری نشانیاں اسی سمندر کی بیان کر رہے ہو۔ کیا خیال ہے؟ اگر ہم ٹرینی دار پہنچ گئے تو پھر ایسا ہو سکتا ہے کہ وہاں ہم کام کر کے پیسہ کمائیں اور پھر کرائے کے سپاہی بھرتی کر کے ان کو اسلحہ دے کر تمہارے آبائی جزیرے پر حملہ کر کے اسے فتح کریں۔ اور باغی سردار کو قتل کر کے تمہاری بادشاہت تمہیں واپس دلائیں کیا خیال ہے؟"

فرائی ڈے کچھ سوچ کر بولا

"ماسٹر! کرائے کے سپاہی بھرتی کر کے حملہ کرنے کا خیال بڑا مشکل لگتا ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے۔ کہ اگر ہم کوشش کر کے ایک بڑی کشتی بنا کر کھلے سمندر میں نکل چلیں تو تمہیں اس عمر قید سے ضرور رہائی مل سکتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "تو پھر کیا خیال ہے۔ کل سے کشتی بنانا شروع کر دیں؟"

"ہاں! میں تیار ہوں۔"

رات اسی قسم کے منصوبے بناتے بناتے ہم سو گئے۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں لندن واپس پہنچ چکا ہوں۔ میرے سونے سے بھرے ہوئے صندوق جہاز پر سے اتارے جا رہے ہیں

ایک ہجوم میرے خیر مقدم کے لئے بندرگاہ پر کھڑا ہاتھ ہلا ہلا کر تالیاں بجا کر مجھے خوش آمدید کہہ رہا ہے۔ اخباری نمائندے مجھے گھیرے ہوئے ہیں۔ میرا باپ میرے پاس کھڑا ہے اور مجھے گلے لگا کر پیار کر رہا ہے۔ میں جزیرے سے بے پناہ دولت لے کر واپس لندن پلٹا ہوں۔ پھر میری آنکھ کھل گئی۔ صبح ہو رہی تھی۔ فرائی ڈے گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا۔ میں نے فرائی ڈے کو جگایا اور کہا

"فرائی ڈے! میری ابھی نیند پوری نہیں ہوئی۔ میں ابھی کچھ دیر سوؤں گا۔ تم ایسا کرو کہ کیبن سے کلہاڑا لے کر جنگل میں جاؤ اور کوئی ایسا مناسب درخت دیکھ کر اس پر نشان لگا دو جس کی کشتی بنا کر ہم یہاں سے کوچ کر سکیں۔"

فرائی ڈے نے کلہاڑا پکڑا اور رسی کو سیڑھی لگا کر کیبن سے باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی میں دوبارہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ مجھے سوئے بمشکل آدھ گھنٹہ ہوا ہو گا کہ گولیوں کے دھماکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ سب سے پہلے میں نے اپنی بندوق اور پستول کو دیکھا۔ وہ اپنی جگہ پر رکھی ہوئی تھیں۔ پھر یہ بندوق جزیرے میں کس نے چلائی؟ کیا کوئی فوج یہاں آ گئی ہے؟ میں خوشی سے کھل اٹھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں اس جزیرے سے رہا ہو کر جا سکتا تھا۔ میں آزاد ہو سکتا تھا۔ اتنے میں فرائی ڈے سیڑھیاں اتر کر ہانپتا ہوا میرے پاس آ کر بولا

"ماسٹر! ماسٹر! دو کشتیوں پر سمندری ڈاکو آئے تھے۔ انہوں نے تین گورے گورے ملاحوں کو ساحل پر لا کر گولی سے اڑا دیا اور پھر واپس چلے گئے۔"

میں تیزی سے اٹھا اور کیبن کی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا فرائی ڈے کے ساتھ بھاگتا ساحل پر آ گیا۔ سب سے پہلی چیز جو مجھے نظر آئی وہ ایک سیاہ بادبانوں والا بحری ڈاکوؤں کا جہاز تھا جو ساحل سے کافی دور سمندر میں کھڑا تھا۔ لیکن جس کے مستول پر کھوپڑی والا سمندری قزاقوں کا سیاہ جھنڈا دور سے لہراتا صاف نظر آ رہا تھا۔ دو کشتیاں ساحل چھوڑ کر بڑی تیزی سے واپس جہاز کی طرف جا رہی تھیں۔ ان کشتیوں میں سمندری ڈاکو بیٹھے تھے۔ انہوں نے سروں پر نیلے لال رومال باندھے ہوئے تھے اور دھوپ میں ان کے کانوں کے سنہری مندرے دور سے چمک رہے تھے۔ آزادی کی تڑپ نے مجھے بے چین اور بے تاب کر دیا۔ مجھے ایک

ے لئے بھی یہ خیال نہ آیا کہ یہ بحری قزاق ہیں اور یہ تو کسی بھی اجنبی کو اپنے جہاز پر آنے جازت نہیں دیتے اور اسے بے دریغ ہلاک کر ڈالتے ہیں۔ میں نے دونوں ہاتھ اٹھا ور زور سے چلاتے ہوئے سمندر کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ میں انہیں مدد مدد کہہ کر ر رہا تھا۔ ڈاکوؤں کی کشتیاں ساحل سے دور جا چکی تھیں۔

فرائی ڈے بھی میرے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ سمندری ڈاکوؤں نے دو وحشی سے انسانوں شاید ریت پر بھاگتے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے دور سے فائرنگ شروع کر دی۔ فرائی ڈے دھکا دے کر مجھے ریت پر گرا لیا۔ ڈاکوؤں کی گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے گزر رہی ہیں۔ آزادی کی تڑپ اتنی شدید تھی کہ میں نے فرائی ڈے پرے گرا کر دوبارا سمندر کی طرف اگنا شروع کر دیا۔ اب میں گھٹنے گھٹنے سمندری لہروں میں داخل ہو چکا تھا۔ اور مسلسل ہاتھ ہلا لا کر آوازیں دے رہا تھا

"مجھے بھی اس جہنم سے لے چلو! میں تیس برس سے یہاں زندہ در گور ہوں۔ مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ مجھے جہاز پر لے جا کر گولی مار دو۔ مگر اس جزیرے سے نکال کر لے چلو۔ ایک بار مجھے جہاز کے تختے پر اپنے پاؤں رکھ لینے دو۔"

دور سمندری ڈاکوؤں کے قہقہوں کی آوازوں کے ساتھ کچھ پستول چلے اور خدا جانے اس کی گولیاں کہاں جا کر گریں۔ پھر وہ لوگ اپنے جہاز پر سوار ہو گئے۔ رسوں کی مدد ے کشتیوں کو اوپر اٹھا لیا گیا۔ اور بدنصیب آنکھوں کے سامنے جہاز نے لنگر اٹھایا اور وہ واپس روانہ ہو گیا۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا اور وہ میرے دیکھتے دیکھتے سمندر کے سینے پر اتنی دور چلا گیا۔ کہ بس اب ایک سیاہ دھبہ سا نظر آنے لگا۔ فرائی ڈے مجھے تھام ر واپس ساحل پر لے آیا۔ میرا دل صدمے سے بیٹھا جا رہا تھا۔ قسمت میرے ساتھ بڑا بھیانک مذاق کر رہی تھی۔ جہاز ساحل پر آتے تھے اور مجھے آزادی کی جھلک دکھا کر ہمیشہ کے لئے میری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے تھے۔ فرائی ڈے یہ کہہ کر مجھے پھر سے ہوش میں ے آیا کہ ساحل کی ریت پر تین گوری رنگت والے مردہ پڑے ہیں۔ مجھے اب یاد آیا کہ ان ڈاکوؤں نے تین آدمیوں کو جزیرے کے ساحل پر لا کر گولی مار دی تھی۔

میں تیز تیز چلتا ہوا تین لاشوں کے پاس آیا جو ریت پر پڑی تھیں۔ یہ سفید فام تھے اور شکل وصورت سے انگریز معلوم ہوتے تھے۔ ان میں سے دو تو مر چکے تھے۔ گولیاں ان کے دل کے پار ہو گئی تھی۔ البتہ ایک جہازی میں ابھی کچھ سانس باقی تھے۔ میں اس پر جھک گیا۔ میں نے اُس سے پوچھا۔

"کیا تم انگریز ہو؟"

یہ سرخ بالوں اور مڑی ہوئی ناک والا ایک صحت مند ملاح تھا۔ جس نے کپتان کی وردی پہن رکھی تھی اس کی ساری وردی خون میں لت پت تھی۔ سمندری ڈاکوؤں کی گولیاں اس کے پیٹ میں سے گزر گئی تھیں۔ اس میں ابھی کچھ سانس باقی تھے۔ اس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں بتایا کہ وہ فرانسیسی جہاز کا کپتان ہے۔ اس کے جہاز پر بحری ڈاکوؤں نے حملہ کرکے اسے ڈبو دیا۔ سارا مال لوٹ کر اپنے جہاز پر ڈال لیا۔ سارے مسافروں کو جہاز کے ساتھ ہی سمندر میں غرق کر دیا وہ مر رہا تھا۔ میں نے چلا کر اس سے پوچھا

"یہ جزیرہ کس خلیج میں ہے؟ کیا یہ ٹرینی داد کی خلیج ہے؟"

فرانسیسی کپتان نے آہستہ سے اثبات میں گردن ہلائی اور پھر اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ وہ مر چکا تھا۔ ایک بات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ کہ یہ ٹرینی داد کی خلیج ہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر میں ہمت کرکے سمندر میں نکل پڑوں تو ایک نہ ایک روز ٹرینی داد پہنچ سکتا ہوں۔ میں نے فرائی ڈے سے کہا۔

"ان لاشوں کی تلاشی لو۔ شاید کوئی کار آمد شے مل جائے۔"

ان تینوں کی وردیوں کے اندر پستول لگے تھے اور گولیوں کی پیٹیاں بھی بندھی ہوئی تھیں۔ کمال کی بات یہ تھی۔ کہ ڈاکوؤں نے ان گولیوں اور پستولوں کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ ہم نے ان کی جیبوں کی تلاشی لی۔ ایک چاقو۔ ایک پنسل۔ سگریٹوں کا ایک پیکٹ اور ایک بڑی دیا سلائی کی ڈبیا برآمد ہوئی۔ یہ ساری چیزیں اپنے قبضے میں کرنے کے بعد ہم نے ان کے کپڑے اُتارنے گوارا نہ کئے اور انہیں اسی طرح وردیوں میں پورے اعزاز کے ساتھ ساحل کی ریت میں دفن کر کے اوپر درختوں کی صلیبیں گاڑ دیں۔ کیبن میں آکر میں نے تینوں پستول اور گولیاں سنبھال کر رکھ

ں۔ یہ کافی زیادہ گولیاں تھیں۔ سگریٹ ہم نے ایک ایک سلگا لیا۔ بڑا خوشبودار سگریٹ ا۔ اس کے دھوئیں کی مہک سے مجھے لندن کی مہک یاد آ گئی اور دل اداس ہو گیا۔ پنسل ر چاقو بھی میں نے سنبھال کر رکھ لیا۔ میں نے فرائی ڈے سے کہا کہ میرا اندازہ درست تھا۔ اگر بڑی کشتی میں سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہوں تو ٹرینی داد ضرور پہنچ سکتے ہیں۔ فرائی ڈے بتایا کہ اس نے ایک درخت کو کشتی کے لئے چن کر اس پر نشان لگا دیا ہے۔

ہم نے اگلے دن درخت کو کاٹنا شروع کر دیا۔ شام کو درخت جڑ سے کٹ کر زمین پر آن ا۔ اب اس کو کاٹ کر اس کے تختوں سے ایک کشتی تیار کرنی تھی جس میں سوار ہو کر ہم اس زیرے سے نجات حاصل کرنے کا منصوبہ تیار کر چکے تھے۔ ہمیں کشتی پر کام کرتے ہوئے ایک ہفتہ لذر گیا اوزار نہ ہونے کی وجہ سے کام کی رفتار بڑی سست تھی۔ لوہے کے کیلوں کی جگہ ہم لکڑی کی میخیں بنا کر ٹھونک رہے تھے۔ فرائی ڈے میرے ساتھ پوری محنت اور جانفشانی سے کام کر رہا تھا۔ ایک مہینہ گذر گیا۔ کشتی آدھی سے زیادہ مکمل ہو چکی تھی۔ ہم نے اس میں ڈھلوانی چھت کا سائبان بھی بنایا۔ تاکہ بارش سے بچ سکیں۔ اور دھوپ سے بھی محفوظ رہا جا سکے۔ جن لوگوں نے سمندروں میں سفر کیا ہے۔ وہ سمندر کی گرم دوپہر سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ جب دھوپ کی چمک ناقابل برداشت ہو جاتی ہے اور پانی سے گرم بخارات اُٹھتے ہیں۔ فرائی ڈے مجھ سے بھی پہلے صبح صبح اٹھ کر کام سے جٹ جاتا۔ وہ اس جزیرے سے نجات حاصل کرکے کسی ماڈرن شہر کو دیکھنے کا بہت شوقین تھا۔ وہ بھی میری طرح اپنی پہلی فرصت میں اس جزیرے سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ سارا دن وہ بڑی توجہ سے کام میں لگا رہتا۔

ایک روز کا ذکر ہے۔ فرائی ڈے نے تھوڑی سی روٹی کھائی۔ بکری کے دودھ کا ایک پیالہ پیا اور تیر کمان گلے میں لٹکا کر کشتی کی تیاری کے لئے کیبن سے نکل کھڑا ہوا۔ میں رات بھر کی گشت کا تھکا ہوا تھا۔ ابھی تک تخت پر لیٹا نیند کے عالم میں تھا۔ میں نے ایک آنکھ کھول کر فرائی ڈے کو کام پر جاتے دیکھا۔ اس نے اُونچی آواز میں کہا۔

"گڈ مارنی!"

یں نے ایک ہاتھ اٹھا کر اسے سلام کا جواب دیا۔ میری آنکھیں نیم وا تھیں اور میں نیم
خوابی کے عالم میں تھا۔ فرائی ڈے چلا گیا۔ اس نے باہر سے رسی کی سیڑھی اچھال کر اندر پھینک دی
میں پھر سو گیا۔ کوئی گھنٹہ بھر سویا ہوں گا۔ کہ چڑیوں اور طوطے کے شور سے میری آنکھ کھل
گئی خاص طور پر میرے طوطے نے مجھے سوتا دیکھ کر بہت شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ میں
ملتا ہوا اٹھ بیٹھا اور طوطے کو ڈبل روٹی اور خشک انگور دیئے اب معلوم ہوا کہ اسے بھوک لگ
تھی اور وہ خشک انگوروں کا ناشتہ کرنا چاہتا تھا۔ پھر میں نے بھی تھوڑا بہت ناشتہ کیا
اپنے کتے کو روٹی اور دودھ ڈالا پستول اور دوربین گلے میں لٹکا کر کیبن سے باہر نکل آیا۔ باہر
آ کر میں نے سیڑھی کو ایک طرف درخت کے ساتھ باندھ دیا۔ آج طبیعت کچھ سست تھی او
کام کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا مجھے معلوم تھا کہ فرائی ڈے کشتی کے تختے جوڑ رہا ہوگا اور میرا انتظ
ہو گا۔ میں نے سوچا کہ اسے جا کر کہہ دینا چاہیئے کہ بھائی میرا آج کام کرنے کا موڈ نہیں ہے۔ بس
تو اکیلا ہی کام کئے جا۔ چنانچہ اس خیال کے ساتھ میں اس گھنے درخت کی طرف چل دیا جس
کی چھاؤں میں درخت کاٹ کر کشتی بنائی جا رہی تھی۔ وہاں فرائی ڈے نہیں تھا۔ ہر شے اپ
جگہ پر ویسی کی ویسی پڑی تھی۔ میں نے یہ سوچ کر کہ وہ چشمے پر پانی پینے گیا ہو گا۔ لکڑیو
میں میخیں ٹھونکنا شروع کر دیں۔ کوئی گھنٹہ بھر گزر گیا۔ فرائی ڈے واپس نہ آیا۔ اب مجھے
تشویش ہوئی کہ وہ کہاں چلا گیا۔

میں چشمے پر آیا۔ وہاں وہ نہیں تھا۔ میں واپس کیبن میں آیا کہ کہیں یہاں کوئی شے لینے
نہ آ گیا ہو۔ کیبن بھی خالی پڑا تھا۔ اب تو مجھے بڑا فکر لگا۔ میں نے گھوم پھر کر سارے جزیرے
میں اسے تلاش کیا۔ اُسے اُونچی اُونچی آوازیں بھی دیں۔ جنگل میں سوائے میری بازگشت
کے اور کوئی جواب نہ ملا۔ میں پریشان سا ہو گیا۔ یا خدا! فرائی ڈے کہاں چلا گیا؟ میں
مغربی کنارے ریت پر چل رہا تھا کہ اچانک میں نے وہاں تازہ قدموں کے نشان دیکھے
میرا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ نشان چھ سات آدمیوں کے تھے اور بالکل تازہ تھے۔ پہلے یہ
نشان جنگل کی طرف گئے تھے۔ دفعتاً ایک خیال بجلی کی طرح میرے دماغ میں چمکا۔ کہیں
فرائی ڈے کو آدم خور وحشیوں نے تو اغوا نہیں کر لیا۔

میرا شک یقین میں بدل گیا۔ میں نے ان قدموں کے نشان میں فرائی ڈے کے پاؤں کا نشان
ن لیا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا۔ کہ اسے زبردستی گھسیٹ کر لے جایا جا رہا تھا۔ لیکن فرائی ڈے
چیخ مار کر مجھے مدد کے لئے کیوں نہیں بلایا؟ ضرور آدم خوروں نے اس کا منہ بند رکھا ہوگا
ارے پر کشتی کے گھسٹنے کا نشان بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ مجھے بڑی پریشانی ہوگئی فرائی ڈے
اغوا میرے لئے ایک بے حد تکلیف دہ حادثہ تھا۔ وہ لوگ تو اسے کسی حالت میں بھی
ندہ نہیں چھوڑیں گے۔ خدا جانے انہوں نے اسے اس جزیرے پر قتل کیوں نہیں کیا؟ وہ تو
ڑی آسانی سے اس کی گردن اڑا کر اس کے ٹکڑے کر کے بھون کر کھا سکتے تھے مگر شاید انہوں
نے اس لئے آگ نہیں جلائی کہ مجھے خبر ہو گئی۔ تو میں دھماکے والی بندوق لے کر ان کے آدمیوں
کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ میں فوراً کیبن میں آ گیا۔ میں نے رسی کی سیڑھی اندر کھینچ
لی۔ اور کونے میں بیٹھ کر غور کرنے لگا کہ اب کیا کیا جائے۔

غور کرتے کرتے سہ پہر ہو گئی۔ میں نے تھوڑی سی ڈبل روٹی زہر مار کی اور باہر نکل کر
سمندر کے کنارے ٹہلنے لگا۔ طوطا میری گردن پر بیٹھا تھا۔ کتا میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا
میرے گلے میں پستول اور دوربین لٹک رہی تھی۔ پیٹی میں شکاری چاقو تھا۔ سر پر بکری
کی کھال سے بنی ہوئی چھتری تان رکھی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے میں اس نشان کے پاس آ گیا جس پر میں
نے لکڑی کی صلیب پر دنوں کے نشان اور اپنے پہلی بار اس منحوس جزیرے پر آنے کی تاریخ
لکھ رکھی تھی۔ موسم کے اثرات نے لکڑی کی صلیب کو خستہ حالت میں کر دیا تھا میں نے اس
صلیب پر اپنی ایک پرانی پتلون بھی لٹکا رکھی تھی۔ سمندر کی تیز ہوا میں لہرا لہرا کر اس کے پھوسڑے
اڑ گئے تھے۔ یہ اس خیال سے لٹکا رکھی تھی کہ اگر خوش قسمتی سے کسی گزرتے جہاز ران کی اس
پر نظر پڑ جائے تو وہ میری مدد کو یہاں آ جائے۔ لیکن میری قسمت اتنی اچھی نہیں تھی شاید کہ
کوئی جہاز میری مدد کو یہاں پہنچتا۔ ایک جہاز نظر آیا تو وہ ادھر کا رخ کئے بغیر آگے نکل گیا
دوسرا جہاز آیا تو وہ بحری ڈاکوؤں کا تھا جس نے مجھ پر بھی گولیاں چلا کر مجھے ہلاک کرنے
کی پوری پوری کوشش کی تھی۔

میں سمندر کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ سمندر دور تک ویران تھا۔ چھوٹی چھوٹی

لہریں دور دور سے آکر ساحل کی ریت کو چوم کر واپس جا رہی تھیں۔ میری آنکھوں میں فرائی ڈے کی شکل گھوم رہی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ آدم خور اس کو آگ پر بھون کر کھا رہے ہیں میں ایک دم سے اٹھ کھڑا ہو گیا میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اس ڈرامے کا ایک خاموش تماشائی نہیں بنوں گا۔ بلکہ جس طرح سے بھی ممکن ہوا فرائی ڈے کی مدد کروں گا۔ اس کی جان بچاؤں گا۔ میں نے غور کرنا شروع کر دیا کہ مجھے اپنے دوست کی جان بچانے کے لئے کیا کرنا چاہیئے؟ میرے پاس پستولیں اور بندوق تھی جس کا مقابلہ وحشی لوگ نہیں کر سکتے تھے۔ تو کیا میں کشتی لے کر آدم خوروں کے جزیرے پر جاؤں اور فرائی ڈے کو ان کے چنگل سے بچا کر لاؤں؟

فرائی ڈے کو بچانے کا صرف یہی ایک طریقہ ہو سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا۔ کہ میں فرائی ڈے کی مدد کرنے اس کے جزیرے پر جاؤں گا۔ اور آدم خور وحشیوں کا مقابلہ کر کے اسے ان کے پنجے سے چھڑا کر لاؤں گا۔ میں فوراً کیبن میں آگیا۔ میں نے جزیرے سے روانگی کے لئے رات کا وقت چنا۔ وہ راتیں تاریک تھیں۔ اور چاند نہیں نکلا کرتا تھا۔ میرے لئے ایسی ہی رات موزوں تھی کہ جس میں کوئی مجھے سمندر پر کشتی میں نہ دیکھ سکے۔ کیبن میں آکر میں نے ضروری تیاری شروع کر دی پانچوں کے پانچوں پستول گولیوں سے بھر کر گلے میں لٹکا لئے۔ بندوق بھی بغل میں دبا لی۔ دوربین بھی ساتھ رکھ لی اور اپنی چھوٹی سی کشتی میں بیٹھ کر سمندر میں بہہ نکلا۔ میں رات کی دھیمی دھیمی روشنی اور اندھیرے میں جزیرے کے شمال مغرب کی طرف کشتی کھے رہا تھا۔ یہی وہ سمت تھی جدھر سے آدم خور وحشی آیا کرتے تھے۔ فرائی ڈے نے بھی اس سمت کو اشارہ کر کے مجھے بتایا تھا کہ وہ ادھر کسی جزیرے میں آباد تھا۔

سمندر بڑا پُرسکون تھا۔ آسمان پر بے شمار چھوٹے بڑے ستارے چمک رہے تھے۔ ان کی ہلکی نیلی روشنی میں سمندر دور تک پُرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ میرے چپوؤں کی چھپک چھپک کی آوازیں رات کی خاموشی میں پیدا ہو رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ رات کے اندھیرے میں ہی فرائی ڈے کے جزیرے پر پہنچ جاؤں۔ کیونکہ دن کی روشنی میں، میں دیکھا جا سکتا تھا۔ اب ایک یہ خیال بھی ستانے لگا کہ کیا خبر آدم خور فرائی ڈے کو اس جزیرے پر نہ لائے ہوں۔ بلکہ کسی دوسرے

یرے پر لے گئے ہوں۔ میری کشتی ساحل سے بہت آگے نکل آئی ہے۔ مجھے اپنا جزیرہ دور ہوتا رآ رہا تھا۔ جس رات میں آج سے تیس برس کے قریب پہلے پہل اس جزیرے پر آیا تھا۔ تو رسے یہ مجھے بالکل ایسا ہی دکھائی دیا تھا۔ ایک پل کے لئے تو مجھے محسوس ہوا کہ میں اس منحوس یرے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ رہا ہوں۔

آدھی رات تک میں کشتی کھیتا رہا۔ مجھے اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں میں غلط سمت پر تو نہیں ل نکلا؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میں اس کمزور سی کشتی پر کھلے سمندر میں جا نکلوں گا۔ یہ تو اپنی تباہی خود آواز دینے والی بات تھی۔ کیونکہ اتنی معمولی اور کمزور سی کشتی پرسکون سمندر میں تیس بتیس میل کا فاصلہ تو طے کر سکتی تھی۔ لیکن کھلے سمندر کی اُونچی اُونچی لہروں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی میرے دل کو مختلف قسم کے وسوسوں نے گھیر لیا۔ اگر اس جزیرے کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنا تھا تو پھر بڑی کشتی پر نکلتا۔ چھوٹی کشتی پر تو میں کسی صورت وہاں سے نکلنے کا نام نہیں لے سکتا تھا۔ میرا خیال ہے مجھے واپس چلے جانا چاہیئے نہیں تو میں ضرور کسی مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔ اگر کسی بڑی لہر پر کشتی سوار ہو گئی تو پھر ساری زندگی کنارے پر نہ لگ سکوں گا۔

یہ سوچ کر میں کشتی کو موڑنے ہی والا تھا کہ اچانک میری نظر مشرق کی طرف گئی۔ دور مجھے روشنی دکھائی دی۔ میں کسی جزیرے پر پہنچنے والا تھا۔ یہ جزیرے میں کسی جگہ آگ جل رہی تھی تو کیا یہی فرائی ڈے کے ماں باپ کا جزیرہ تھا۔ یقیناً یہی ہوگا۔ اب پیچھے مجھے اپنا جزیرہ نظر آنا بند ہو گیا تھا۔ بس ان دونوں جزیروں میں اتنا ہی فاصلہ تھا کہ جب ایک جزیرہ نظروں سے اوجھل ہوتا تھا۔ تو دوسرا جزیرہ نظر آنا شروع ہو جاتا تھا۔ میں بڑے غور سے اس روشنی کو دیکھ رہا تھا۔ جو مجھے دور جزیرے پر نظر آرہی تھی۔ شاید کسی نے یہ آگ پہاڑی پر جلا رکھی تھی۔ روشنی لمحہ بہ لمحہ قریب آرہی تھی۔ اب جزیرے کے درختوں کی سیاہ لکیر خاصی قریب آگئی تھی۔ اور درختوں کے گھنے سائے دکھائی دینا شروع ہو گئے تھے۔ میں کشتی میں نیم دراز ہو گیا اور بڑی احتیاط سے چپو چلانے لگا۔ اس خیال سے کہ اگر کوئی آدم خور چوکی داری کر رہا ہو تو اس کی نظر سے بچ سکوں، کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ میری طرح سے ان آدم خوروں کی نگاہ بھی اندھیرے میں ہر شے کو دور سے دیکھ لیتی ہے۔ میں کشتی کو مشرقی کنارے کی طرف

لیتا گیا۔ یہ کنارہ میں نے غور سے دیکھا گھنے درختوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں میرے جزیرے
کے مقابلے میں بہت زیادہ اور بہت ہی گھنے اور اونچے اونچے درخت تھے۔ یہی وجہ تھی
کہ یہ ایک آباد جزیرہ تھا۔ آگ ایک جھونپڑی کے باہر جل رہی تھی۔ جو ایک ٹیلے کے دامن
میں سمندر کے کنارے پر تھا۔

ظاہر تھا۔ کہ یہ جھونپڑا ایک طرح کی نگرانی کی چوکی ہے۔ ضرور یہاں کوئی چوکیدار
پہرہ دے رہا ہوگا۔ میرے لئے زیادہ دیر سمندر میں رہنا خطرناک ہو سکتا تھا میں کشتی
کو کھیتا ہوا بڑے اطمینان اور ہوشیاری سے سمندر کے مشرقی کنارے کی طرف لے آیا۔
میں نے سمندر میں اتر کر کشتی کو کھینچا اور اسے گھسیٹتا ہوا۔ ایک باہر کو نکلی ہوئی چٹان کی
کھوہ میں لے گیا۔ یہاں سمندری بیلیں اُگی ہوئی تھیں۔ میں نے کشتی کو ان بیلوں میں چھپا
دیا اور دونوں ہاتھوں میں پستول تھام کر دبے پاؤں اس جھونپڑی کی طرف چل پڑا۔ جس کے باہر
آگ جل رہی تھی۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کہ میں ٹھیک جزیرے پر آیا ہوں اور کیا یہ
واقعی فرائی ڈے کا جزیرہ ہے اور کیا وہ اسی جزیرے میں قید ہے؟ اگر یہ فرائی ڈے کے دشمن
قبیلے کا جزیرہ تھا تو پھر مجھے ان لوگوں کی زبان آتی تھی۔

رات کے سائے بڑے گہرے تھے۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے جن کی روشنی
بہت مدھم تھی۔ سمندر پُرسکون تھا۔ لہریں بڑے آرام سے ریت کے پاؤں دُھلا کر واپس
چلی جاتی تھیں میں کنارے کے درختوں کے نیچے سے ہو کر جھکا جھکا آگے بڑھ رہا تھا۔ میں
جھونپڑی کے بالکل قریب اس کے عقب میں آگیا۔ آگ ایک چھوٹے سے الاؤ کی صورت میں
جھونپڑی کے آگے جل رہی تھی ایک آدم خور ننگ دھڑنگ وحشی گھٹنوں میں سر دیئے اُونگھ
رہا تھا یا سو گیا تھا۔ برس ہا برس سے ایک بے آباد جزیرے پر رہتے ہوئے مجھے جانوروں کی
طرح بغیر آواز پیدا کئے چلنے کا فن خوب آگیا تھا۔ میں دبے دبے جھونپڑی کے پیچھے آگیا۔ میں
یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جھونپڑی کے اندر بھی کوئی ہے یا نہیں؟ یہ جھونپڑی اسی طرح کی
گھاس پھوس کی بنی ہوئی تھی۔ جس طرح کی جھونپڑیاں وحشی لوگوں کی ہوا کرتی ہیں۔ جھونپڑ
کی مخروطی دیوار کے ساتھ کھڑے ہو کر میں نے ایک جگہ سے گھاس ذرا ہٹائی اور اندر دیکھا

ہرا اندھیرا تھا میں نے آنکھیں بند کیں اور اندھیرے میں دیکھنے والی حس کو بیدار کر کے
یں پوری کھول کر جھانکا۔ اب مجھے سب کچھ نظر آرہا تھا۔ اندر سوائے پانی کے ایک مٹکے
اور کچھ نہیں تھا۔

اس کا مطلب تھا کہ یہ شخص اکیلا ہی پہرہ دے رہا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی اور حوصلہ بلند ہو
۔ اس اکیلے آدم خور کو زیر کرنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اس لئے کہ میں پستول نہیں چلانا چاہتا
ا۔ کہ کہیں سارے آدم خور بیدار ہو کر مجھ پر حملہ نہ کر دیں۔ پھر میرے لئے جان بچانا مشکل ہو
ا میں زمین پر منہ کے بل لیٹ گیا۔ اور سمندری کیکڑے کی طرح رینگتے ہوئے اس وحشی کی طرف
ھنے لگا۔ میں نے پستول گلے میں لٹکا لئے تھے اور دونوں ہاتھوں میں بکری کی کھال کی بنی
ئی رسی تھام رکھی تھی۔ وحشی شاید گہری نیند میں تھا۔ میں اس کے بالکل پاس پہنچ گیا تھا۔
ر اسے کوئی خبر نہیں ہوئی تھی حالانکہ یہ لوگ بڑے ہوشیار ہوتے ہیں اور جنگل میں ذرا
سی آہٹ پر بھی چوکنے ہو جاتے ہیں۔ وحشی کے عقب میں جاتے ہی میں نے چیتے ایسی تیزی
کے ساتھ کھال کی رسی اس کے گلے میں ڈال کر اس زور سے مروڑی کہ وحشی کی آنکھیں باہر
کو اُبل پڑیں۔ اس نے دہشت زدہ ہو کر مجھے دیکھا۔ میں اسے اسی طرح گھسیٹتا ہوا جھونپڑی
کے اندر لے گیا۔ میں نے اس کا گلا اتنا دبا رکھا تھا کہ اس کی آواز نہیں نکل سکتی تھی۔
میں نے اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر اس کی زبان میں کہا۔

"تم لوگ ساتھ والے جزیرے سے آج صبح ایک لڑکے کو اغوا کر کے لائے
ہو؟"

میں نے وحشی کی رسی ذرا سی ڈھیلی کر دی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور زور سے
چیخنے ہی والا تھا کہ میں نے رسی پھر سے کس دی اور ساتھ ہی پستول اس کی کنپٹی پر رکھ کر کہا

"یہ وہ شے ہے۔ جس میں سے آگ نکلتی ہے اور دھماکا ہوتا ہے۔ اور
انسان تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے۔ اگر جان کی امان چاہتے ہو تو اسی طرح خاموش
بیٹھے رہو۔ یہ دیکھو میرے پاس اس قسم کے کتنے ہی پستول ہیں۔ میں تمہیں اور
تمہارے ساتھیوں کو بڑی آسانی سے ہلاک کر سکتا ہوں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ وہ

اغوا شدہ نوجوان کہاں پر ہے ؟

کیا تم لوگوں نے اسے بھون کر کھا لیا ہے ؟

وحشی نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

"نہیں۔"

میں نے پوچھا "تو پھر مجھے بتاؤ کہ وہ کہاں ہے ؟ کس جھونپڑی میں قید ہے ؟"

یہ پر یدار وحشی مجھ سے کچھ اس طرح سے خوف زدہ ہو گیا تھا کہ اس نے دو بار اچوں تک نہ کی اور صاف صاف بتا دیا کہ فرائی ڈے اس جنگل کے اندر سردار کی بڑی جھونپڑی کے پیچھے ایک جھونپڑی میں قید ہے۔ جہاں ہر وقت دو آدم خور پھرے اور تیر کمان لئے پہرہ دیتے ہیں اس نے یہ بھی بتایا کہ فرائی ڈے کو اس لئے ابھی تک ہلاک نہیں کیا گیا کہ کسی دیوتا کے تہوار کا دن قریب ہے۔ سردار اس روز دیوتا کے حضور میں فرائی ڈے کا خون اور گوشت پیش کرنا چاہتا ہے یہ بات میرے لئے بڑی خوشی کی تھی کہ فرائی ڈے ابھی تک زندہ تھا مجھے اب اس وحشی کو ٹھکانے لگانا تھا۔ اگر میں اسے زندہ چھوڑ دیتا ہوں تو خطرہ تھا کہ وہ بھاگ جائے اور جا کر سارے آدم خوروں کو خبر کر دے یا ایک چیخ مار کر سب کو ہوشیار کر دے۔

میں نے اس سے پوچھا "تم نے کتنے انسانوں کو ہلاک کر کے ان کا گوشت کھایا ہے۔"

اس نے اشاروں سے کہا۔ "بارہ آدمیوں کا گوشت کھا چکا ہوں۔"

میرے لئے اس آدم کو کیفر کردار کو پہنچانے کے لئے اتنا جواز کافی تھا۔ میں نے پیچھے سے پستول کا دستہ اس کے سر پر مارا۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا میں اسے گھسیٹ کر سمندر کے ساحل تک لے گیا اور ایک اونچی چٹان سے دھکیل کر گہرے سمندر کی کھاڑی میں گرا دیا۔ اب میں بھاگ کر جھونپڑے میں آیا۔ میں نے جھونپڑی کے باہر بیٹھ کر ایک مکار چور کی طرح ساحل کے درختوں کا جائزہ لیا۔ اب آسمان پر صبح کی نیلی نیلی روشنی کا غبار سا پھیلنے لگا تھا جس میں درخت صاف دکھائی دے رہے تھے۔ یہ بڑے ہی گھنے درخت تھے۔ ان میں ایک چھوٹی سی پگ ڈنڈی جھاڑیوں کے درمیان سے جنگل چلی گئی تھی۔ اس راستے سے جنگل میں داخل ہونا خطرناک تھا میں دوسری طرف سے جنگل میں داخل ہو گیا۔ میں پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہا تھا کیونکہ

جانتا تھا۔ کہ آدم خور ضرور کہیں آس پاس ہی ہوں گے اور ان کی آنکھیں اور کان بڑے تیز تے ہیں۔ میں بھی جزیرے کا ایک وحشی ہی تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ آدم خور نہیں تھا۔ میں ی دور سے ہلکی سے ہلکی آہٹ سن لیتا تھا۔

ایک جگہ بہت سارے درختوں کا گھنا جھاڑ تھا۔ آسمان پر صبح کی روشنی پھیل چکی تھی اب گے جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ان گھنے درختوں میں سے ایک جگہ سے ہلکا ہلکا دھواں ٹھ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں آدم خور وحشیوں کے جھونپڑے ہیں۔ چند قدم گے جا کر میں نے جھاڑیوں کو ہٹا کر دیکھا۔ سامنے ایک صاف جگہ تھی۔ کنارے کنارے درختوں کے نیچے جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان میں ایک جھونپڑی سب سے اونچی تھی اور اس کے اوپر بانس کے ساتھ کسی بدنصیب انسان کی کھوپڑی لٹک رہی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ قبیلے کے ظالم سردار کی جھونپڑی ہے۔ اس کے عقب میں وہ جھونپڑی کے عقب میں جانا چاہیئے ؟ پھر خیال آیا کہ دن نکلنے والا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں چاروں طرف روشنی پھیل جائے گی۔ وحشی اپنی اپنی جھونپڑیوں سے باہر نکل آئیں گے۔ اس نے کسی جگہ چھپ کر موقع کا انتظار کیا جائے۔ ایک اور بات مجھے یشان کر رہی تھی۔ وہ یہ تھی کہ بہت جلد ان آدم خوروں کو علم ہو جائے گا کہ ان کے ایک ساتھی و غائب کر دیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ چٹان کی کھاڑی میں وحشی آدم خوروں کی لاش پھول کر اوپر آ جائے۔ یہ وحشی قاتل کی تلاش میں جزیرے کا کونہ کونہ چھان ماریں گے۔ اس لئے میرے واسطے بہت ضروری ہو گیا تھا کہ میں کسی ایسی جگہ چھپ کر اندھیرا ہونے کا انتظار کروں۔ جہاں ان وحشی آدم خوروں کی نگاہ نہ پہنچ سکے۔ مصیبت ایک یہ بھی تھی کہ یہ جزیرہ میرے لئے اجنبی تھا اور وہ لوگ اس کے چپے چپے سے واقف تھے۔

پھر بھی کسی جگہ چھپنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے اپنی عارضی کمین گاہ کی تلاش شروع کر دی۔ یہ جزیرہ میرے جزیرے کے مقابلے میں زیادہ گھنا تھا۔ یہاں بڑی گھن دار جھاڑیاں اور گھاس تھی۔ آخر مجھے چھپنے کے لئے ایک جگہ مل گئی۔ یہ ایک کھوہ تھی جو ایک چٹان کے عقب میں جھاڑیوں کے اندر جا کر آتی تھی۔ ایک کھوہ کے منہ پر گنجان جھاڑیوں نے سایہ کر رکھا تھا۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ پردہ ڈال رکھا ہے تو زیادہ موزوں ہو گا۔ میں

اس کھوہ میں آکر بیٹھ گیا۔ میں نے بندوق چٹان کی اندرونی دیوار کے ساتھ لگائی اور ٹیک لگا
کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں تھک گیا تھا۔ کشتی چلاتے چلاتے میرے بازوؤں میں درد ہونے لگا
تھا۔ مجھے درختوں پر پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں دیر
تک وہاں بیٹھا رہا۔ باہر دھوپ نکل آئی تھی۔ جس کی روشنی جھاڑیوں میں سے چھن کر اندر
کھوہ تک آرہی تھی۔ میں بہت چوکس ہو کر بیٹھا تھا۔ میرے کان باہر کی آوازوں پر لگے ہوئے
تھے مجھے معلوم تھا۔ کہ اب تک آدم خوروں کو پہریدار وحشی کی گمشدگی کا علم ہو چکا ہوگا۔
بلکہ ہو سکتا ہے۔ انہیں کھاڑی میں سے لاش بھی مل گئی ہو۔

دور سے مجھے لوگوں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ آوازیں قریب آتی
گئیں۔ یہ آدم خور وحشی لوگ تھے۔ جو میری طرف چلے آرہے تھے کم از کم مجھے تو یہی محسوس ہوا کیونکہ
آوازیں لحہ بہ لحہ دے قریب سے قریب تر ہو رہی تھیں۔ وہ آپس میں اسی وحشی کے بارے
میں باتیں کر رہے تھے۔ چونکہ میں ان لوگوں کی زبان جانتا تھا۔ اس لئے ان کی ایک ایک
بات سمجھتا تھا۔ ان کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ سخت غصے میں تھے۔ وحشی پہریدار کی لاش سمن
کی کھاڑی سے مل گئی تھی اور سردار نے حکم دیا تھا۔ کہ قاتل جزیرے میں ہی کہیں ہے اسے پکڑ
کر اس کے سامنے لایا جائے تاکہ وہ اپنے ہاتھ سے اس کا سر تن سے جدا کرے اور خود بھون کر
کھائے۔ میرے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ تو گویا یہ لوگ میرے خون کے پیاسے تھے اور میر
سر کی تلاش میں پھر رہے تھے۔ آوازیں میرے قریب آکر رک گئیں۔ وہ شاید چٹان کے سامنے
کسی جگہ بیٹھ گئے تھے۔ آوازوں سے معلوم ہوا کہ وہ تعداد میں چار ہیں۔ وہ آپس میں قاتل
یعنی میرے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک بار تو میرا خون خشک ہو گیا۔ میں موت کے
منہ میں آگیا تھا۔ اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں تھا یہ بلا میں نے خود مول لی تھی۔

اب مجھے حوصلے سے کام لینا چاہیئے تھا۔ میری ذرا سی گھبراہٹ مجھے ہمیشہ کے لئے موت کی
نیند سلا سکتی تھی۔ بلکہ ایک اذیت ناک موت کے منہ میں جھونک سکتی تھی۔ میں اپنی جگہ پر د
ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے دل کو حوصلہ دیا۔ ہمت اور دلیری کے جذبے کی مجھ میں کمی نہیں تھی
میں نے پچیس برس ایک ویران جزیرے پر تنہا بسر کئے تھے۔ ان میں سینکڑوں خوفناک مراحل

ئیں اور ہزار بار میری زندگی خطرے میں بھی پڑی۔ مگر میں نہیں گھبرایا تھا۔ زندگی میں شاید
ہ بار میری زندگی خطرے میں بھی پڑی۔ میں نہیں گھبرایا تھا۔ زندگی میں شاید پہلی بار میں ان
خوروں کے عزائم سے ذرا خوف زدہ ہوا تھا۔ لیکن جلد ہی میں نے اپنے آپ کو چاق و چوبند
یا۔ میری فطری دلیری اور نڈر پن مجھ پر غالب آگیا۔ میں غور سے آدم خور وحشیوں کی باتیں
نے لگا۔ وہ آپس میں جانوروں کی طرح بول رہے تھے۔ ان کی آوازیں بڑی تیز اور نوکیلی تھیں۔
یسے بندر آپس میں لڑ رہے ہوں۔ ان کے بعض الفاظ میری سمجھ سے باہر تھے۔ اب معلوم ہوا کہ
رائی ڈے کی زبان ان وحشیوں کی زبان سے کافی مہذب اور شائستہ تھی۔

وہ اپنے ساتھی کے قاتل کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ وہ آپس میں کسی ایسے انسان کی
لاش کے بارے میں بھی لڑ جھگڑ رہے تھے۔ جسے انہوں نے حال ہی میں بھون کر کھایا تھا۔ اور
جو کسی دوسرے قبیلے کا آدمی تھا۔ یہ میری سمجھ میں نہ آسکا کہ وہ لڑائی کس بات پر کر رہے ہیں
اسی طرح باتیں کرتے کرتے وہ آگے نکل گئے۔ کچھ دور تک جنگل میں ان کی آوازیں آتی رہیں پھر
غائب ہو گئیں۔ میرے دل میں خیال آیا کہ باہر نکل کر دیکھنا چاہیئے یہ کدھر گئے ہیں۔ میں جھاڑیاں
ہٹا کر باہر آگیا۔ جنگل سنسان تھا۔ پرندے خوراک کی تلاش میں درختوں پر سے اڑ کر جا چکے تھے۔
ں نے دائیں بائیں دیکھا وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے سوچا۔ سارا دن کہاں چٹان کی کھوہ
ں پڑا رہوں گا۔ کیوں نہ اسی وقت فرائی ڈے کے جھونپڑے کی تلاش کیا جائے؟ یہ ایک خطرناک
یصلہ تھا، ہو سکتا تھا۔ جنگل میں آگے جا کر وحشی جھاڑیوں یا درختوں میں چھپے بیٹھے ہوں۔ کیونکہ
نہیں پتا چل گیا۔ کہ ان کا ایک ساتھی ہلاک ہو چکا ہے۔ اور قاتل جزیرے میں ہی ہے۔ دوسری
طرف چٹان کے اندر یونہی بیکار پڑے رہنے سے کہیں بہتر تھا۔ کہ جنگل میں چھپ چھپ کر
فرائی ڈے کی جھونپڑی تلاش کی جائے۔ چنانچہ میں نے پستول ہاتھوں میں پکڑے اور بڑی احتیاط
سے جھاڑیوں میں سے نکل کر آگے چل دیا۔

میں اندازے کے مطابق اس طرف جا رہا تھا۔ جہاں سردار کی جھونپڑی کا عقب تھا۔
میں کافی فاصلہ دے کر نصف دائرے کی شکل میں جنگل میں آگے بڑھ رہا تھا کہ دفعتاً ایک
درخت کے قریب جاتے جاتے میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ مجھے ایک لمحے کے لئے تو اپنی آنکھوں

پر یقین نہ آیا۔ میرے بالکل قریب کوئی دس بارہ گز کے فاصلے پر ایک آدم خور وحشی میری طرف
پیٹھ کئے جھک کر کھڑا زمین پر کسی شے کو دیکھ رہا تھا۔ میں بڑی احتیاط کے ساتھ دو قدم
پیچھے ہٹ کر ایک درخت کی اوٹ میں چھپ گیا وحشی نے شاید میرے قدموں کی چاپ
سُن لی تھی۔ میں نے جھاڑیوں کے پتوں میں سے دیکھا کہ وہ ایک دم سے چونک کر پیچھے گھوما اس
کی لال لال آنکھیں آتش پارے کی طرح اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ وہ ناک سیکڑ کر فضا میں
شاید کسی اجنبی انسان کی بو سونگھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب میں بھی ہوشیار ہو گیا۔ میں نے
پستول کی بجائے چھرا ہاتھ میں پکڑ لیا۔ پھر کچھ سوچ کر اسے بھی پیٹی میں لگا لیا۔ اور وہی بکری کی
کھال کی مضبوط رسی دونوں ہاتھوں میں تھام لی۔

وحشی نے کمان میں تیر جوڑ لیا تھا اور قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے نتھنے سیکڑ رکھے تھے
کم بخت کی قوت شامہ بلا کی تیز تھی۔ وہ ٹھیک اس طرف آ رہا تھا۔ جدھر میں درخت کے پیچھے جھاڑیوں
میں چھپا ہوا تھا۔ اب میں گھبرا گیا۔ اگر میں نے گولی چلا دی تو اس کے دھماکے سے سارا جنگل گونج
اُٹھے گا۔ یہ وحشی تو مر جائے گا۔ مگر باقی سارے وحشی بیدار ہو جائیں گے۔ پھر نہ تو فرائی ڈے
ہی یہاں سے نکل سکے گا اور نہ میں بچ کر جا سکوں گا۔ آدم خور میری طرف برابر چلا آ رہا تھا۔
عین جب وہ مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر رہ گیا۔ تو میں نے جیب سے سکے کی ایک خالی
گولی نکال کر اس کے سر کے اوپر سے پیچھے پھینک دی۔ سکے کی گولی اس کے عقب میں پتوں پہ
گری تو وہ چونک کر پیچھے گھوما۔ بس میرے حملہ کرنے کا یہی نازک اور سنہری وقت تھا۔ میں
بجلی ایسی تیزی کے ساتھ درخت کے پیچھے سے نکلا اور دوسرے لمحے چمڑے کی رسی اس وحشی آدم خور
کی گردن میں بُری طرح سے کسی جا رہی تھی۔ وہ پوری طاقت سے اپنی گردن میرے ہاتھوں کی
گرفت سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی
پڑتی گئی۔ چمڑے کی رسی اس کی گردن کے سیاہ گوشت میں اندر ہی اندر دھنستی چلی گئی۔ اس
کی زبان باہر لٹک گئی۔ آنکھیں اُبل کر باہر نکل آئیں۔ میں نے اُسے اس وقت چھوڑا جب وہ
مر چکا تھا۔

میں گھسیٹ کر اس کی لاش کو چٹان کی اسی کھوہ میں لے گیا۔ جس میں، میں نے پناہ لے

[…]ھی۔ میں نے لاش کو ایک جگہ زمین پر لٹا دیا اور اس کے اُوپر پتے اور جھاڑیاں ڈال دیں
[…] کام سے فارغ ہو کر میں کھوہ سے باہر نکل آیا اور پھر اپنی منزل کی طرف پھُونک پھُونک
[…]دم اٹھاتا روانہ ہو گیا۔ میں اس جنگل درخت بڑی بے ترتیبی سے اگے ہوئے تھے تنوں پر
[…]ہوتی ہوئی جنگلی بیلوں نے درختوں پر اپنے جھاڑ پھیلا رکھے تھے۔ ایک جگہ لال رنگ کا
[…]پ اپنا پھن پھیلا کر میرا راستہ روکے کھڑا ہو گیا۔ میں بھی وہیں رک گیا۔ میں نے چھُرا ہاتھ میں
[…]ڑ لیا۔ سانپ نے زبان سے ایک سیٹی سی بجائی اور ذرا سا پیچھے جھک کر مجھ پر حملہ کر دیا۔ یہ
[…]ملہ اس قدر اچانک اور شدید قسم کا جارحانہ تھا کہ میں اگر پھرتی سے کام نہ لیتا تو آج یہ کہانی
[…]انے کے لئے زندہ نہ ہوتا۔ میرے چھرے کا پہلا ہی وار کام کر گیا اور سانپ کی گردن پھن کے
[…]یچے سے کٹ کر الگ جا گری۔

میں درختوں کی اوٹ لیتا۔ جھاڑیوں میں چھپتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ مجھے دور سے
[…]عورتوں اور آدمیوں سے باتیں کرنے کی آوازیں آئیں۔ یہ آدم خوروں کی جھونپڑیاں تھیں
[…]میں اپنی منزل کے قریب پہنچ گیا تھا۔ میں ایک گھنے درخت پر چڑھ گیا۔ میں نے دوربین لگا
[…]کر دیکھا۔ سامنے آدم خور قبیلے کے سردار کی اُونچی جھونپڑی تھی۔ جس کی چھت پر انسانی کھوپڑی
بانس پر ٹنگی تھی۔ اس جھونپڑی کے پیچھے فرائی ڈے کا بندی خانہ تھا۔ وہ مجھے دکھائی نہیں
دے رہا تھا۔ لیکن وہ تھا۔ ان ہی درختوں کے پیچھے ...... میں درخت سے اُترنے ہی والا
کہ دو آدم خور وحشی آپس میں باتیں کرتے ہنستے دور سے آتے نظر آئے۔ میں نے اپنا آپ درخت
کی شاخوں میں چھپا لیا۔ وہ میرے درخت کے نیچے سے گذر گئے۔ پھر ذرا آگے جا کر رُک
گئے اور جھک کر زمین کو دیکھنے لگے یہ وہ جگہ تھی جہاں میں نے سانپ کو دو ٹکڑے کیا تھا
ایک آدم خور نے زمین پر سے سانپ کی کٹی ہوئی سری اٹھالی اور بڑی حیرانی سے دوسرے
کو دکھانے لگا۔ دوسرے نے ہنس کر اپنی زبان میں کہا۔

"یہ مری ہوئی شکر قندی ہے۔ کھا لو۔ کھا لو۔"

اور پھر زور سے قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے دہرا ہو گیا۔ پہلے آدم خور نے زور سے اس
کی کمر پر مکا مارا اور غصے میں بولا۔

"چُپ ...... چُپ ......"

دوسرا چپ ہو گیا۔ پہلے آدم خور نے اب کٹے ہوئے سانپ کا بقیہ حصہ بھی اٹھا لیا۔ اور بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ خدا جانے وہ کیا سوچ رہا تھا۔ کہ اس نے مجھے درخت پر ٹانگ دیا تھا پھر اس نے سانپ کو منہ میں ڈالا اور شکر قندی کی طرح بڑے شوق سے کھاتا ہوا اپنے ساتھی کے ہمراہ آگے نکل گیا۔

یہ وحشی میری نظروں سے اوجھل ہوئے تو میں چپکے سے درخت پر سے نیچے اتر آیا۔ میں آدم خوروں کے علاقے میں آ گیا تھا۔ یہاں ہر قدم پر کسی نہ کسی وحشی سے واسطہ پڑ جانے کا خطرہ ہر وقت سر پر منڈلاتا رہتا تھا۔ مجھے بہت زیادہ چوکس رہنے کی ضرورت تھی۔ پھر بھی جتنی احتیاط میں کر سکتا تھا۔ اتنی احتیاط ہی کر سکتا تھا۔ اب میں غائب تو ہو نہیں سکتا تھا۔ بس سنبھل سنبھل کر قدم قدم پر دائیں بائیں دیکھتا اس جھونپڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جو سردار کے بڑے جھونپڑے کے پیچھے تھی اور جس میں فرائی ڈے قید تھا۔ ایک چھوٹے سے تالاب پر آ کر میں نے کچھ کچے سنگھاڑے اکھاڑ کر کھائے اور پانی پیا۔ تازہ دم ہو کر میں تالاب کے اوپر سے چکر لگاتا ہوا سامنے آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سچ مچ ایک بانس کا بڑا مضبوط چھوٹا سا جھونپڑا درختوں میں گھرا ہوا ہے۔ جس کے آگے دو نیم برہنہ آدم خور وحشی کندھوں پر تیر کمان لٹکائے اور ہاتھ میں چھرے لئے پہرہ دے رہے ہیں۔

ان میں سے ایک جھونپڑی کے بند دروازے کے بالکل آگے زمین پر بیٹھا تھا۔ اور دوسرا اپنی جگہ پر قریب ہی کھڑا اس سے باتیں بھی کر رہا تھا اور ہوشیار لومڑ کی طرح دائیں بائیں بھی دیکھ لیتا تھا۔ میں اسی جگہ جہاں کھڑا تھا بیٹھ گیا۔ اور جھاڑیوں میں سے غور سے اس جھونپڑی کو دیکھنے لگا۔ اس کی دیواریں بانس جوڑ کر بنائی گئی تھی اور بڑی مضبوط تھیں ان کو توڑنا بڑا مشکل تھا۔ آدم خور پوری طرح ہوشیار بیٹھے تھے۔ ویسے بھی دن کا وقت تھا اور ان کے سونے یا اونگھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا چھوٹا دوست فرائی ڈے اسی جھونپڑی میں اپنی موت کا انتظار کر رہا ہے۔ اسے معلوم ہی تھا کہ میں اس سے پچاس قدم کے فاصلے پر جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھا اسے آزاد کرانے کے منصوبے پر عمل پیرا تھا

میں نے سوچا کہ اپنی مخصوص سیٹی بجا کر فرائی ڈے کو اپنی آمد کی اطلاع کر دوں۔ پھر خیال آیا کہ جواب میں کہیں وہ بھی سیٹی نہ بجا دے اور یوں آدم خوروں کو شک پڑ جائے اور وہ میری تلاش میں ادھر کو آ جائیں اور مجھے پھر جنگل میں ادھر اُدھر بھاگتے پھرنا پڑے۔ اس سے یہ کہیں بہتر تھا کہ میں خاموشی سے اپنے منصوبے پر عمل کروں اور فرائی ڈے کو اس وقت ہی خبر ہو جب میں اس کی جھونپڑی میں پہنچ جاؤں۔

فرائی ڈے کی جھونپڑی میں پہنچنے کے لئے ان دونوں پہریدار آدم خوروں کو ٹھکانے لگانا بہت ضروری تھا۔ ضرور یہی آدم خور رات کو بھی پہرہ دیں گے۔ یا اگر دوسرے وحشی جوان بھی ہوں گے۔ تو وہ بھی چوکس رہیں گے اور مجھے جھونپڑی کے قریب بھی پھٹکنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ میرے پاس اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلحہ موجود تھا۔ مگر میں اس وقت تک ایک گولی بھی نہیں چلانا چاہتا تھا۔ جب تک کہ فرائی ڈے میرے پاس نہ آ جائے یا میں اس کے پاس نہ پہنچ جاؤں۔ بہرحال ایک بات واضح تھی۔ کہ اس حصار کو میں دن کے وقت نہیں بلکہ رات کے وقت ہی توڑ سکتا تھا۔ چنانچہ ہر حالت میں مجھے رات کے اندھیرے کا انتظار کرنا ہی تھا۔ ابھی پہاڑ ایسا دن باقی تھا اور میں یونہی جنگل میں جھاڑیوں کے پیچھے چھپے رہنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے اپنے ارد گرد درختوں کا جائزہ لیا۔ ان میں ایک درخت جنگلی بیری کا درخت تھا۔ میں اس درخت پر چڑھ گیا اور اوپر جا کر شاخوں میں چھپ کر بیٹھ گیا شاخوں میں کانٹے بہت تھے مگر میں اتنا سخت جان ہو چکا تھا۔ کہ کانٹے مجھے زیادہ تکلیف نہیں دے سکتے تھے۔ ویسے بھی میرا لباس بکری کی کھال کا بنا ہوا تھا۔

درخت میں چھپے چھپے مجھے سہ پہر ہو گئی۔ بھوک لگی تو میں نے ٹہنیوں پر سے لال لال پکے ہوئے بیر توڑ کر کھانے شروع کر دیئے۔ میں نے ایک دو شاخے سے ٹیک لگا کر ٹانگیں پھیلا دیں۔ اس طرح مجھے کچھ آرام ملا۔ آخر خدا خدا کر کے سورج مشرق کے آسمان میں غروب ہونے لگا۔ دن کی روشنی مدھم ہونا شروع ہو گئی۔ میرے درخت پر طوطے آ کر شور مچانے لگے۔ ایک طوطا میرے سر پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے اڑا دیا۔

شاید وہ سر کو درخت کا کوئی ٹھنٹھ سمجھا تھا۔ اس عرصے میں میری نظریں جھونپڑے کا ہر دس منٹ کے بعد جائزہ لیتی رہی تھیں۔ شام ہوتے ہی پہریدار بدل گئے پہلے آدم خور

کیلے کے پتوں پر شاید شکر قندی کے کچھ ٹکڑے لے کر جھونپڑی کے اندر گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ خالی تھے۔ شاید وہ فرائی ڈے کو رات کا کھانا دے کر آیا تھا۔ مجھے پیاس محسوس ہوئی۔ میرے درخت سے ذرا فاصلے ایک تالاب تھا۔ اس تالاب سے میں نے سنگھاڑے توڑ کر کھائے تھے۔ میں نیچے اتر آیا۔ تالاب پر جا کر پانی پیا۔ چھپ چھپ کر واپس آ رہا تھا کہ ایکا ایکی ایک ادھیڑ عمر کے آدم خور وحشی سے میری آنکھیں چار ہو گئیں۔

میں یہ دیکھ کر کچھ حیران سا رہ گیا۔ کہ مجھے دیکھ کر بجائے چیخنے اور شور مچانے کے وہ آدم خور ویسے ہی کھڑا مجھے تکتا رہا۔ میں نے پستول نکال کر اس کا نشانہ لے لیا۔ میں نے اپنی جان بچانے کے لئے اس پہ گولی چلانے کا فیصلہ کر لیا تھا کہ اس آدم خور وحشی نے آہستہ سے کہا۔

"ماسٹر! انگلش ماسٹر!"

میں بھونچکا ہو کر اس کا منہ تکنے لگا۔ یہ زبان تو فرائی ڈے کی تھی۔ سوائے فرائی ڈے کے اور کبھی کسی نے مجھے ماسٹر کے لقب سے کیوں پکارا تھا؟ ایک خیال میرے دماغ میں بجلی کی طرح چمکا۔ فرائی ڈے نے مجھے بتایا تھا کہ اس جزیرے پر اس کے باپ سے ہمدردی رکھنے والے کچھ وفادار وحشی موجود ہیں۔ مگر ان کی گنتی آٹے میں نمک کے برابر ہے کہیں یہ آدم خور فرائی ڈے کے باپ کے وفادار ساتھیوں میں سے تو نہیں ہے؟ فرائی ڈے نے اسے کسی نہ کسی طرح میرے بارے میں ضرور بتا دیا ہو گا کہ میں اس کا ماسٹر ہوں اور میں نے ہی اُس کی جان بچائی تھی میں چونکہ ان کی زبان جانتا تھا۔ اس لئے آگے بڑھ کر اسے کہا۔

"فرائی ڈے کہاں ہے؟ میں انگلش ماسٹر ہوں۔ میں اسے چھڑانے آیا ہوں"

وفادار وحشی کی آنکھوں میں ایک چمک سی آ گئی۔ وہ بلا خوف و خطر میرے قریب آ گیا اس کی آنکھیں سرخ تھیں رنگ بے حد کالا تھا اور سر کے بال سفید ہو رہے تھے۔ اس نے گلے میں جانوروں اور انسانوں کی ہڈیوں کی مالا پہن رکھی تھی۔ میرے قریب آ کر سرگوشی میں بولا۔

"وہ بانس کی جھونپڑی میں قید ہے۔ دو روز بعد اسے سردار اپنے ہاتھ سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بھون کر کھا جائے گا۔ ماسٹر! بھاگ جاؤ..... سردار تمہاری تلاش میں ہے۔ وہ تمہیں بھی بھون کر کھا جائے گا۔ بھاگ جاؤ.... بھاگ جاؤ......"

میں اس وفادار وحشی کو کھینچ کر ایک جھاڑی کے پیچھے لے گیا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ میں

مشکل سے یہاں پہنچا ہوں اور اکیلا واپس نہیں جاؤں گا۔ بلکہ فرائی ڈے کو ساتھ لے کر جاؤں وفادار وحشی سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے چھوٹے چھوٹے فقروں میں بتایا کہ وہ فرائی ڈے کے م باپ کے وفادار ساتھیوں میں سے ہے۔

"ہم بہت تھوڑے ہیں۔ ہماری طاقت نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہم چاہیں بھی تو فرائی ڈے کو مکار سردار کے چنگل سے نہیں بچا سکتے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اکیلے اسے اتنے بڑے قبیلے کے درمیان سے کر کیسے نکل سکو گے؟"

میں نے کہا۔

"میں فرائی ڈے کو ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر کے آیا ہوں۔ یہ دیکھو ...... میرے پاس چھ سات پستول اور ایک بندوق ہے۔ اگر کسی طرح تم مجھے چھ سات ایسے وفادار ساتھی ملا دو جو بندوق چلانا جانتے ہوں۔ تو میری مشکل آسان ہو سکتی ہے۔"

وفادار وحشی نے کہا کہ اس جزیرے پر سوائے فرائی ڈے کے اور کوئی بھی اسلحہ استعمال با نہیں جانتا۔ بلکہ اس نے تو پستول پہلی بار دیکھا تھا۔ میں نے اسے کہا۔

"تو پھر تم کسی طرح فرائی ڈے کے جھونپڑے تک پہنچنے میں میری مدد کرو۔ میں سارا دن اسی بیری کے درخت پر ٹنگا رہا ہوں۔"

وفادار وحشی بولا۔

"ماسٹر! میں تمہیں فرائی ڈے کی جھونپڑی تک نہیں لے جا سکتا۔ سردار میرے بھی ٹکڑے کر کے بھون کر کھا جائے گا۔ ہاں تمہیں اپنی جھونپڑی میں چھپا سکتا ہوں، جہاں سے تم صبح صبح منہ اندھیرے سمندر کے راستے فرار ہو سکتے ہو۔"

میں نے سوچا کہ اس درخت کی صلیب سے تو نجات ملے گی۔ کوئی خبر نہیں کہ اس ڈرپوک وفادار کی جھونپڑی میں کسی دلیر وفادار وحشی سے ملاقات ہو جائے جو فرائی ڈے کی جان بچانے میں میری کچھ مدد کر سکے۔ چنانچہ میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مجھے جنگل کے ایک بے حد گھنے علاقے میں سے گذار کر ایک چھوٹے سے تالاب کے پاس آ گیا۔ یہ جگہ گھنی بیلوں سے چاروں طرف سے ڈھکی ہوئی ہے۔ یہاں میں نے غیر معمولی سناٹا محسوس کیا۔ ہر طرف گہری خاموشی چھائی

ہوئی تھی۔ تالاب کے کنارے ذرا پرے ہٹ کر کیلے کے درختوں میں گھری ہوئی ایک چھوٹی سی گھاس پھونس کی جھونپڑی بنی تھی۔ وفادار وحشی مجھے اس جھونپڑی میں لے آیا۔ یہاں اس نے مجھے تالاب کا پانی پلایا اور کھانے کو زرد رنگ کے کیلوں کا گچھا سامنے رکھ دیا۔ مجھے بہت بھوک لگی تھی۔ میں کیلے کھانے لگا۔ وہ مجھے جھونپڑی کے اندھیرے میں اپنی چمک دار لال لال آنکھوں سے تکتا رہا۔ کسی وقت مجھے خدشہ محسوس ہوتا کہ کہیں میں کسی جال میں تو نہیں پھنس گیا۔ پھر اپنے اسلحہ کا خیال کر کے دل کو حوصلہ دیتا کہ اگر مر بھی گیا تو کم از کم دس بارہ آدم خوروں کو مار کر مروں گا۔ جھونپڑی میں ایک عجیب قسم کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ انسانی خون کی بو تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کیا وہ بھی انسانوں کا گوشت کھاتا ہے؟ اس کا اس وحشی نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس مجھے اندھیرے میں ٹکٹکی باندھے تکتا رہا۔

باہر کچھ آہٹ ہوئی اس نے جلدی سے مجھے کونے میں چھپا دیا اور خود اٹھ کر باہر نکل گیا۔ کچھ دیر وہ باہر کسی سے باتیں کرتا رہا۔ میں نے پستول ہاتھ میں لے لیا۔ میں ہر خطرے کے مقابلے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ مجھے باہر آدم خوروں کی صرف سیٹیوں ایسی آوازیں ہی سنائی دے رہی تھیں لفظ ایک بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد آوازیں آنی بند ہو گئیں۔ وہ اندر آ کر کونے میں میرے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں وہ مجھے ایک چھوٹا سا کالا بھوت معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے پستول اس کی کھوپڑی کے ساتھ لگا کر کہا کہ اگر اس نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تو چاہے میری جان چلی جائے مگر میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس نے میرے گھٹنے پر اپنا کھردرا ہاتھ رکھ کر مجھے ایک بار اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور کہا کہ وہ فرائی ڈے کے باپ کا دوست ہے وہ مرحوم کا وفادار ساتھی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ باہر وہ کس سے باتیں کر رہا تھا؟ اس نے کہا۔

"ماسٹر! سارا قبیلہ تمہاری تلاش میں ہے۔ سردار کو معلوم ہو گیا ہے۔ کہ تم جزیرے میں پہنچ گئے ہو۔ اس نے فرائی ڈے پر نگرانی سخت کر دی ہے۔"

میں نے اس سے پوچھا کہ میری کشتی تو نہیں پکڑی گئی؟ اس کا جواب اس نے نفی میں دیا اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ میں نے کشتی کس جگہ چھپا کر رکھی ہے؟ میں نے اسے بتانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے فرائی ڈے کے پاس لے چلے یا اسے جا کر اطلاع کر دے کہ میں

ں کی مدد کے لئے جزیرے پر پہنچ گیا ہوں۔ اس نے کہا۔

"ماسٹر! میں کوشش کروں گا۔ اگرچہ میرا وہاں تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ سردار نے ان تمام لوگوں کے پیچھے جاسوس چھوڑ رکھے ہیں۔ جو فرائی ڈے کے باپ کے وفادار تھے۔ میں تمہیں فرائی ڈے کی جھونپڑی کے پاس پہنچا سکتا ہوں۔"

میں نے اسے اسی پر راضی کر لیا۔ میں سمجھ گیا کہ وحشی وفادار گھبرا رہا ہے۔ لیکن وہ میری مدد ضرور کرنا چاہتا ہے۔ پھر بھی وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ کہ میں فرائی ڈے سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے جھونپڑی کا جائزہ لیا۔ وہاں سوائے پانی کے ایک مٹکے اور دو پیالوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ بدبو کونے کی طرف سے آ رہی تھی۔ میں نے وہاں جا کر دیکھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کونے میں انسانی جسم کے کٹے ہوئے گلے سڑے ٹکڑے پڑے تھے میں جلدی سے واپس اپنے کونے میں آ کر بیٹھ گیا۔ یہ وحشی بھی آدم خور تھا سچ مچ کا آدم خور جو شاید انسان کا کچا گوشت شوق سے کھاتا تھا۔ میں کتنی ہی دیر تک جھونپڑی میں اکیلا بیٹھا رہا۔ رات بڑی تیزی سے گذر رہی تھی۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا۔ آج کی رات ہی کر لینا چاہیئے تھا۔ دوسرا دن میرے لئے خطرناک ہو سکتا تھا۔ سوچا کیوں نہ خود ہی فرائی ڈے کی جھونپڑی کی طرف جاؤں۔ میں ان ہی وسوسوں میں تھا۔ کہ جھونپڑی کا پھونس کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور وہی وحشی اندر آیا۔ وہ سیدھا کونے میں میرے پاس آیا اور آہستہ سے بولا۔

"ماسٹر! میں فرائی ڈے سے نہیں مل سکا۔ پہریداروں کو شک پڑ جاتا۔"

میں نے اس سے پوچھا کہ پہریدار کیا کر رہے ہیں؟ اس نے بتایا کہ پہریدار بہت چوکس ہیں۔ ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ وقت گذر رہا تھا۔ یہ وقت بڑا قیمتی تھا۔ اب میں وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ کشتی کے بارے میں میرے دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ اس کا خیال ہے کہ میری کشتی آدم خوروں کے ہاتھ نہیں لگ سکی۔ میں نے جس چٹان کے نیچے کشتی چھپائی تھی، ادھر کوئی نہیں گیا تھا۔ مجھے اس سے بڑا حوصلہ ہوا۔ اگر کشتی بھی ان کے پاس چلی جاتی تو مجھے وہاں سے فرار ہونے میں بہت دقت پیش آ سکتی تھی اب میں ایک

نئے منصوبے پر غور کرنے لگا۔ اگر کسی طرح سے میں اس قبیلے کے سردار کو یرغمال بنالوں تو اس کو جان سے مارنے کی دھمکی دے کر فرائی ڈے کو اس جزیرے سے نکال سکتا ہوں۔ اس میں دو قباحتیں تھیں۔ پہلی بات جیسا کہ وحشی نے بتایا، سردار کی جھونپڑی کے باہر بے حد سخت پہرہ تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ ہو سکتا تھا۔ یہ پاگل آدم خور سردار کی زندگی کی بھی پرواہ نہ کریں اور مجھ پر حملہ کر بیٹھیں۔ ایسی صورت میں فرائی ڈے اور میری .... دونوں کی موت یقینی تھی۔ آخر میں نے فرائی ڈے کی جھونپڑی پر ہی حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا اور وحشی سے کہا کہ کم از کم وہ ایک کام کرے کہ وہاں جا کر پہریداروں کو باتوں میں لگائے یا ایک پہریدار کو کسی بہانے دوسری طرف سے لے جائے۔ پہلے تو وہ کچھ گھبرا گیا لیکن جب میں نے اُسے بتایا کہ اس کی مخبری کوئی نہیں کرے گا۔ کیونکہ میں دونوں پہریداروں کو جان سے مار ڈالوں گا۔ تو وہ راضی ہو گیا۔ اس کے بعد ہم دونوں جھونپڑی سے باہر آ گئے۔

رات بڑی خاموش اور سنسان تھی۔ ہوا میں خنکی تھی۔ درختوں پر پرندے سو رہے تھے۔ کوئی آواز نہیں تھی۔ اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ایک ٹیکری کی اوٹ میں جا کر ہم رک گئے کوئی بیس قدم کے فاصلے پر فرائی ڈے کی جھونپڑی سامنے نظر آ رہی تھی۔ وہ مجھے اسی جگہ کھڑا کر کے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ وہ پہریداروں میں سے ایک پہریدار کو باتوں میں لگا کے ایک طرف چلا گیا ہے۔ یہ میرے حملہ کرنے کا وقت تھا۔ میں دبے پاؤں اٹھاتا زمین پر جھکا جھکا اس کے عقب سے آگے بڑھنے لگا۔ میں بڑی احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ گھاس گیلی تھی جس کی وجہ سے کوئی آہٹ تک پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ چمڑے کی رسی میرے دونوں ہاتھوں میں تھی۔ اور میں اسے مروڑ رہا تھا۔ میرے لئے اُمید کی کرن یہی ایک رسی تھی۔ درخت کے پیچھے جا کر میں رک گیا۔

آدم خور پہریدار شاید یہ سوچ کر اپنی جگہ سے اٹھنے لگا تھا کہ اپنے ساتھی کو دیکھے وہ کہاں چلا گیا ہے۔ یہ بڑی خطرناک گھڑی تھی۔ اگر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تو مقابلہ آمنے سامنے کا ہو جائے گا۔ میں یقیناً اس پر پستول چلا دوں گا۔ اور جزیرے کے سارے آدم خور وہاں آ کر میری تکا بوٹی کر دیں گے۔ میں نے آدم خور کو اُٹھنے کا موقع ہی نہ دیا۔ پلک جھپکنے میں چمڑے کی رسی اس کی گردن میں ڈال کر اسے اس بری طرح سے کس دیا کہ آدم خور آواز

ے بغیر دوسرا ہو گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا پکڑ لیا اور رسی کے شکنجے سے نکلنے کی سر توڑ کوشش کرنے لگا۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ اس میں یاب ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ میری گرفت بے حد مضبوط تھی۔ وہ دو منٹ کے اندر ر مر گیا۔

اس کی لاش کو گھسیٹ کر میں جھاڑیوں میں لے گیا۔ اتنے میں مجھے دوسرا پہریدار بھی دکھائی دیا۔ وفادار وحشی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ میں جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو گیا۔ م خور اپنے ساتھی کو آوازیں دیتا اِدھر اُدھر تلاش کرنے لگا۔ میں خاموش ہو کر جھاڑیوں ں دبکا رہا۔ اپنے ساتھی کو نہ پا کر آدم خور پہریدار کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ اس نے کمان ن تیر چڑھا لیا اور جھک کر آگے بڑھنے لگا۔ شاید اس نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔ کیونکہ اس بات کا تو انہیں علم ہو گیا تھا۔ کہ ان کا دشمن جزیرے پر آ چکا ہے۔ کم بخت وہ سیدھا ان جھاڑیوں کی طرف آ رہا تھا۔ جن کے پیچھے میں چھپا بیٹھا تھا۔ ادھر میں بھی تیار ہو گیا۔ میری تیاری بڑی فیصلہ کن تھی۔ کیونکہ میں تو اس کو جان سے مار دینا چاہتا تھا۔ سوائے اس کے میرے لئے اور کوئی لائحہ عمل نہیں تھا۔ وہ سیدھا میری طرف آ رہا تھا۔ یہ بات درست نہیں تھا۔ اس طرح سے میرا بھانڈا پھوٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح سے اس کی پشت میری طرف ہو تاکہ میں پیچھے سے اس کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کر سکوں لیکن وہ سور کی طرح بالکل ناک کی سیدھ میں چلا آ رہا تھا۔ میں نے اپنا سانس روک لیا۔ پھر میں نے اپنی وہی پرانی چال چلی۔ تھیلی میں سے چپکے سے لوہے کی ایک گولی نکالی اور اس کو اچھال کر آدم خور کے پیچھے جھاڑیوں میں پھینک دیا۔ آدم خور اچھل کر کسی خرگوش کی طرح پیچھے گھوما۔ جونہی وہ مڑا میں تیزی کے ساتھ جھاڑیوں میں سے باہر نکلا اور میں نے پوری طاقت سے پستول کا بھاری لوہے کا دستہ اس کے سر کے پیچھے گدی پر دے مارا۔ وہ اوندھے منہ گر پڑا۔ میں نے دوسری بار اسی شدت سے پھر وار کیا۔ آدم خور بے ہوش ہو گیا۔ میں نے اس کے گلے میں پھندا ڈال کر اسے بھی جہنم میں پہنچا دیا۔

میرے سامنے میدان صاف تھا۔ میں بھاگ کر جھونپڑی کے پاس گیا۔ اس کے بانس کے دروازے کو زور سے لات مار کر چوپٹ کھول دیا۔

"فرائی ڈے۔"

میں نے آواز دی۔ فرائی ڈے کونے میں پڑا تھا۔ شاید وہ جاگ رہا تھا۔ میری آو
سن کر لپک کر دروازے میں آگیا اور میرے پاؤں پر گر پڑا۔ میں نے اسے اٹھا کر سینے
سے لگایا اور کہا۔

"جلدی سے بھاگ چلو..... جلدی کرو۔"

ہم وہاں سے منہ اٹھا کر اندازاً سمندر کی طرف اُٹھ دوڑے۔ مجھے سمت کا صحیح اند
اس لئے تھا۔ کہ میں ستاروں کی رہنمائی میں چل رہا تھا۔ ہم دونوں رات کے اندھیرے میں
جنگل میں بھاگے جا رہے تھے۔ کچھ دور ہی گئے ہوں گے کہ اچانک درخت پر سے ایک
وحشی آدم خور چھلانگ لگا کر ہمارے سامنے چھرا تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے فرائی ڈے کو پہچا
لیا تھا۔ اس نے اپنی زبان میں چیخ کر کہا کہ وہ دونوں کو ہلاک کر دے گا۔ میرے لئے پستو
نکال کر اس پر فائر کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ گولی چلنے کے دھماکے کی آوا
سے سارا جنگل ایک دم گونج اٹھا۔ وحشی آدم خور چیخ مار کر گر پڑا۔ شاید اس نے چیخ اپ
دوسرے ساتھیوں کو خبردار کرنے کے لئے ماری تھی۔ کیونکہ یہ بڑی ہی بھیانک چیخ تھی
ہم گھبرا کر وہاں سے بھاگے ہی تھے کہ جزیرے میں آدم خوروں کی چیخیں گونجنے لگیں۔ وہ ہما
طرف بھاگے آ رہے تھے۔ میں نے جلدی سے دو پستول فرائی ڈے کو بھی تھما دیئے۔ ہم من
اٹھائے دوڑے جا رہے تھے۔ ہمارے پیر جھاڑیوں میں الجھ رہے تھے۔ اب سا
ہمیں سمندر کا کنارا دکھائی دینے لگا ہم جنگل سے باہر نکل آئے۔ یہاں صبح ہونے کی پہ
نیلی نیلی روشنی کا غبار سا پھیلا ہوا تھا۔ خدا کا شکر تھا کہ میں صحیح سمت پر آیا تھا۔ سا
وہی بھوری چٹان تھی۔ جس کے نیچے میں نے اپنی کشتی چھپا رکھی تھی۔

جونہی ہم چٹان کی طرف بڑھے دس بارہ آدم خور ہمارے سامنے آگئے۔ انہوں نے ہ
تیروں کی باڑ ماری۔ ہم بچ گئے ہم نے فوراً ایک ہی وقت میں چاروں پستول چلا دیئے۔ گ
لگنے سے تین آدم خور ریت پر گر کر تڑپنے لگے۔ میں نے پستول بھر کر دو بار فائر کیا۔ ایک آ
پرے ہٹ گئے۔ ہم بھاگ کر چٹان کے پاس آ گئے۔ اب وہاں سینکڑوں ننگ دھڑنگ آ
خور جمع ہو گئے تھے۔ وہ سب ہم پر شور مچاتے وحشیانہ انداز میں تیروں کی بارش کر ر

ے۔ ہم چٹان کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گئے اور فائرنگ کرنے لگے۔ میں نے بندوق بھر کر چلانی
روع کر دی۔ بندوق کے چھروں نے کتنے ہی آدم خوروں کو شدید زخمی کر دیا مگر وہ بڑے دلیر تھے
یک قدم پیچھے نہیں ہٹ رہے تھے۔ وہ برابر آگے بڑھتے آ رہے تھے۔ میں اور فرائی ڈے
کے بعد دیگرے ان پر گولیاں برسا رہے تھے۔ بہت سے آدم خور مر چکے تھے۔ مشرق کی طرف
سے سورج طلوع ہو رہا تھا۔ چاروں طرف دن کا اجالا پھیل گیا تھا۔ روشنی میں دیکھا کہ
جگہ جگہ آدم خوروں کی لاشیں پڑی تھیں۔ کچھ زخمی ہو چکے تھے۔ اور رینگ رہے تھے، ان
کے پیچھے وحشیوں کی ایک اور قطار تیر کمان لئے ہم پر حملے کے لئے آگے بڑھ رہی تھی۔ گویا اب ایک
باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی تھی۔ میں نے فرائی ڈے سے کہا کشتی میں سوار ہونے کی کوشش
کرو۔ کشتی ہمارے نیچے پتھروں کے درمیان پانی میں سمندری لہروں پر ہچکولے کھا رہی
تھی۔ فرائی ڈے کھسکتا ہوا کشتی میں جا پہنچا۔ میں نے وحشیوں پر بندوق اور پستول سے
دو فائر کئے۔

دو آدم خور گر پڑے۔ اب بھی فائرنگ کرتا ہوا پیچھے کشتی کی طرف کھسکنے لگا۔
فرائی ڈے کشتی کو کھول کر چٹانوں سے نکال کر سمندر کے کنارے لے آیا تھا۔ میں نے
دیکھا کہ دوسری طرف سے آدم خوروں کی ایک جماعت بھی کشتیوں میں سوار ہو رہی
تھی۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ ہم کشتی میں بیٹھ کر فرار ہونے کی کوشش میں ہیں۔ فرائی
ڈے نے مجھے زور سے آواز دی کہ ماسٹر کشتی میں آ جاؤ۔ میں فائر کرتا ہوا۔ پیچھے کو
بھاگا اور کشتی میں چھلانگ لگا کر سوار ہو گیا۔ میرے سوار ہوتے ہی فرائی ڈے نے
تیزی کے ساتھ چپو چلانے شروع کر دیئے۔ ہماری کشتی چٹان کی اوٹ سے نکل کر
کھلے سمندر کی طرف بڑھنے لگی۔ اب ہم دشمنوں کے بالکل سامنے تھے۔ ہم پر تیروں کی
بارش شروع ہو گئی۔ ہماری کشتی بڑی تیزی سے جزیرے کو پیچھے چھوڑ رہی تھی۔ آدم خور
وحشی بھی کشتیوں میں سوار ہو گئے تھے۔ انہوں نے ہمارا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ فرائی
ڈے چپو چلا رہا تھا آدم خوروں کی کشتیاں ہمارے قریب آ رہی تھیں۔ ان کی رفتار تیز
تھی۔ کیونکہ ایک ایک کشتی کو چار چار آدمی چلا رہے تھے۔ میں نے فرائی ڈے سے کہا
کہ چپو چھوڑ کر میرے ساتھ فائرنگ شروع کر۔ میں چاہتا تھا کہ پہلے آدم خوروں سے

نپٹ لیا جائے۔ کیونکہ رفتار میں ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ عین ممکن تھا کہ چند لمحوں میں وہ ہمارے سر پر پہنچ جائیں۔

فرائی ڈے نے میرے حکم کے مطابق چپو چھوڑ کر پستول سنبھال لئے۔ وہ بھی میرے ساتھ مل کر فائرنگ کرنے لگا۔ آدم خوروں کی چاروں کشتیاں ہماری سیدھ میں آ گئی تھیں وہ بے تحاشا کوئی خطرہ محسوس کئے بغیر ہماری طرف بڑھ رہے تھے ہم نے ایک کشتی کا نشانہ باندھ کر گولیوں کی باڑھ ماری۔ تین آدم خور چیخ مار کر کشتی میں گر پڑے۔ ایک تڑپ کر سمندر میں گر گیا۔ دوسری کشتی کے آدم خور ہماری طرف بڑھے۔ ہم نے دوبارہ پستول بھر کر ان پر گولیاں چلائیں۔ دو اس کشتی میں سے بھی ڈھیر ہو گئے۔ تیسری کشتی کے آدم خوروں نے ہم پر تیروں کے علاوہ نیزے بھی ہم پر پھینکے۔ ایک نیزہ سیدھا آ کر گڑ گیا۔ فرائی ڈے نے دونوں پستولوں کے فائر جھونک دیئے ان میں ایک کارگر ہوا اور ایک آدم خور ڈھیر ہو گیا۔ اب میری باری تھی۔ میں نے بندوق کا فائر کیا۔ دھماکے کے ساتھ ایک اور آدم خور خون لت پت ہو کر سمندر میں گر پڑا۔ اب صرف دو آدم خور الگ الگ کشتیوں میں رہ گئے تھے۔ اتنے میں ہم نے کنارے پر سے چار اور دشمنوں کی کشتیاں تازہ دم کھیپ لے کر ہمارے مقابلے کو چلی نکلیں۔ میں نے فرائی ڈے سے کہا۔ کہ چپو چلانے شروع کر دو۔ ہماری کشتی اب سمندر میں آگے بڑھنے لگی۔ میں برابر گولیاں برسا رہا تھا۔ دو میں سے ایک اور آدم خور مر گیا۔

میری اندھا دھند فائرنگ سے آدم خوروں کی پچھلی تازہ دم کھیپ کو مزید آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اب میں نے بھی ایک چپو سنبھال لیا۔ اور بڑی تیزی سے سمندر میں کشتی چلانے لگے۔ ہماری کشتی پر سکون سمندر میں جزیرے کو پیچھے چھوڑتی جا رہی تھی۔ آدم خوروں کے تیر اب سمندر میں گر رہے تھے۔ ہم آگے نکل آئے۔ وحشی لوگ پیچھے رہ گئے۔ اس لئے کہ وہ ہماری گولیاں سے ڈر گئے تھے۔ اور اب آگے نہیں بڑھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد آدم خور جزیرہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اور دوسری جانب ہمیں اپنے جزیرے کے درخت نظر آنے لگے۔ ہمارے دل مسرت سے لبریز تھے۔ مجھے خاص طور پر بہت خوشی ہو رہی تھی۔ کیونکہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اور میں نے فرائی ڈے کو موت

کے منہ سے بچا لیا تھا۔ اپنے جزیرے پر پہنچ کر ہم نے کشتی کو گھسیٹ کر ساحل کی جھاڑیوں میں چھپا دیا۔ فرائی ڈے نے کہا۔

"ماسٹر! وہ لوگ شاید پھر کوئی بڑا حملہ کریں۔ اس لئے میرا خیال ہے۔ کہ ہمیں اپنی کشتی کو جزیرے کے جنوبی ساحل پر چھپا دینا چاہیئے۔"

فرائی ڈے کا خیال بڑا مناسب تھا۔ ہم کشتی میں بیٹھ کر اسے کھیتے ہوئے جزیرے کے جنوبی ساحل کی طرف لے گئے اور اسے ساحل کی جھاڑیوں میں چھپا دیا۔ یہاں سے ہم سیدھا اپنے کیبن میں آ گئے۔ میں تو بے حد تھک گیا تھا۔ یہی حال فرائی ڈے کا تھا۔ فرائی ڈے طوطے اور کتے کے لئے روٹی پکانے لگا۔ میں تخت پوش پر سونے کے لئے لیٹ گیا طوطا اور کتا میرے ساتھ لگ کر مجھے پیار کرنے لگے۔ طوطا بار بار ٹیں ٹیں کرتا میرے کندھے پر پھڑپھڑا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے نیند آ گئی۔ میں ایسے گھوڑے بیچ کر سویا کہ شام کو آنکھ کھلی۔ شام کو ہم ساحل کی نگرانی کرنے گئے۔ ہمیں ڈر تھا کہ دشمن حملہ ضرور کرے گا۔ بہرحال ہم تیار تھے۔ رات کو میں نے آدھی رات تک پہرہ دیا اور پھر سو گیا۔

اگلے روز اٹھ کر میں نے فرائی ڈے کو ساتھ لیا اور جنوبی ساحل پر جا کر اپنی کشتی کو دیکھا۔ وہ اسی طرح موجود تھی۔ ہم نے کشتی میں سوار ہو کر سارے جزیرے کے ساحل کا ایک چکر لگایا حالات بالکل معمول پر تھے۔ سمندر پر دور دور تک کسی دشمن کا نشان تک نہ تھا۔ واپس آ کر ہم اپنی کشتی بنانے میں مصروف ہو گئے اب مجھے فرائی ڈے نے اپنے اغوا کا مختصر سا قصہ سنایا۔ اور وہ یوں تھا کہ فرائی ڈے حسب عادت کشتی بنانے میں محو تھا کہ پیچھے سے آدم خوروں نے آ کر اس کے منہ میں گھاس کا گولا ٹھونس کر اسے ڈولی ڈنڈا کر کے اٹھا کر لے گئے۔

"مسٹر! میرے دل میں ایک خیال ضرور آتا تھا۔ کہ شاید آپ مجھے بچانے آئیں۔ پھر سوچتا کہ آپ تو کبھی پہلے اس جزیرے پر نہیں آئے۔ میں ایک طرح سے اپنی زندگی سے ناامید ہو گیا تھا۔ میں ان لوگوں کی قید میں تھا جو میرے خاندان کی جان کے دشمن تھے۔ وہ مجھے کھانے کو دو وقت شکر قندی دیتے تھے جسے میں زہر مار کر لیا کرتا تھا۔ مجھے اندھیرے جھونپڑے میں ماسٹر تم بہت یاد آتے تھے

اگر تم میری مدد نہ کرتے ماسٹر! تو وہ لوگ میری تکا بوٹی کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔"

میں نے کہا۔" کیا خیال ہے۔ ہمیں ان کے دوسرے حملے کے لئے ابھی سے تیاری کر لینی چاہیئے۔"

فرائی ڈے نے کہا۔" ہاں ماسٹر! یہ بہت ضروری ہے۔ وہ آئیں یا نہ آئیں۔ لیکن ہمیں ان کے حملے کا جواب دینے اور اسے روکنے کے لئے ابھی سے بندوبست کر لینا چاہیئے۔"

ہم زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے تھے کہ رات کو باری باری کیبن کے اندر مورچہ بنا کر پہرہ دیا کریں۔ بارود کی ایک پوری بوری ابھی ہمارے پاس تھی۔ اسی طرح سے لوہے کی گولیاں بھی ایک تھیلے میں بھری پڑی تھیں۔ یہ وہ اسلحہ اور بارود تھا۔ جو میں ہمت کر کے اپنے ڈوبتے جہاز سے اٹھا لایا تھا۔ اور جسے میں نے بچا بچا کر رکھا ہوا تھا۔ اس واقعے کے سات روز بعد میرا پیارا اور وفادار کتا مر گیا۔ مجھے اس کی موت کا بڑا صدمہ ہوا۔ وہ ویسے بھی اب بہت بوڑھا ہو گیا تھا۔ اور کیبن میں ایک طرف بیٹھا بھی زبان نکالے ہانپتے ہوئے مجھے دیکھتا رہتا تھا۔ ہم نے صلیب والی پہاڑی کے اوپر اس کو ایک قبر میں دفن کر دیا۔ میں نے اس کی قبر پہ ایک تختی لگا دی جس پر لکھا تھا۔

"میرا وفادار کتا۔"

دوسرے ہفتے طوطا بھی مر گیا۔ یہ ایک اور صدمہ تھا۔ جو میرے دل پر گذرا۔ خدا جانے قدرت مجھے کیا دن دکھانے چاہتی تھی کہ اوپر تلے یہ دو دردناک وارداتیں گذر گئیں میں نے کتے کے ساتھ ہی پہاڑی پر طوطے کی بھی ایک قبر بنا کر اس پر اس کے نام کی تختی کھود کر لگا دی۔ اسی طرح پندرہ بیس روز گذر گئے۔ کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ فرائی ڈے کہنے لگا

"ماسٹر! میرے قبیلے کے لوگ ضرور تیاریاں کر رہے ہیں۔ وہ مجھے کسی قیمت پر معاف نہیں کریں گے۔ وہ مجھے ہر حالت میں اغوا کر کے لے جانے آئیں گے۔ یہ ان کے دیوتا کی بھی توہین ہوئی ہے۔ جب تک وہ دیوتا کو خوش نہیں کر لیں گے، وہ چین سے نہیں بیٹھیں گے۔"

میں نے کہا۔" فرائی ڈے! اگر وہ آتے ہیں تو آنے دو۔"

فرائی ڈے بولا۔" لیکن ماسٹر! اس بار وہ زیادہ فوج لے کر آئیں گے۔ ہم دو آدمی شاید ان کے لشکر کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔"

میں نے کہا۔" فرائی ڈے! ہم اس جزیرے پر صرف دو انسان ہیں۔ ہم دونوں کو ہی اپنے دشمن کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ ہماری مدد کے لئے باہر سے کوئی فوج نہیں آ سکتی۔ اس لئے ہمیں ہمت نہیں ہارنی چاہیئے۔"

فرائی ڈے کچھ پریشان تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس کی پریشانی بے جا نہیں تھی وہ اپنے قبیلے والوں کے بارے میں بڑے صحیح خدشات کا اظہار کر رہا تھا۔ اس بات کے تیسرے دن میں اور فرائی ڈے سمندر کے کنارے ٹہل بھی رہے تھے اور دیکھ بھال بھی کر رہے تھے کہ ہم نے دور ساحل کی ریت پر کسی شئے کو پڑے دیکھا۔ میں نے جھٹ دوربین لگائی اور پھر فرائی ڈے سے کہا۔

"جلدی چلو فرائی ڈے۔ مجھے یہ کوئی توپ معلوم ہو رہی ہے۔"

ہم بھاگتے ہوئے اس مقام تک آئے۔ وہ سچ مچ ایک درمیانے سائز کی بڑی توپ تھی ایسی توپیں جنگی جہازوں کے عرشے پر لگی ہوتی ہیں۔ وہ ایک لکڑی کے تختے پر جکڑی ہوئی تھی اور ایک پہلو پر پڑی تھی۔ ہم دونوں نے مل کر اسے سیدھا کیا۔ وہ بہت وزنی توپ تھی۔ فرائی ڈے نے پوچھا۔

"ماسٹر! یہ کیا ہے؟"

اس نے آج تک توپ نہیں دیکھی تھی۔ وہ اسے بڑی حیرانی سے اوپر نیچے تک رہا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ اسے توپ کہتے ہیں۔ اس میں اتنی طاقت ہوتی ہے۔ کہ اگر اسے دشمن کی طرف منہ کر کے چلایا جائے تو ایک ہی گولے سے کتنے ہی آدمیوں کے پرخچے اڑا سکتی ہے۔ میرے اتنا بتانے پر فرائی ڈے بڑا خوش ہوا اور ناچنے لگا۔ بولا۔

"ماسٹر! دیوتا ہم پر مہربان ہیں۔ انہوں نے دشمن سے مقابلہ کے لئے یہ توپ بھیج دی ہے۔ آؤ اسے کیبن کے باہر لے جا کر لگا دیں۔"

میں نے کہا۔" فرائی ڈے! ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اس نے عین اس وقت ہماری

مدد کی جب کہ ہمیں اس کی مدد کی شدید ضرورت تھی۔"

میرا خیال ہے۔ کہ یہ توپ اس جنگی جہاز کی توپ تھی۔ جسے بحری ڈاکوؤں نے سمندر میں غرق کر دیا تھا۔ توپ چونکہ لکڑی کے ایک موٹے تختے پر لگی تھی۔ اس لئے کسی تیز لہر کے ساتھ ابھر کر سطح سمندر پر آ گئی اور وہاں سے سمندر کی موجیں اسے بہا کر کنارے پر پھینک گئیں۔ اب سوال توپ کو کیبن تک لے جانے کا تھا۔ ہمارا کیبن وہاں سے سو ڈیڑھ سو گز اندر جنگل کے کنارے پر تھا۔ توپ اتنی بھاری تھی۔ کہ ہم اسے اٹھا کر نہ لے جا سکتے تھے۔ ہاں اسے گھسیٹ کر لے جا سکتے تھے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ اس کے نیچے کسی درخت کے تنے کو ڈال دیا جائے۔ میں نے فرائی ڈے کو یہ ترکیب بتائی۔ ہم کلہاڑے لے کر ایک درخت کو کاٹنے لگے درخت کو کاٹ کر ہم لڑھکاتے ہوئے اسے توپ تک لائے۔ بڑی مشکل سے توپ کے تختے کو درخت کے تنے کے اوپر رکھا۔ ہم نے تنے کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے۔ یوں ہم توپ کو خشک کر کے پونچھنا شروع کر دیا۔ دوپہر تک ہم توپ کو صاف کرتے رہے۔ دوپہر کے بعد وہ خوب چمکنے لگی۔ میں نے فرائی ڈے سے کہا۔

"فرائی ڈے! اگر اس کا رخ ایک طرف کو یعنی سمندر ہی کی طرف رہا تو ہو سکتا ہے۔ دشمن دوسری طرف سے حملہ کر دے۔ ایسی صورت میں یہ توپ بیکار ہو جائے گی۔ اس لئے میرا خیال ہے۔ کہ اسے اس انداز سے یہاں رکھا جائے کہ اس کا رخ تینوں طرف کو گھمایا جا سکے۔"

فرائی ڈے نے کہا۔ "ماسٹر! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

بے چارے فرائی ڈے کا دماغ اتنا زیادہ تیز نہیں تھا۔ میں نے اس پر پوری سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا۔ میں نے آخر اس کا حل تلاش کر لیا۔ میں نے اسی وقت فرائی سے کہا۔

"فرائی ڈے بکری کی جتنی خشک کھالیں سٹور میں پڑی ہیں انہیں کاٹ کر اور جوڑ کر ایک لمبا رسہ تیار کر دو۔"

فرائی ڈے نے حیرانی سے پوچھا۔

"ماسٹر! چمڑے کا رسہ کس لئے؟"

"تم بکری کی ساری کھالیں کلہاڑی سمیت باہر لے آؤ۔"

فرائی ڈے اسی وقت کیبن کے اندر گیا۔ اور بکری کی جتنی کھالیں پڑی تھیں، کندھے پر ڈال کر باہر لے آیا۔ ہم نے ساری کھالوں کو لمبے رخ سے کاٹ کر اس کے لمبے اور چوڑے فیتے تیار کر لئے۔ پھر انہیں آپس میں جوڑ دیا اور مروڑ کر ایک لمبا رسہ تیار کر لیا۔ اس رسے کو میں نے فرائی ڈے کی مدد سے توپ کے دونوں پہیوں کے درمیان میں ڈالا اور پھر اس کو اوپر درخت کے مضبوط ٹہنے سے جا کر باندھ دیا۔ اس کے بعد میں نے اسے دونوں طرف سے لکڑی ڈال کر بل دینا شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ توپ زمین سے دو فٹ اوپر اٹھ آئی اور فضا میں جھولنے لگی۔ اب ہم جس طرف چاہیں توپ کو گھما سکتے تھے۔

"ماسٹر!" فرائی ڈے خوش ہو کر بولا۔ "یہ تو کمال ہو گیا ہے۔ اب دشمن جدھر سے بھی آئے ہماری توپ کی زد میں ہو گا۔"

اور اس میں شک بھی کوئی نہیں تھا۔ توپ گویا اب ایک جھولے میں پڑی تھی۔ اور بڑی آسانی سے آگے پیچھے اور دائیں بائیں مڑ سکتی تھی۔

"فرائی ڈے اب ایسا کرو کہ اندر کیبن سے بارود کی بوری اور لوہے کی چھوٹی بڑی گولیاں کی بوری اٹھا کر یہاں لے آؤ۔"

فرائی ڈے بارود اور لوہے کی گولیوں کی دونوں بوریاں کیبن سے اٹھا کر باہر لے آیا۔ ہم نے توپ کے پاس ہی گڑھا کھود کر دونوں بوریوں کو اس میں ڈال کر اوپر جھاڑیاں ڈال کر انہیں چھپا دیا۔ میں نے احتیاطاً کچھ پتھر بھی اٹھا کر ان کا وہاں ڈھیر لگا دیا کہ اگر دشمن سے مقابلے کے دوران گولیاں ختم ہو جائیں تو توپ کے اندر پتھر ڈال کر بھی حملہ کیا جا سکے۔ میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا کہ بھلا اتنا لمبا چوڑا بندوبست کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میرے خیال میں آدم خور اول تو ادھر آتے ہی نہ اور اگر آئے بھی تو تھوڑے بہت رات کو چھپ کر آئیں گے۔ رات کے لئے ہم نے باری باری ڈیوٹی لگا رکھی تھی۔ پہلی رات فرائی ڈے پہرہ دیتا اور پچھلی رات میں پہرہ دیتا۔

اسی طرح پندرہ دن اور گذر گئے۔ کسی آدم خوروں کے لشکر نے ہمارے جزیرے پر حملہ نہ کیا۔ میں نے رات کو پہرہ دینا چھوڑ دیا۔ فرائی ڈے نے بہت کہا۔ کہ کہیں وہ لوگ نہ آ جائیں

اور غفلت میں ہماری توپ کو نقصان نہ پہنچ جائے ۔ مگر میں نے کہا کہ وہ آئیں گے تو دیکھ جائے گا۔ دراصل میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔ کہ آدم خور ایک بہت بڑا آخری حملہ کرنے کی زبردست تیاریاں کر رہے ہیں۔ جس قدر زبردست انہوں نے حملہ کیا اگر ہمارے پاس توپ نہ ہوتی تو ہم زندہ نہیں بچ سکتے تھے۔ یہ حملہ اچانک ہوا - اس دن آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا بھی چل رہی تھی۔ میں اپنی عادت کے مطابق صلیب والی پہاڑی پر دوربین لے کر گیا تاکہ دور سمندر میں کسی جہاز کو دیکھ سکوں ۔ جہاز تو اب کبھی کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ آج بھی سمندر دور تک ویران اور خالی تھا۔ کوئی جہاز نہیں تھا۔

میں نے دوربین گلے میں ڈالی اور پہاڑی پر سے اتر کر نیچے آگیا۔ شام ہو رہی تھی ابھی آسمان پر دن کی کافی روشنی تھی۔ سمندر میں دن کی روشنی بہت دیر تک رہتی ہے ۔ آدم خوروں کا خیال تھا کہ اور بالکل ٹھیک خیال تھا کہ زیادہ تعداد لے کر جائیں گے ۔ اور فتح حاصل کر لیں گے ۔ خواہ دن کی روشنی میں جائیں ۔ خدا لگتی کہوں گا کہ اگر وہ اتنی بھاری تعداد کے ساتھ عین دوپہر کے وقت ہمیں اطلاع دے کر بھی آتے تو ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور اگر انہیں کوئی جاسوس جا کر یہ بتا دیتا کہ ہمارے کیبن کے آگے سمندر کے کنارے پر ایک خوفناک توپ لگی ہے۔ تو پھر وہ کبھی اس جزیرے کا رخ نہ کرتے

لیکن قسمت میں جو لکھا تھا وہ ہو کر رہا۔ میں دوربین گلے میں لٹکائے سر جھکائے ہاتھ کمر پر رکھے آگے کو جھکا ہوا اپنے خیال میں مگن گیلی ریت پر قدم اٹھاتا واپس کیبن کی طرف آ رہا تھا کہ اچانک مجھے دور سے کچھ شور سا سنائی دیا۔ میں نے منہ اٹھا کر سمندر کی طرف دیکھا تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے جھٹ دوربین لگائی۔ آدم خوروں سے بھری ہوئی بیس پچیس کشتیاں نیزے لہراتیں شور مچاتیں نعرے لگاتی ساحل کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھیں۔ ادھر سے فرائی ڈے بھاگتا ہوا میری طرف آیا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔

"ماسٹر! وہ آگئے...... وہ آگئے۔"

"گھبراؤ نہیں فرائی ڈے ..... ہماری توپ اُن کے حملے کا منہ توڑ جواب دے گی۔"

ہم جلدی جلدی بھاگتے ہوئے اپنی توپ کے پاس آگئے۔ گڑھے میں سے بارود کی بوری اور سکے سے بھری ہوئی بوری باہر نکالی گئی۔ میں نے توپ میں بہت سارا بارود ڈال کر

[اس] کا منہ لوہے کی چھوٹی بڑی گولیاں سے بھر دیا۔ چقماق کے پتھر سے ایک طرف آگ لگا کر [د]رختوں کی شاخیں اس پر ڈال دیں۔ اب ہم دشمن کے خیر مقدم کے لئے پوری طرح تیار تھے [ف]رائی ڈے توپ کے اُوپر چڑھ کر کھڑا تھا۔ میں نے اُسے پرے ہٹا کر کھڑا کر دیا۔ اور اسے بتایا [ک]ہ جب میں توپ کو آگ دکھاؤں تو اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر زمین پر بیٹھ جائے ۔ [م]یں نے بھی اپنے کانوں میں بکری کی اون کے پھاہے ٹھونس لئے تھے ۔

دشمن اب جزیرے کے ساحل پر پہنچ گیا۔ ان کی کشتیاں ساحل کی ریت پر آ کر رک گئی تھیں اور سارے کے سارے کشتیوں سے اتر کر تیر کمان تیار کئے ہمارے کیبن کی طرف بڑھ رہے تھے ایک آدم خور جوان کا سردار تھا۔ نیزہ ہاتھ میں لیے سر پر کسی جانور کی سری باندھے آگے آگے آ رہا تھا۔ وہ اونچے اونچے جنگی نعرے لگا رہے ہیں۔ فرائی ڈے نے کہا کہ یہ آگے سردار ہے اور یہ وہ نعرے لگا رہے ہیں۔ جو دیوتا کے لئے جنگ کرنے جاتے ہوئے لگاتے ہیں۔ گویا ایک طرح سے وہ مذہبی جنگ کرنے آ رہے تھے۔ میں نے توپ کو بالکل تیار کر رکھا تھا۔ اب میں اس انتظار میں تھا۔ کہ وہ توپ کی زد میں آجائیں۔ ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ کیبن کے پاس ایک بھیانک آفت ان کی راہ دیکھ رہی ہے ۔ وہ نیزے لہراتے نعرے لگاتے بڑھے چلے آ رہے تھے ۔ ان کی تعداد سو ڈیڑھ سو سے کسی طرح بھی کم نہیں تھی ۔ جب میرے کیبن اور سمندر کے ساحل کے درمیان آدھا فاصلہ رہ گیا تو انہوں نے میرے کیبن پر تیروں کی پہلی باڑھ ماری۔

ایک بوچھاڑ سی میرے کیبن کی دیوار سے آ کر ٹکرا گئی۔ ہم زمین پر بیٹھ گئے تھے۔ فرائی ڈے گھبرا رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"ماسٹر! دشمن سر پر آگیا ہے۔ اس توپ کو چلا دیں۔"

"تم خاموش رہو فرائی ڈے! میں زیادہ بہتر جانتا ہوں کہ توپ کو کب چلانا ہے۔"

میں دوربین لگائے دشمن کا جائزہ لینے لگا۔ وہ جسموں پر لال لال رنگ کی لکیریں ڈالے خونخوار چہرے لئے ہماری تکا بوٹی کرنے آگے بڑھ رہے تھے میں نے دوربین آنکھوں سے ہٹا لی۔ کیونکہ دوربین سے ان کے اور توپ کے درمیان درست فاصلے کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ اب وہ بہت قریب آگئے تھے ۔ فرائی ڈے تو ڈر کر کیبن کے پیچھے بھاگ گیا۔ اب

توپ چلانے کا وقت آگیا تھا۔ میں نے دور پڑے جلتی ہوئی آگ میں سے ایک شاخ اٹھائی اور بارود کو دکھا دی۔ بارود کو آگ دکھانے کی دیر تھی کہ اس زور سے دھماکا ہوا کہ سارا جزیرہ گونج اٹھا۔ یوں لگا جیسے کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑا ہو۔ توپ کی اس باڑھ نے جو تباہی مچائی وہ دیکھنے کے لائق تھی۔ آدم خوروں کی پہلی قطار کے سارے کے سارے آدم خوروں کے پرخچے اڑ گئے۔ فرائی ڈے زمین پر اوندھے منہ گرا تھا اور کانپ رہا تھا میں نے تیزی سے توپ کو دوبارہ بھر دیا۔ اور ایک بار پھر بارود کو آگ دکھا دی۔ اس دفعہ پھر خوفناک دھماکا ہوا۔ اور آدم خوروں کی دوسری قطار بھی خون آلود لوتھڑے بن کر فضا میں بکھر گئی۔ میں نے تیسری بار پھر توپ کو بھر دیا۔ آگ دکھانے سے پہلے میں نے آدم خوروں کو دیکھا۔ ان کی آدھی سے زیادہ تعداد مر گئی تھی۔ باقی بوکھلا گئے تھے۔ وہ تیر چلانا بھی بھول گئے تھے۔ کچھ وہیں بت بن کر کھڑے کے کھڑے رہ گئے تھے۔ کچھ واپس سمندر کی طرف بھاگ اُٹھے تھے۔

میں نے بارود کو آگ دکھا دی۔ ایک اور زوردار دھماکا ہوا اور جو آدم خور کھڑے تھے۔ وہ بھی ہوا میں اڑ گئے۔ بھاگتے ہوؤں نے خوف زدہ ہو کر اور زیادہ زور سے بھاگنا شروع کر دیا۔ وہ پاگلوں کی طرح بھاگ رہے تھے۔ وہ کشتیوں میں سوار ہوئے اور انہوں نے اتنی زیادہ تیز رفتاری سے چپو چلائے کہ دیکھتے دیکھتے وہ دور سمندر میں جا چکے تھے۔ میں نے فرائی ڈے کو زمین سے اٹھایا۔ وہ خوف سے کانپ رہا تھا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے توپ کی طرف دیکھا اور کہا۔

"ماسٹر! یہ کیا شے ہے؟"

میں ہنس پڑا۔ "فرائی ڈے! اب وہ کبھی ادھر کا رخ نہیں کریں گے۔"

میں نے جا کر ریت پر دیکھا۔ وہاں آدم خوروں کی لاشوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ریت پر بکھرے پڑے تھے۔ کوئی بھی لاش صحیح و سالم نہیں تھی۔ ڈر سے بھاگ ہوئے آدم خور کشتیوں میں بیٹھ کر فرار ہو چکے تھے۔

"ماسٹر! اس توپ نے تو کمال کر دیا۔ اس کی مدد سے تم ہم اپنے جزیرے پر قبضہ کر سکتے ہیں۔"

"ہاں فرائی ڈے! مگر ہمیں جزیرے پر قبضہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا تم وہاں جانا چاہتے ہو؟

"میں اب وہاں جا کر کیا کروں گا۔ ماسٹر! میرا اب وہاں کون ہے؟ ویسے بھی میں اب آدم خوروں کی زندگی سے تنگ آگیا ہوں۔ میں ان وحشیوں کے درمیان واپس نہیں جانا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی بڑے شہر میں جا کر کام کروں اور اپنی روزی کماؤں۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ فرائی ڈے! تم نے بڑی اچھی بات سوچی ہے۔ اگر میں اس جزیرے سے نکل سکا تو وعدہ کرتا ہوں۔ کہ تمہیں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوں گا۔"

فرائی ڈے نے کہا۔ "ماسٹر میں ساری زندگی تمہاری خدمت کروں گا۔"

"فرائی ڈے! اب ہمارے سامنے جزیرے میں زندگی کا ایک ہی مقصد رہ گیا ہے کہ اپنی بڑی کشتی کو جلد سے جلد مکمل کریں اور اس میں ایک مہینے کا پانی اور خوراک رکھ کر سمندر میں نکل پڑیں۔ خدا نے چاہا تو ایک نہ ایک دن ٹرینی دار کے ساحل پر جا پہنچیں گے۔"

ہم نے توپ کو خوب اچھی طرح سے صاف کیا۔ باقی بچا ہوا بارود اور گولیاں کیبن میں لے جا کر رکھ دیں۔ اس رات ہم بڑے آرام کی نیند سوئے۔ صبح ہوئی تو ضروری کاموں سے فارغ ہو کر فرائی ڈے زیر تعمیر کشتی کی جانب چلا گیا اور میں دوربین لے کر صلیبی پہاڑی پر آ گیا۔ میں دور سمندر میں دیکھنے لگا۔ کسی جہاز کا نام و نشان تک نہ تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اب میرا اس جزیرے میں ایک پل کے لئے بھی جی نہ لگتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے اس منحوس جزیرے کو خیرباد کہہ دوں جہاں میں نے اپنی جوانی برباد کر دی تھی اور بوڑھا ہو گیا تھا۔ میں پہاڑی پر سے اتر کر فرائی ڈے کے پاس آ گیا۔ وہ کشتی کی چھت پر میخ ٹھونک رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ ہلا کر کہا

"ماسٹر! بس کشتی تیار ہو گئی ہے۔ ایک ہفتے بعد ہم اس جزیرے کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیں گے۔"

فرائی ڈے کے یہ الفاظ کہ ہم ایک ہفتے بعد اس جزیرے کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیں گے مجھے عجیب سے لگے۔ کیا یہ منحوس جزیرہ اب میری رہائی پر آمادہ ہو جائے گا مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے بچپن میں اپنے باپ سے ایسی کہانیاں سنی تھیں جن میں ایک جہازی جہاز غرق ہونے کے بعد کسی ویران جزیرے پر نکل آیا۔ وہاں اس نے بڑی تکلیفیں برداشت کیں اور پھر ایک روز ایک جہاز وہاں آیا اور اسے اٹھا کر پھر سے مہذب دنیا میں لے گیا۔ میں نے ایسی کوئی کہانی نہیں سنی تھی۔ کہ جس میں ایسے جزیرے پر گیا ہوا انسان ساری عمر کے لئے وہیں قید ہو کر رہ گیا ہو۔ شاید سمندری جزیروں کی تاریخ میں یہ پہلا المناک حادثہ تھا جو میرے ساتھ ہوا تھا۔ میں اپنی بدنصیبی پر جتنا بھی ماتم کرتا کم تھا۔

میری ساری امیدیں اب اپنی بنائی ہوئی کشتی پر ہی لگی تھیں۔ میری مدد کو کوئی جہاز تو نہیں آیا تھا۔ لیکن یہ ایک کشتی ضرور مجھے اس جزیرے سے نجات دلا سکتی تھی۔ ایک نئے عزم کے ساتھ میں فرائی ڈے کے ساتھ کشتی کی تعمیر میں لگ گیا۔ ہم سارا دن کشتی پر کام کرتے رہتے۔ دو دن کے بعد کشتی بالکل تیار ہو چکی تھی۔ اب ہم نے کیبن میں سے ضروری چیزیں لا کر اس میں احتیاط سے رکھنی شروع کر دیں۔ لکڑی کے ایک بہت بڑے ڈرم کو پانی سے بھر دیا۔ روٹی کے بے شمار سوکھے ٹکڑے اور بکری کا خشک گوشت ایک صندوق میں بھر کر وہاں رکھ دیا۔ اس کے علاوہ سمندری سفر میں ہمیں جس شے کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ وہ ہم نے اپنی کشتی میں لا کر جمع کر دیا اب ہم اچھے موسم کا انتظار کرنے لگے۔ ابھی سمندر میں طوفان آنے کے دن تھے اور بارشیں بھی شروع ہونے والی تھیں۔ ہم نے سوچا کہ بارشوں کا موسم ختم ہوتے ہی ہم اس جزیرے کو چھوڑ دیں گے۔

ایک روز میں ساحل کی ریت پر فرائی ڈے کے ساتھ چہل قدمی کر رہا تھا۔ کہ اچانک میری نظر سمندر میں ایک ڈونگا نما کشتی پر پڑی۔ یہ ہمارے جزیرے کی طرف آ رہی تھی میں نے فرائی ڈے کو وہ کشتی دکھائی اور پوچھا کہ اس کے خیال میں یہ کون ہو سکتا تھا؟ فرائی ڈے نے دوربین میں دیکھ کر کہا۔ کہ یہ جزیرے کا کوئی آدم خور ہے۔ میں نے پستول نکال لیا۔ ڈونگا نما کشتی کنارے پر آ کر رک گئی۔ اور اس میں سے ایک آدم خور وحشی نکل کر بھاگتا ہوا ہماری طرف آیا تھا اور کچھ فاصلے پر سجدے میں گر گیا۔ فرائی ڈے نے اسے پہچان

کہا

"یہ تو میرے باپ کا دوست ہے۔"

میں نے اسے اٹھنے کے لئے کہا اور پوچھا کہ وہ کیوں آیا ہے؟ اس آدم خور نے ہاتھ جوڑ کر کہا

"ماسٹر! ظالم سردار نے آپ سے عبرت ناک شکست کھانے کے بعد جزیرے پہ فرائی ڈے کے باپ کے تمام وفادار آدمیوں اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قید میں ڈال دیا ہے۔ وہ ان سب کو دیوتا کی خوشی کے لئے پورے چاند کی رات کو قربان کرنے والا ہے۔ میں بڑی مشکل سے جان بچا کر آپ کے پاس آیا ہوں ہمارے بچوں کی جان بچاؤ۔ ہمیں اس ظالم سردار سے نجات دلاؤ۔"

میں نے فرائی ڈے کی طرف دیکھا اور آدم خور سے پوچھا

"لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہم تم لوگوں کو ظالم سردار سے کیوں کر نجات دلا سکتے ہیں؟"

آدم خور بولا۔ "ماسٹر! تمہارے پاس جادو ہے۔ تم جادو کے زور سے دشمن کو ہلاک کر دیتے ہو۔ تمہارے پاس جو چھوٹا آتش فشاں پہاڑ ہے۔ اسے لے کر ہمارے جزیرے کو فتح کرو اور سردار کو ٹھکانے لگاؤ۔ ہم تمہیں دعائیں دیں گے نہیں تو سردار ہماری عورتوں، ہماری ماؤں بہنوں اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو ذبح کروائے گا۔"

میں نے فرائی ڈے سے کہا

"تمہارا کیا خیال ہے فرائی ڈے! کیا ہمیں ان لوگوں کی مدد کرنی چاہیئے"

فرائی ڈے بولا۔ "ماسٹر! یہ لوگ ہمیشہ میرے باپ کے وفادار رہے ہیں۔ انہوں نے ہر مشکل وقت میں میرے باپ کا ساتھ دیا ہے۔ میں ضرور اس مصیبت کے وقت ان کی مدد کروں گا۔ آپ مجھے اجازت دیں کہ میں کشتی میں توپ لے کر اپنے جزیرے پر جاؤں اور ان لوگوں کو ظالم سردار سے نجات دلاؤں۔"

میں نے کہا۔ "فرائی ڈے! تم اکیلے توپ نہیں چلا سکو گے۔ میں تمہاری زندگی خطرے

میں نہیں ڈالوں گا۔ اگر تم اپنے باپ کے وفادار قبیلے کی ضرور مدد کرنا چاہتے ہو
تو میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

فرائی ڈے اور وہ آدم خور میرے اس فیصلے پر بہت خوش ہوئے۔ میں نے اس آدم خور
کو تو واپس بھیج دیا اور خود جزیرے پر حملہ کرنے کی سکیم پر غور کرنے لگا۔ توپ کا وزن زیادہ
تھا اس لئے ہم اسے چھوٹی کشتی پر نہیں لے جا سکتے تھے۔ اس میں خطرہ تھا۔ توپ اگر جا سکتی تھی
تو صرف بڑی کشتی پر ہی جا سکتی تھی۔ بڑی کشتی پر ہم نے جزیرے سے ہمیشہ کے لئے جدا ہونے
کی غرض سے ضروری سامان رسد لاد رکھا تھا۔ آخر یہی فیصلہ ہوا کہ توپ کو بڑی کشتی پر ہی رکھ
کر جزیرے پر دھاوا بولا جائے۔ چنانچہ ہم نے اس پر لادا ہوا سامان اتار کر دوبارہ کیبن میں
سنبھال کر رکھا تھا۔ اس کی جگہ ہم نے بڑی توپ کو کشتی پر رکھا اور اسے رسوں کی مدد سے کھینچتے
ہوئے سمندر کے کنارے لے گئے۔ یہ کام بڑا وقت طلب تھا کیونکہ توپ رکھنے سے کشتی کا
وزن بڑھ گیا تھا۔ بہرحال رات ہونے سے پہلے پہلے ہم نے یہ کام کر لیا۔ توپ کو ہم نے اس طرح
سے لادا کہ اس کا رخ سامنے کی طرف تھا۔ گولہ بارود بھی کشتی میں بھر لیا گیا۔ رات کو ہم منصوبے
پر غور کرتے رہے کہ حملہ کس وقت کیا جائے۔ اگرچہ موسم کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ لیکن ہمارا
جلدی حملہ کرنا بہت ضروری تھا۔ کیونکہ چاند رات دو ایک دنوں کے بعد پڑ رہی تھی۔ اور
سینکڑوں عورتوں اور بچوں کی زندگیاں شدید خطرے میں تھیں۔ میں نے فرائی ڈے سے
فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"فرائی ڈے! ہم آج صبح منہ اندھیرے آدم خوروں کے جزیرے پر حملہ کر رہے ہیں۔"
وہ میرا منہ تکنے لگا۔ اسے مجھ سے اتنی پھرتی کے ساتھ فیصلے کی توقع نہیں تھی۔ میں نے
اُسے بتایا کہ اس معاملے میں تاخیر بہت مہلک ہو سکتی ہے۔ اگر ہم سینکڑوں بچوں، مردوں
اور عورتوں کی زندگیاں بچانا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیئے۔ پس صبح کا وقت
طے ہو گیا۔ رات گئے تک ہم تیاریاں کرتے رہے۔ صبح منہ اندھیرے جبکہ ابھی تاریکی ہی تھی
میں اور فرائی ڈے کیبن سے نکل کر کشتی میں آ گئے اور کشتی کو کھلے سمندر کی طرف لے جانے لگے
ہماری یہ کشتی پہلی بار سمندر کے پانیوں میں اُتری تھی۔ ہم دونوں اپنی کارکردگی پر بڑے خوش
ہوئے۔ کیونکہ کشتی بڑی عمدگی سے بہی چلی جا رہی تھی۔ سمندر کی لہروں پر صبح کی ہلکی ہلکی

نظروں سے اوجھل ہو گیا اور آدم خوروں کا جزیرہ دکھائی
وشنی پھیلنے لگی تو ہمارا اپنا جزیرہ
ینے لگا۔

"فرائی ڈے! ہم سامنے سے نہیں بلکہ عقب سے گولہ باری کریں گے۔ کیونکہ
پچھلی طرف سے سردار کا بڑا جھونپڑا ہماری توپ کی زد میں ہو گا۔

"مناسب خیال ہے ماسٹر!"
ہم کشتی کو کھیتے ہوئے جزیرے کے عقبی سمندر میں داخل ہو گئے۔ اب صبح ہو گئی تھی اور
ورج کی کرنوں کی پہلی ملگجی روشنی مشرقی آسمان سے اتر کر سارے جزیرے کے درختوں اور
مندر کی لہروں پر پھیل گئی تھی ہمیں اب آدم خوروں سے چھپنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ
ہمارے پاس توپ تھی۔ ایک بے حد مہلک ہتھیار تھا۔ جس کی دھاک آدم خوروں پر پہلے ہی
بیٹھ چکی تھی۔ ہماری کشتی پیچھے سے ہو کر ایک کھاڑی میں داخل ہوئی۔ یہاں سے درختوں کے
بیچ میں سامنے سردار کی شاہی جھونپڑی کا پچھلا حصہ صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسی جگہ کنارے
پر کشتی پیچھے سے ہو کر ایک کھاڑی میں داخل ہوئی۔ یہاں سے درختوں کے بیچ میں سامنے سردار
کی شاہی جھونپڑی کا پچھلا حصہ صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسی جگہ کنارے پر کشتی روک لی فرائی
ڈے کو بندوق دے کر کہا کہ وہ ذرا پرے اوپر والے درخت پر جا کر چھپ جائے۔ تاکہ اوپر
سے آدم خوروں کو نشانہ بنا سکے۔ میں نے بارود اور گولے اپنے پاس رکھ لئے۔ توپ بھر دی
گئی۔ چقماق کے پتھر میرے ساتھ تھا۔ میں نے توپ کا رُخ سردار کے شاہی جھونپڑے کی دیوار
کی طرف کیا اور بارود کو آگ لگا دی۔

ایک قیامت خیز دھماکا ہوا۔ جزیرے کے درختوں کے پرندے شور مچاتے پھڑپھڑاتے
اڑ گئے۔ جھٹکے سے کشتی پیچھے کو ہٹی۔ میں چپو کی مدد سے اسے پھر آگے لے آیا۔ بارود کا دھواں
ہٹا تو سامنے سردار کے شاہی جھونپڑے کی دیوار غائب تھی وہاں ایک ہنگامہ اور قیامت کا
شور مچا تھا۔ وحشی دیوانوں کی طرح ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ وہ تیر برساتے چیختے چلاتے
ہماری کشتی کی بڑھے۔ اس سے پہلے کہ میں توپ کو دوبارا بھرتا اور درخت میں چھپے ہوئے
فرائی ڈے نے تاک تاک کر آدم خوروں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا وہ گولیاں لگنے سے گرتے
گئے اور بڑھتے گئے۔ میں اس عرصے میں دوبارا توپ میں بارود ڈال چکا تھا۔ میں نے توپ

داغ دی ایک اور دھماکا ہوا اور کتنے ہی وحشیوں کے جسم قیمہ بن کر فضا میں اڑ گئے۔ ان میں ایک بار پھر دہشت پھیل گئی۔ کچھ آدم خور وہیں رک گئے۔ اور کچھ پیچھے بھاگ اٹھے۔ فرائی ڈے ان پر رُک رُک کر بندوق کے فائر کر رہا تھا۔ میں نے تیسری بار توپ چلائی تو سردار کی بچی کھچی جھونپڑی بھی اڑ گئی۔

میں نے چوتھی بار توپ میں بارود بھرا اور اسے آگ دکھا دی۔ بھیانک دھماکے کے ساتھ ان گنت بھاگتے ہوئے وحشی خون میں لت پت ہو کر گر پڑے۔ اب میں نے اُونچی آواز میں ان کے سردار کو ان ہی کی زبان میں پکارا۔

"آدم خوروں کے سردار! ہتھیار ڈال کر میری قید میں آجاؤ۔ میں تم پر رحم نہیں کروں گا۔ تم ہزاروں انسانوں کو قتل کر کے ہڑپ کر چکے ہو۔ میں تمہارے جزیرے کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔"

میری اس للکار کا کسی نے جواب نہ دیا۔ آدم خور لاشیں چھوڑ کر روپوش ہو چکے تھے میں توپ کو کھاڑی میں اور آگے لے آیا۔ اور اسے ایک بار پھر بھر کر دھماکے کے ساتھ چلا دیا۔ اس دفعہ مجھ سے بارود کچھ زیادہ ہی بھر گیا تھا۔ یہ دھماکا اتنا خوف ناک تھا کہ خود میں اس سے لرز گیا۔ سردار کے جھونپڑے کی رہی سہی چھت اور ایک آدھ دیوار بالکل ہی زمین کے ساتھ مل گئی۔ اور ان میں آگ لگ گئی۔ شاید چھت جلتی ہوئی آگ پر گری تھی۔ آگ نے وہاں ایک افراتفری مچا دی۔ میں نے اب توپ کی بجائے پستول سے فائرنگ شروع کر دی۔ تھوڑی دیر بعد آدم خور وحشی ہاتھ بلند کئے سروں کو جھکائے ہماری طرف بڑھنے لگے۔ سردار ان کے آگے آگے تھا۔ اب میں نے فرائی ڈے سے کہا کہ وہ نیچے اتر کر اپنے وفادار ساتھیوں سے کہے کہ وہ ان لوگوں کو سردار سمیت گرفتار کر لیں اور جزیرے پر اپنی حکومت کا اعلان کر دیں۔ فرائی ڈے چھلانگ لگا کر درخت سے نیچے آگیا۔ سردار نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا میں نے ہوائی فائر داغ کر کہا۔

"آدم خور سردار! تیری زندگی کے دن پورے ہو گئے ہیں۔ تو نے لوگوں پر جتنا ظلم کرنا تھا تو کر چکا۔ اب اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دے۔

فرائی ڈے! اپنے آدمیوں سے کہو کہ آگے بڑھ کر سردار کے ہاتھ پیر باندھ ڈالیں۔"

فرائی ڈے بلند آواز سے اپنے آدمیوں کو پکارا۔ ہجوم میں سے کتنے ہی لوگ باہر نکل آئے باقی سردار کے چند ایک آدم خور رہ گئے۔ وفادار وحشیوں نے رسیوں سے سب سے پہلے سردار کی مشکیں کسیں اور پھر باقی آدم خوروں کو بھی قید کر لیا۔ میں کشتی سے اتر کر سردار کے پاس آگیا تھا میرے دونوں ہاتھوں میں پستول تھے۔ میں نے سردار سے کہا۔

"تم نے اس جزیرے کے سب سے پرانے قبیلے کے لوگوں پر بہت ظلم کیا ہے۔ تم اب تک سینکڑوں آدمیوں کو ہڑپ کر چکے ہو اور تمہارے حکم سے ہزاروں انسان اب تک لقمہ اجل بن چکے ہیں۔ اب تمہاری باری ہے۔ تم سے ایک ایک مظلوم انسان کا بدلہ لیا جائے گا۔ بولو! کیا تمہیں کچھ کہنا ہے؟"

سب سے زیادہ سردار کو اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ میں ان وحشیوں کی زبان بڑی روانی سے بول رہا تھا۔ دوسرے وحشی بھی میری طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ ایک دم وہ سارے کے سارے سجدے میں گر پڑے اور مجھے دیوتا دیوتا کہہ کر پکارنے لگے۔ میں نے اُونچی آواز سے کہا۔

"سنو! میں کوئی دیوتا نہیں ہوں۔ دیوتا یہ نوجوان فرائی ڈے ہے۔ یہی تمہارا دیوتا ہے۔ یہی تمہارا سردار ہے۔ ہاں! میرے پاس ایک ایسا ہتھیار ضرور ہے جس کی مدد سے میں تم سب کو ایک پل میں ہلاک کر سکتا ہوں۔ میں سردار کے ساتھیوں کو معاف کرتا ہوں اور انہیں حکم دیتا ہوں۔ کہ وہ فرائی ڈے کی غلامی قبول کر لیں۔ لیکن میں سردار کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

ایک بار پھر سارے وحشی سجدوں میں گر پڑے۔ انہوں نے میرے حکم کو تسلیم کرتے ہوئے فرائی ڈے کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ سردار کو وفادار وحشیوں نے اسی وقت اپنے قبضے میں لے لیا۔ وہ مجھے اور فرائی ڈے کو ایک جلوس کی شکل میں جزیرے کے اندر اس جگہ لے گئے جہاں سینکڑوں عورتیں اور بچے قید تھے۔ انہیں اسی وقت رہا کر دیا گیا۔ وہ خوشی سے ہنستے مسکراتے میرے ارد گرد آکر جمع ہو گئے۔ میں نے بچوں کو پیار کیا۔ ایک وحشی عورت نے میرے گلے

یں پھولوں کا ہار ڈال دیا اور اپنی زبان میں مجھے دیوتا کہہ کر سر جھکا دیا۔
فرائی ڈے میری طرف دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ جزیرے کے لوگوں نے اسی وقت فرائی ڈے کے سردار ہونے کا اعلان کر دیا۔ دوپہر کے بعد جزیرے میں ایک شاندار دعوت دی گئی۔ اس دعوت میں آدم خور عورتوں اور مردوں نے رقص پیش کئے بسالم بکریوں کا گوشت بھون کر کھایا گیا۔ فرائی ڈے نے میرے کان میں کہا کہ یہ صرف میری وجہ سے بکریوں کو بھونا جا رہا ہے۔ نہیں تو آج انہوں نے سردار کو بھون کر کھانا تھا۔ میں نے پوچھا۔

" تو کیا یہ اسے چھوڑ دیں گے ؟ "

فرائی ڈے بولا۔ " نہیں ماسٹر! وہ آج ہی بلکہ ابھی اسے قتل کر کے اس کے جسم کے ٹکڑے آپس میں جا کر اسے مزے لے کر کھائیں گے۔ کیونکہ انہیں معلوم ہے۔ کہ ماسٹر انسانی گوشت کھانے کو پسند نہیں کرتا۔ "

اور ایسا ہی ہوا۔ ضیافت کے ختم ہوتے ہی سردار کو لایا گیا۔ وہ رسیوں میں بندھا ہوا تھا۔ اسے فرائی ڈے کے وفادار ساتھی گھسیٹ کر لا رہے تھے۔ سردار کی بہت بُری حالت تھی۔ وہ سخت پریشان تھا۔ پھر بھی اس کے چہرے پر ایک پُر وقار سکوت تھا۔ اس کی کسی حرکت سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ کہ وہ موت سے خائف ہے۔ سردار کے پیچھے پیچھے ایک آدم خور ہاتھ میں چھرا لئے آ رہا تھا۔ سردار کو درمیان میں لا کر بٹھا دیا گیا۔ سردار میری اور فرائی ڈے کی طرف قہر بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے ایک بار بھی گڑگڑا کر زندگی کی بھیک نہیں مانگی تھی۔ مجھے اس کی یہ بات بہت پسند آئی۔ میں نے کھڑے ہو کر ہاتھ اٹھایا اور کہا۔

" اگر فرائی ڈے اجازت دے تو میں آپ لوگوں سے کہوں گا۔ کہ اس شخص کی جان بخشی کر کے اسے کسی غیر آباد اور دور دراز کے جزیرے پر جلاوطن کر دیا جائے۔ "

فرائی ڈے نے کہا۔ " ماسٹر! میری طرف سے اجازت ہے۔ "

اس پر عورتوں، بچوں اور مردوں نے .... سب سے مل کر شور مچانا شروع کر دیا۔ کہ ہم اس ظالم شخص کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔ جس نے ان کے بے درد قتل عام کا فیصلہ

ھا تھا۔ اور اس میں شک بھی نہیں تھا۔ کہ اگر میں توپ لے کر ان کی مدد کو نہ آتا تو سردار ان بے گناہ بچوں اور عورتوں کی تکا بوٹی کر دینی تھی۔ یہی وجہ تھی۔ کہ وہ لوگ اسے کسی رت معاف کر دینے پر تیار نہیں تھے۔ انہوں نے سردار کے ارد گرد وحشیانہ رقص شروع دیا سردار کو زمین میں میخ گاڑ کر اس کے ساتھ کس کر باندھ دیا گیا تھا۔ مردوں کے بعد رتوں نے سردار کے گرد ناچنا شروع کر دیا۔ ان کے ہاتھ میں تیکھی نوکوں والے بانس کے تھے۔ وہ ناچتے ناچتے سردار کے بدن میں تیروں کے کچوکے لگا رہی تھیں۔ سردار کے جسم پر بگہ جگہ زخم ہو گئے تھے۔ اور ان میں خون رسنے لگا تھا وہ اب بھی خاموش تھا اور اپنی قسمت ر راضی ہو کر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ موت اس کے بالکل سر پر بیٹھی تھی۔ وفادار وحشیوں میں سے یک ادھیڑ عمر کے آدم خور نے اٹھ کر سردار کے سر پر زمین سے مٹی اٹھا کر ڈال دی۔ اس پر ردوں اور عورتوں نے زور سے چیخیں ماریں۔ پھر اس وحشی نے سردار کے سر کو بالوں سے پکڑ کر اس کا منہ اُوپر کر دیا۔

جونہی سردار کا منہ اوپر ہوا۔ چھرے والے وحشی نے سردار کی گردن پر چھرا چلاتے ہوئے اسے بکرے کی طرح ذبح کر دیا۔ خون کا ایک فوارہ چھوٹ کر سامنے گرا۔ آدم خور لپک لپک کر سردار کا خون چلوؤں میں بھر کر پینے لگے۔ سردار کی گردن آدھی کٹ کر ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ عین اس وقت سارے آدم خور چھرے لے کر ایک ہجوم کی صورت میں سردار پر پل پڑے۔ میں اپنی جگہ پر خوف زدہ سا ہو کر یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب وحشیوں کی بھیڑ چھٹی تو جہاں ایک لمحہ پہلے سردار کی لاش پڑی تھی۔ وہاں اب سوائے خون کے نشان کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ آدم خور سردار کی لاش کی بوٹی بوٹی کر کے لے گئے تھے۔ سردار کا سر ایک نیزے پر ٹانگ کر سارے جزیرے میں پھرایا گیا۔ پھر اسے نئے سردار یعنی فرائی ڈے کے باپ کی پرانی جھونپڑی کی چھت پر لٹکا دیا گیا۔ میں نے فرائی ڈے کے اصرار پر وہ رات آدم خوروں کے جزیرے پر ہی بسر کی۔ ساری رات آدم خور ناچتے اور خوشیاں مناتے رہے۔ میں آدھی رات کے بعد سو گیا۔

اگلے دن میں آنے لگا تو فرائی ڈے بھی میرے ساتھ چلنے پر تیار ہو گیا۔ اصل میں اس کا

کا اب ان آدم خوروں میں نہیں لگتا تھا۔ وہ میرے جزیرے پر واپس آنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اسے بڑے دلائل سے سمجھایا کہ اس کی اصل جگہ اسی جزیرے میں ان لوگوں کے درمیان ہے۔ اسے وہیں رہنا چاہیئے۔ اسے ان لوگوں کی اور ان لوگوں کو اس کی ضرورت ہے۔ اسے چاہیئے۔ اسے ان لوگوں کی اخلاقی اصلاح کرے اور آدم خوری کو بالکل جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دے۔ مجھے اس حقیقت کا بھی احساس تھا۔ کہ اگر فرائی ڈے میرے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر سمندر میں نکل پڑا اور ہماری کشتی کسی بندرگاہ پہ پہنچ بھی گئی۔ تو وہ شہروں کی فضا میں زندہ نہ رہ سکے گا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میری باتیں اور دلائل فرائی ڈے کی سمجھ میں آگئے۔ اور اس نے اپنے جزیرے پر رہنا قبول کر لیا۔ میں بہت خوش ہوُا۔ دوسرے روز میں نے توپ اور بارود فرائی ڈے کے حوالے کر دیا۔ دو پستول بھی اسے دے دیئے اور اس سے بغلگیر ہو کر واپس اپنے جزیرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا۔ کہ میں ہفتے میں ایک بار ضرور اس سے ملنے آیا کروں گا۔ فرائی ڈے نے کہا کہ وہ بھی ملنے آتا رہے گا۔

اپنے جزیرے پر پہنچ کر میں نے کشتی کو چٹان کے ساتھ لگا کر باندھا اور اپنے کیبن میں آ گیا۔ فرائی ڈے اپنے پیارے طوطے اور کتے کے بغیر آج مجھے ویران جزیرے کی تنہائی بے حد ویران محسوس ہو رہی تھی۔ صحیح معنوں میں مجھے اکیلا پن کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ تیس بتیس سالوں کی تنہائی گویا ایک دم سے سمٹ کر ایک لمحے میں اکٹھی ہو گئی تھی۔ میں کیبن کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے اب بھی اس جزیرے پر زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ اسی رات مجھے بخار ہو گیا۔ میرا سارا بدن تپنے لگا۔ میں رات بھر بے ہوشی کے عالم میں ہذیان بکتا رہا۔ اگلے روز بھی بخار کم نہ ہوُا۔ اور میں کیبن کے اندر تخت پہ پڑا رہا۔ شام کو جا کر بخار کی شدت کم ہوئی اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ رات بھر میں اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ میرے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ دن نکلا تو میں دوپہر تک تخت پر لیٹا رہا۔ دوپہر کے بعد میں سمندر کے کنارے دھوپ میں آ کر بیٹھ گیا۔ اگرچہ گرمی کا موسم شروع ہو گیا تھا۔ پھر بھی دھوپ مجھے بڑی خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔ میں شام تک وہیں بیٹھا۔ رات کو تھوڑی سی روٹی اور خشک انگور کھا کر سو گیا۔ اس رات مجھے بڑی گہری نیند آئی۔ صبح اٹھا تو طبیعت ہشاش بشاش تھی۔

میں نے چٹان کے ساتھ بندھی ہوئی کشتی پر ضروری سامان لادنا شروع کر دیا۔ اب مجھے لیلے ہی اپنے سفر پر روانہ ہونا تھا۔ فرائی ڈے اپنے جزیرے کا سردار بن کر رہ رہا تھا۔ یہ یک طرح سے اچھا بھی ہوُا تھا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ شہر کی زندگی اسے راس نہیں آئے گی اس کا ان جزیروں میں اپنے وحشی لوگوں کے درمیان رہنا ہی بہتر تھا۔ میں نے کشتی میں جو تھوڑا بہت سامان لادا جا سکتا تھا، جا کر رکھ دیا۔ پانی کا ڈرم بھی رکھ دیا اور خشک انگور کی دو بوریاں اور بکری کے خشک گوشت کے ٹکڑے بھی..... اب میں اچھے موسم کا انتظار کرنے لگا۔ میرے انداز کے مطابق کوئی ایک مہینے کے بعد پر سکون موسم کا آغاز ہونے والا تھا اس رات بادل آگئے۔ ہوا تیز چلنے لگی اور رات کے پچھلے پہر بڑے زور کی بارش شروع ہو گئی بارش اتنی شدید تھی کہ مجھے یوں لگا جیسے میرے کیبن کی چھت یہ بارش برداشت نہیں کر سکے گی۔ اور سچ مچ کیبن کی چھت ٹپکنے لگی۔ میں چٹان کی کھوہ میں سمٹ کر لیٹ گیا۔ ہوا نے طوفان کی صورت اختیار کر لی تھی۔ بادل خوفناک کڑاکوں کے ساتھ گرج رہے تھے۔ درخت یوں وحشیوں کی طرح جھول رہے تھے کہ اب گرے کہ گرے۔ سمندر کی طرف سے لہروں کے چٹان سے ٹکرانے کی بھیانک آوازیں برابر آ رہی تھیں۔ بجلی کڑکتی، بادل گرجتے تو گویا جزیرے میں ایک زلزلہ سا آجاتا۔ طوفان بڑا شدید تھا۔ پچھلے پہر سمندر کی طرف سے چٹانوں کے ٹوٹنے کی مہیب آوازیں آنے لگیں۔

مجھے سب سے زیادہ فکر اپنی کشتی کی تھی۔ جو چٹان کے پاس بندھی ہوئی تھی۔ اور جسے ہم نے شب و روز کی محنت کے بعد بنایا تھا۔ اتنے سخت طوفان میں اس کا اپنی جگہ پر قائم رہنا ایک معجزے کی بات ہی ہو سکتی تھی۔ وہ تو ضرور سمندری موجوں کے ساتھ بہہ گئی ہو گی۔ خُدا خدا کر کے طوفان تھما۔ دن نکلا سورج نے بادلوں کی اوٹ سے جزیرے کو دیکھا۔ میں کیبن سے باہر نکل آیا۔ سب سے پہلے میں نے دیکھا کہ ساحل کے بے شمار درخت ٹوٹ کر گرے ہوئے تھے۔ چٹانوں کے پتھروں کو شوریدہ سر موجوں نے توڑ پھوڑ کر ادھر ادھر لڑھکا دیا تھا۔ میں بھاگتا ہوا اس چٹان کے پاس آیا جہاں میں نے شام کو کشتی باندھی تھی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا وہاں نہ کشتی تھی نہ کشتی کا کوئی نشان ہی تھا۔ طوفانی لہریں کشتی کی رسی توڑ کر اسے اپنے ساتھ

بہا کر خدا جانے کہاں لے گئی تھیں۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ امید کی آخری کرن بھی بجھ گئی تھی اب میں دوبارا کشتی کہاں بنا سکتا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں سر جھکائے بوجھل دل کے سات ریت پر ٹہلنے لگا۔

اب یہ جزیرہ مجھے کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ تنہائی کا شدید احساس تو پہلے ہی میرے رگ پے میں سرایت کر گیا تھا۔ لیکن اب مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ جزیرہ میری موت کا انتظار رہا ہے۔ مجھے اپنے آس پاس موت کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹیں سنائی دے رہی تھیں میری ہمت جواب دینے لگی تھی۔ جس چٹان ایسے عزم کے ساتھ میں نے اس منحوس جزیرے میں زندگی کے تیتیس سال بسر کئے تھے۔ اب اس میں کمزوری آنے لگی تھی اور میں اپنے آپ کو موت کی طرف جاتا محسوس کرنے لگا تھا۔ میں آزردہ دل لئے اپنے کیبن میں واپس میں آگیا۔ میری آنکھوں کے سامنے گزرے ہوئے خوشگوار بچپن کی یادیں پھرنے لگیں۔ یہ موت کی نشانی تھی۔ کہتے ہیں جب آدمی مرنے لگتا ہے اس کا سارا بچپن گھوم جاتا ہے۔ اچھا اگر موت ہی میری قسمت میں لکھی ہے تو پھر موت سے بڑھ کر اور کوئی شے مجھے تسکین نہیں دے سکتی تھی۔ مجھے موت سے پیار ہوگیا اور میں کیبن کے اندر آکر تخت پر لیٹ کر آنکھیں بند کر کے موت کا انتظار کرنے لگا۔

مجھے آنکھیں بند کئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ میری زندگی کا سب سے بڑھ کر حسین اور یادگار حادثہ ہوا۔ میرے کانوں میں سمندری جہاز کے بھونپو کی آواز سنائی دی۔ پہلے تو مجھے لگا کہ موت میرا دل بہلا رہی ہے اور مرنے سے پہلے مجھے آخری بار لندن میں سنی ہوئی جہازوں کی آوازیں سنا رہی ہے۔ میں زیر لب مسکرا دیا اور موت سے باتیں کرنے لگا۔ لیکن جب دوسری بار پھر جہاز کے وسل کی آواز آئی تو میں نے آنکھیں کھول دیں اور لپک کر کیبن سے باہر آگیا۔ میں بھاگتا ہوا صلیب والی پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ گیا۔ میں جلدی میں دوربین کیبن میں ہی بھول آیا تھا۔ مگر اب مجھے دوربین کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ میری آنکھوں کے سامنے ایک بہت بڑا دخانی جہاز سمندر میں دو میل کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اور ایک سفید رنگ کی کشتی جہاز کی طرف واپس جا رہی تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے زندگی کا ایک حسین ترین خواب دیکھ رہا ہوں میں نے دو تین بار آنکھیں ملیں۔ جہا[ز]

[میرے] سامنے سمندر میں کھڑا تھا۔ خوشی سے میرا دل اچھل کر حلق کے قریب آگیا۔ میں جہاز پر نیلی نیلی [و]ردیوں والے ملاحوں کو صاف دیکھ رہا تھا۔ اسی قسم کے ملاح کشتی میں بھی بیٹھے تھے جو ساحل سے ہو کر واپس جہاز کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے زور زور سے چیخنا شروع کر دیا۔ پھر میں نے پستول کا ہوائی فائر کر دیا۔ پستول کی آواز پر جہاز کی طرف جاتی ہوئی کشتی واپس مڑی اور اس نے ساحل کی طرف آنا شروع کر دیا میں پہاڑی پر سے اتر کر سمندر کی طرف بے تحاشا بھاگنے لگا، بھاگتے بھاگتے میں دوبارہ ریت پر منہ کے بل گر پڑا۔

تھوڑی دیر بعد کشتی ساحل پر آکر رک گئی میں زمین پر پڑا تھا۔ نیلی وردیوں والے ملاح کشتی میں سے اتر کر میرے پاس آگئے، وہ مجھے اور میں ان کو حیرت سے دیکھ رہا تھا ہاں! یہ انسان تھے۔ مہذب شہر کے رہنے والے صاف ستھرے کپڑوں اور چمکیلے صحت مند چہروں والے انسان ...... انہیں دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ ایک ملاح نے جھک کر مجھ سے پوچھا

"تم کون ہو؟"

میں نے کہا۔ "میں انسان ہوں۔"

اور اتنا کہہ کر میں ہاتھوں میں اپنا سفید بالوں والا بوڑھا چہرہ چھپا کر بچوں کی طرح سسکیاں بھر کر رونے لگا۔ ملاحوں نے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ انہوں نے مجھے ریت پر سے اٹھایا جب میں نے انہیں بتایا کہ میں تیتیس برس سے اس منحوس جزیرے پر جلا وطن ہوں تو انہیں یقین نہ آیا۔ وہ مجھے پاگل سمجھنے لگے۔ میں انہیں پہاڑی پر لے گیا اور صلیب دکھائی جس پر میں نے جزیرے پر میں آنے کی تاریخ لکھی تھی۔ اور دنوں کے شمار کے نشان لگائے تھے۔ پھر میں نے انہیں اپنا کیبن دکھایا ملاح ششدر رہ گئے۔ انہوں نے تعجب اور حیرانی سے دانتوں میں انگلیاں داب لیں۔ وہ مجھے کشتی میں سوار کرا کر جہاز پر لے گئے۔ یہ جہاز ایک بہت بڑا اور صاف ستھرا جہاز تھا۔ کپتان نے میری کہانی سنی تو ورطۂ حیرت میں ڈوب گیا۔ وہ میری ہمت اور دلیری پر عش عش کر اٹھا۔ اس نے بتایا کہ رات کے طوفان کی وجہ سے اس کا جہاز بھٹک کر اس جزیرے پر آگیا تھا۔

ملاح جزیرے پر پانی تلاش کرنے آئے تھے۔ اور اب جہاز انہیں لے کر واپس جا رہا تھا۔ اگر میں بھونپو کی آواز نہ سنتا یا سو رہا ہوتا تو جہاز ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاتا۔ تھوڑی دیر بعد جہاز اس ویران جزیرے کو چھوڑ کر سمندر کی طرف چل پڑا جہاں میں نے اپنی جوانی کے بہترین ایام تنہائی، اذیت اور کس مپرسی کے عالم میں گذار دیئے تھے۔ جزیرے کی پہاڑیاں نگاہوں سے اوجھل ہونے لگیں تو مجھے دور سے اپنے پیارے کتے اور طوطے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں کپتان کے کیبن کے نرم نرم بستر پر لیٹا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

ایک مہینہ بعد یہ جہاز انگلینڈ کی بندرگاہ پر پہنچ گیا۔ میرا باپ مر چکا تھا۔ کوئی رشتے باقی نہ تھا۔ کپتان نے مجھے اپنے ہی جہاز پر نائب کپتان کی نوکری دے دی اور میں زندگی کے باقی دن خاموشی سے بسر کرنے لگا۔